خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
مارچ 2026
عید مبارک

خواتین ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

واٹس ایپ 03172266944

کہی سُنی، مسید 6

کرن کرن روشنی، ادارہ 7

ہمارے نام، نادرہ خاتون 25

آپ سے کیا پردہ

مرنے والوں کو سہولتیں، انشا جی 12

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے، امت الصبور 200

عید سروے

رنگ عید کے، ادارہ 19

مجھ سے ملیے

باتیں رالعنوان سے، شاہین رشید 14

خامشی کو زباں ملے، ادارہ 33

بانی ——— محمود ریاض

مدیرہ ——— نادرہ خاتون

نائب مدیرہ ——— رضیہ جمیل

مدیر خصوصی ——— امت الصبور
بلقیس بھٹی

لفظیات ——— ادارہ

قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

آپ کا باورچی خانہ، جویریہ عالم 202

ناول

ابتہال، حسنیٰ حسین 34

مکمل ناول

بازی گرہ، سنیعہ عمیر 156

ستارے کھلکھلاتے ہیں، حمیرا علی 94

ناولٹ

کاج، بٹن اور دھاگا، منشا محسن علی 79

افسانے

عیدی، راشدہ رفعت 64

خوشبو بھری عید، آنیہ مالکش 90

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

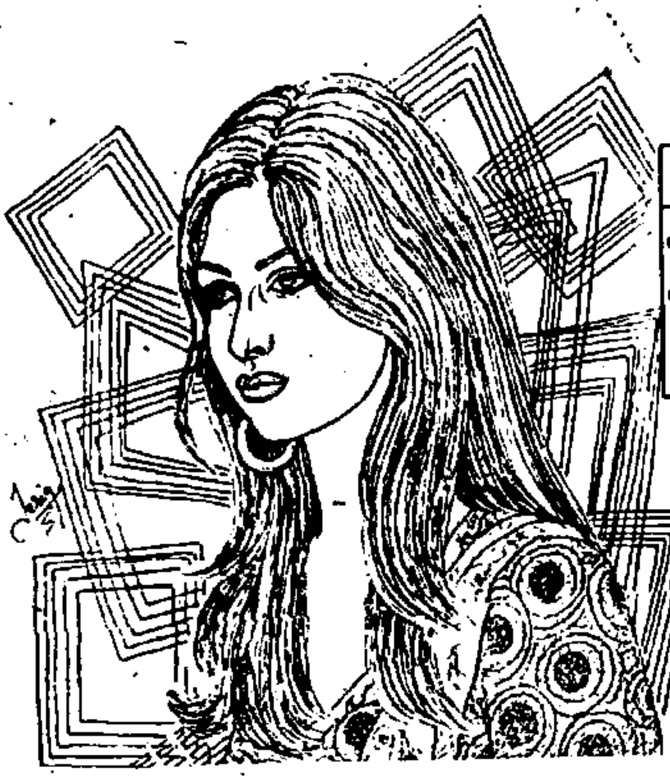

خط و کتابت کا پتہ
خواتین ڈائجسٹ
37- اردو بازار کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) —— 1,800 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ — 50000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

مارچ 2026
جلد 53 شمارہ 11
قیمت 150 روپے

گھر، ثمین صداقت 146
اچھی نہیں یہ دوریاں، تنظیر فاطمہ 187
اچھی کوالٹی کی بہو، ساجدہ رمضان 189
مقروض، سیدہ 192

نظمیں غزلیں

غزل، خمار بارہ بنکوی 195
نظم، فرخندہ سلیم 195
196
غزل، یاور ماجد 196
نظم، زہرہ نگاہ

پکوان

موسم کے پکوان، واصفہ سہیل 204

رنگا رنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ، شگفتہ جاہ 197

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے، روحید خان 207

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، ادارہ 208

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے، امت الصبور 210

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
ایڈیٹر و پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617 Fax: 92-21-32766872 0317 2266944
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

کہنی سُننی

خواتین مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں
یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو آپ عیدالفطر کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔
عیدالفطر اللہ تعالیٰ کا انعام، خوشیوں بھرا تہوار، ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق روزے رکھے اور رات کو قیام کر کے اس کی عبادت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی عبادتیں قبول فرمائے۔ آمین

عیدالفطر مسلمانوں کا اجتماعی مذہبی تہوار ہے۔ اس کی خوشی اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب سب لوگ خوش ہوں۔ روزافزوں بڑھتی مہنگائی نے سب کے حواس گم کر رکھے ہیں۔ سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔ آپ کے اردگرد بھی ایسے لوگ ہوں گے جو عید کی خوشیاں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے ہوں گے۔ ان کا خیال رکھیے گا۔

آپ سب کو ہماری جانب سے عیدالفطر مبارک
ہماری دعا ہے کہ عید آپ کے آنگن میں بہار کے سارے رنگ لے کر اترے۔ آپ کو عید کی حقیقی خوشیاں نصیب ہوں۔ آپ کی زندگی محبتوں کی خوشبو سے مہکتی رہے۔ آمین
آخری عشرے کی عبادتوں میں دنیا میں امن، عافیت اور سلامتی کی دعا ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔ آمین

سالگرہ نمبر

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے درخواست ہے کہ اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوادیں تاکہ شامل اشاعت ہوسکیں۔ سالگرہ نمبر میں دیگر تحریروں کے ساتھ قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

1۔ خواتین ڈائجسٹ سے آپ کا رشتہ کب اور کیسے استوار ہوا؟

2۔ آپ کو خواتین ڈائجسٹ کیوں پسند ہے۔ اس کی کون سی خوبی ہے جو اسے دیگر پرچوں سے ممتاز کرتی ہے۔

3۔ آپ نے خواتین ڈائجسٹ میں بہت سی تحریریں پڑھی ہوں گی۔ کوئی ایسا کردار جسے پڑھ کر آپ کے دل میں خواہش ابھری ہو، کاش میں بھی ایسی ہوتی۔ اس کردار کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔

4۔ آپ سالگرہ مناتی ہیں؟ سالگرہ کے حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ جسے سوچ کر آج بھی چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔

5۔ گھر والے آپ کی سالگرہ بھول جائیں تو آپ کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔

6۔ آپ کو سالگرہ پر بہت سے تحفے ملے ہوں گے۔ کوئی ایسا تحفہ جو بہت عزیز ہستی نے دیا ہو اور آپ کو بہت عزیز ہو۔

ان سوالات کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 25 مارچ تک موصول ہوجائیں۔ جواب آپ واٹس ایپ یا ای میل بھی کرسکتی ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔
قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

وصیت کی ترغیب

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"مسلمانوں کا یہ حق نہیں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے بارے میں لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔"

فوائد و مسائل:

وصیت ایسی چیز ہے کہ اس کا فائدہ اور ثواب مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، جب وصیت پر عمل کیا جاتا ہے۔ انسان کو اپنی موت کے وقت کا علم نہیں، ممکن ہے بندے کو اس حال میں موت آجائے کہ اسے وصیت کرنے کا موقع نہ ملے اس لیے بہتر ہے کہ وصیت ہر وقت تیار رکھی جائے۔ پہلے سے وصیت لکھ رکھنے کا یہ بھی فائدہ ہے کہ انسان اس میں حسب خواہش تبدیلی کر سکتا ہے۔ قرض اور امانت وغیرہ کی تفصیل ہمیشہ لکھ کر رکھنی چاہیے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"محروم وہ ہے جو اپنی وصیت کرنے سے محروم رہا۔"

فائدہ:

مذکورہ روایت اکثر محققین کے نزدیک ضعیف ہے۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص وصیت کیے بغیر فوت ہو گیا، وہ ان فوائد سے محروم ہو گیا، جو اسے وصیت سے حاصل ہو سکتے تھے۔ مثلاً صدقہ کرنے کی وصیت کرتا تو اسے بعد میں اس کا ثواب ملتا، قرض کی ادائیگی کی وصیت کرتا تو وارث اس کا قرض ادا کر دیتے اور وہ بری الذمہ ہو جاتا۔ فوت ہونے کے بعد اس کوتاہی کی تلافی ناممکن ہے اس لیے ایسا شخص بہت سی خیر سے محروم رہ گیا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص وصیت کر کے فوت ہوا، وہ سیدھی راہ پر اور سنت طریقے پر (عمل کرتا ہوا) فوت ہوا۔ وہ تقویٰ اور شہادت کی موت مرا اور اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش ہو چکی تھی۔"

جائز وارث کو حصہ نہ دینا

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنے وارث کو ترکہ دینے سے بھاگے گا (ایسی وصیت کرے گا جس سے جائز وارث کو حصہ نہ ملے یا اس کے اصل حصے سے کم ملے) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی میراث سے محروم فرمادے گا۔"

وصیت میں ناانصافی

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی ستر سال تک نیک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر جب (مرتے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں ناانصافی کرتا ہے، اس طرح اس کا انجام برے کام پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے اور ایک آدمی ستر سال تک برے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے، پھر (مرتے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو اس طرح اس کا انجام نیک کام پر ہوتا ہے، چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔"

صحیح وصیت کا اجر

حضرت معاویہ بن قرۃ اپنے والد (حضرت قرۃ بن ایاس بن بلال مزنیؓ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے وصیت کی اور اس کی وصیت اللہ کی کتاب کے مطابق تھی، اس کا یہ عمل اس کی زندگی میں ترک شدہ زکوٰۃ کا کفارہ بن جائے گا۔"

زندگی میں بخل اور مرتے وقت فضول خرچی کی ممانعت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔"

"اللہ کے رسولؐ! مجھے بتائیے کہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں قسم ہے تیرے باپ (کے رب) کی! تجھے ضرور بتاؤں گا۔ تیری ماں (تیرے حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔")

اس نے کہا۔ "پھر کون؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر تیری ماں۔"

اس نے کہا۔ "پھر کون؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تیرا باپ۔"

اس نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے میرے مال کے بارے میں بتائیے کہ میں اس میں سے کس طرح صدقہ کروں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں قسم ہے اللہ کی مجھے ضرور بتاؤں گا۔ (وہ اس طرح ہے کہ) تو اس وقت صدقہ کرے جب تو تندرست ہو اور مال سے محبت رکھتا ہو، تجھے زندہ رہنے کی امید ہو اور فقر کا اندیشہ ہو۔ (یہ صدقہ کا صحیح وقت ہے) اور موخر نہ کرنا حتیٰ کہ جب تیری جان یہاں (حلق تک) پہنچ جائے پھر تو کہے۔ میرا مال فلاں کو دے دینا، میرا مال فلاں کو بھی دے دینا۔ وہ تو ان ہی کا ہو چکا، اگرچہ تجھے یہ (حقیقت) ناگوار محسوس ہو۔"

فوائد و مسائل:

اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے۔ جواب دینے سے پہلے تمہید کے طور پر کوئی بات کہنے سے سائل جواب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا۔ "میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔"

قسم صرف اللہ کی ذات کی کھانا جائز ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے، پس جو شخص قسم کھائے، وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔" (صحیح البخاری) اس لیے اس حدیث میں "باپ کی قسم" سے مراد "باپ کے رب کی قسم ہے۔ عربی زبان میں قرینے کی موجودگی میں الفاظ حذف کر دینا عام ہے۔"

حسن سلوک میں ماں کا حق زیادہ ہے کیونکہ وہ باپ کی نسبت زیادہ نرم دل اور زیادہ حساس ہوتی ہے، تاہم اگر ماں کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً ممنوع یا مکروہ ہو اور باپ اس غلط کام سے منع کرے تو باپ کا حکم ماننا ضروری ہے اور یہ ماں سے حسن سلوک کے منافی نہیں۔

صحت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے کیونکہ اس وقت دل میں مال کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے اور اسے خرچ کرنا اس لیے بھی مشکل محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں حالات خراب ہونے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے جبکہ موت کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ اب میں اسے استعمال تو نہیں کر سکوں گا، لہذا صدقہ کر کے فائدہ حاصل کر لوں۔ اس وقت دل میں مال کی محبت نہیں رہتی۔

زندگی کے آخری ایام میں صدقہ کرنا، وصیت کرنا شرعاً درست ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں بھی صدقے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

تہائی ترکے کی وصیت

حضرت عامر بن سعدؓ نے اپنے والد (حضرت سعد بن ابی وقاصؓ) سے روایت کیا، انہوں نے فرمایا۔

"فتح مکہ کے سال میں بیمار ہو گیا، حتیٰ کہ موت کے کنارے پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرا مال بہت زیادہ ہے اور میری وارث، میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آدھا؟"

فرمایا۔ "نہیں۔"

میں نے کہا۔ "تہائی؟"

فرمایا۔ "تہائی (جائز ہے) اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ تیرا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑنا انہیں مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔"

فوائد ومسائل:

بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بہت بڑا نیک عمل ہے۔ جب انسان محسوس کرے کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو اس وقت اسے ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ صدقے کی وصیت نہیں کرنی چاہیے۔

اگر کوئی شخص تہائی حصے سے زیادہ کی وصیت کر کے فوت ہو جائے تو اس کی وصیت پر صرف تہائی ترکے تک عمل کیا جائے گا۔ (دیکھیے حدیث: ۲۳۴۵)

بہتر یہ ہے کہ تہائی مال سے کم وصیت کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی کی اجازت دینے کے باوجود اسے "زیادہ" فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے۔ (دیکھیے حدیث: ۲۷۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ صدقہ کیا ہے کہ وفات کے وقت تمہیں تہائی مال (میں وصیت کا حق) دے دیا ہے تاکہ تمہارے نیک اعمال میں اضافہ ہو جائے۔"

فوائد ومسائل:

مذکورہ روایت کو ہمارے فاضل محققین نے دیگر شواہد کی بنا پر حسن قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (الموسوعۃ الحدیثیۃ مسند الامام احمد: ۴۷۵۴۵، ۴۷۶، والارواء، رقم: ۱۴۴۱) بنا بریں اسلامی شریعت کے احکام دنیا اور آخرت میں فائدے کا باعث ہیں۔

اچھے کام کی وصیت کرنے سے مرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت پر عمل کیا جاتا ہے تو مرنے والے کو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔

اگر پسماندگان اچھے کام کی وصیت پر عمل نہ کریں، تب بھی فوت ہونے والے کو اچھی وصیت کا ثواب ضرور ملے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔") اے آدم کے بیٹے! دو چیزیں (میں نے تجھے دی ہیں) ان میں سے ایک بھی تیرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ میں نے تیرے مال میں اس

وقت تیرا حصہ مقرر کر دیا جب میں تیری سانس بند کرتا ہوں (یہ اس لیے) تاکہ تجھے پاک صاف کر دوں اور (دوسری چیز) تیری زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد میرے بندوں کا تجھ پر نماز جنازہ ادا کرنا۔"

وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں

حضرت عمرو بن خارجہؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری (اونٹنی) پر سوار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری خوب جگالی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے کندھوں کے درمیان (پشت پر) گر رہا تھا۔ (اس موقع پر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو ترکے کا حصہ تقسیم کر کے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے اور بدکار کے لیے پتھر ہیں۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا ہونے کا دعوا کرے یا اپنے آزاد کرنے والوں کے سوا کسی اور کی طرف آزادی کی نسبت کرے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا نہ فرض قبول ہوگا اور نہ نفل۔"

یا فرمایا۔ "نہ نفل قبول ہوگا نہ فرض۔"

فوائد و مسائل:

ترکے میں جن رشتہ داروں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے، انہیں ان کا مقررہ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔

جن رشتہ داروں کا وراثت میں حصہ نہیں، ان کے حق میں مناسب وصیت کرنا بہتر ہے۔

بعض لوگ یتیم پوتے کی وارثت کا مسئلہ لے کر شریعت کے نظام میراث پر اعتراض کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص فوت ہو چکا ہے لیکن فوت شدہ بیٹے کا ایک بیٹا جو اب فوت ہونے والے کا پوتا ہے، وہ موجود ہے، اصول میراث کے مطابق یہ پوتا محروم ہے کیونکہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ رشتے دار محروم ہوتا ہے۔ اس قسم کی استثنائی اور نادر صورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون میں تبدیلی کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

شرعی طور پر اس کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ فوت ہونے والا اپنے غیر وارث پوتے کے حق میں کچھ وصیت کر جائے۔ اگر وصیت نہ ہو تو وارثوں کے لیے مستحب اور بعض علماء کے نزدیک واجب ہے کہ وارث محروم الارث پوتوں وغیرہ کو وراثت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔ قرآن کریم کی آیت:

ترجمہ:

"وراثت کی تقسیم کے وقت رشتے دار، یتیم اور مساکین آ حاضر ہوں تو تم مال وراثت میں سے انہیں کچھ دے دو۔" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اکثر لوگ اس حکم قرآنی کو محض اخلاقی ہدایت سمجھ کر اپنے نہایت قریبی رشتے داروں (بھتیجوں وغیرہ) کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے اسلام کا قانون وراثت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنتا ہے، حالانکہ اس میں تو ایسی کوئی چیز نہیں جس پر انگشت نمائی کی جا سکے۔ چچا تایا اپنے بھتیجوں وغیرہ کے ساتھ شفقت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے تو ایک اسلامی معاشرے میں پوتوں وغیرہ کی وراثت یا عدم وراثت کا مسئلہ زیر بحث ہی نہ آئے کیونکہ صلہ رحمی کے اعتبار سے ان کی محرومی وراثت کا ازالہ خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے اعتراضات ان غیر مسلموں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں، جن کے ہاں وراثت کا کوئی حصول و ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں، سوائے اس کے کہ مرنے والے کا بڑا بیٹا یا بیٹی تمام ترکے کا مالک بن جاتے ہیں، خواہ یہ کروڑوں کی جائیداد ہو۔ میت کی باقی اولاد بالکل محروم ہوتی ہے، حالانکہ اولاد ہونے کے لحاظ سے وہ اس کے برابر حق دار ہیں۔

انصاف سے اس قدر بعید رواج پر عمل کرنے والوں کی طرف سے اسلام کے انتہائی عادلانہ نظام وراثت کی ایک شق تلاش کر کے اس پر غلط سلط اعتراض کرنا اور اس طرح پوری شریعت کو ناقابل عمل

قرار دینے کی کوشش کرنا معقول طرز عمل نہیں۔

افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان بھی غیر مسلموں سے متاثر ہو کر ان ہی کی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا ایمان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

وارث کے حق میں وصیت سے منع کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اگر وہ وصیت قرآن و سنت کے مطابق ہو تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان وارثوں کو شرعاً وہی حصہ ملے گا، خواہ وصیت کی جائے یا نہ کی جائے اور اگر اس کی وصیت قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس وصیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس طرح وہ کالعدم ہے۔

نسبی تعلق ایک ناقابل تبدیل تعلق ہے اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کو اصل باپ کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنا اور اظہار (بیوی کو ماں بہن قرار دینا) غیر قانونی بلکہ گناہ ہے۔

ولاء (آزادی) کا تعلق بھی ناقابل تبدیل ہے جس نے کسی کو آزاد کیا ہے، اسی کا آزاد کردہ (مولیٰ) کہنا چاہیے۔ آزاد کرنے والے کے احسان کو فراموش کر کے کسی اور کو مولیٰ قرار دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

وارث کے لیے وصیت

حضرت ابوامامہ (صدی بن عجلان) باہلیؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

"میں نے حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ مبارک میں یہ فرماتے سنا۔

"اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"

وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے

حضرت علیؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ آیت پڑھتے ہو:

ترجمہ: "اس وصیت کے بعد جو وہ وصیت کرے یا قرض کے بعد۔" (النساء ۴:۱۱) اور سگے بھائی، ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے سوتیلے بھائی نہیں۔"

فوائد و مسائل: قرض کی اہمیت وصیت کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں بھی واجب الادا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ وصیت موت کے بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض جتنا بھی ہو ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، جبکہ وصیت اگر تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو تہائی تک قابل عمل ہوتی ہے، زائد نہیں۔

میت کے مال میں سب سے پہلے کفن دفن پر خرچ کیا جاتا ہے پھر قرض ادا کیا جاتا ہے پھر جو کچھ بچے اس کے تہائی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو، وہ پوری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے، پھر قرض ادا کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دونوں چیزیں واجب ہیں، ان میں سے جو چیز پائی جائے وہ ادا کی جائے۔ اگر دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو ترکے میں سے دونوں کی ادائیگی کرنے کے بعد باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔ علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جبکہ قرض تو لوگ زبردستی بھی وصول کر لیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کر کے واضح کر دیا کہ اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ گو اس پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد ہی کیا جائے گا۔

میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن بھائیوں پر مقدم ہیں۔

☆☆

مرنے والوں کو سہولتیں

انشا جی

اخبار میں آیا ہے کہ گزشتہ بدھ کو گڑھی شاہو میں "انجمن معین الاموات" کا جلسہ ہوا، جس میں نئے سال کے لیے عہدیدار منتخب کیے گئے۔

معین کا مطلب ہے مددگار، اعانت کرنے والا۔ اموات جمع ہے موت کی۔ ہم نے یہ نام پہلی بار سنا تھا، لہٰذا اس کے معنی کچھ غور کرنے سے سمجھ میں آئے لیکن جب سمجھ میں آ گئے تو ہم نے فوراً اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے کہا کہ۔

"دیکھو، لاہور والے تم کراچی والوں سے بازی لے گئے۔ اپنی انجمن بنالی۔ جو کام تم لوگ یہاں فرداً فرداً کرتے ہو، اب وہاں اجتماعی طور پر ہوا کرے گا۔ اب یہ لوگ آبادکاری والوں پر زور دے کر قبرستانوں کے لیے مزید زمین بھی منظور کرالیں گے۔ یہاں تم لوگوں سے یہ بھی نہ ہوسکا۔"

آج کل نیکی کا زمانہ نہیں، بجائے اس کے کہ اس امر ضروری کی طرف توجہ دلانے پر وہ ہمارا شکریہ ادا کرتے، بپھر گئے اور کہنے لگے۔

"دیکھو جی...... تم گھوم پھر کر ہر بات ہم پر لاتے ہو، یہ ٹھیک نہیں۔ خود تمہارے پڑوس میں تابوت الحکماء حکیم عزرائیل علی خاں مالک ہلاہل دواخانہ بھی تو موجود ہیں اور اب تو ہومیو پیتھیوں کو بھی خلق خدا کے مارنے جلانے کا اختیار مل گیا ہے۔ طب چین و جاپان والے تو مریض پر وار کرنے کے لیے لائسنس تک نہیں لیتے۔ ان نیولوں اور سانڈوں اور درویش کی چٹکی والوں کو بھی تم بھول گئے، جن کی ایک پڑیا زکام، آشوب چشم، بواسیر، ہیضہ، کھٹی ڈکاروں، گٹھیا اور گنج کا شرطیہ علاج ہوتی ہے بلکہ چہرے کی رنگت سفید اور سفید بالوں کو کالا کرنے کے لیے بھی مزید کسی دوا کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

☆☆☆

ادھر سے ہماری توجہ ہٹی تو خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ ملاوٹ کا کام کرنے والوں کی انجمن ہے جنہوں نے لکڑی کے برادے، بھٹے کی لال اینٹوں کے سفوف اور کیکر کی چھال وغیرہ کی چھوٹی صنعتوں کو ترقی دے کر اتنا بڑا بنا دیا ہے۔ اب تک یہ چیزیں زیادہ سے زیادہ تعمیر مکانات یا ایندھن کے کام کی سمجھی جاتی تھیں ہلدی، مرچ مسالوں اور چائے کے طور پر ان کا

استعمال کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ موبل آئل بھی فقط بسوں اور ٹرکوں وغیرہ میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ کسی نے نہ سوچا تھا کہ یہ گھی کا نعم البدل ہے اور اس سے انسانی جسم کی گاڑی بھی خوش اسلوبی بلکہ زیادہ، تیزی اور تیز رفتاری سے چلائی جاسکتی ہے۔ زندگی کی راہ جو پہلے ساٹھ ستر، اسّی سال میں طے ہوتی تھی، موبل آئل باقاعدگی سے استعمال کرنے والے اسے دو تین ہی سال میں طے کر لیتے ہیں۔

☆☆☆

اس پر ہم اپنے پرانے کرم فرما سیٹھ ہلدی بھائی، چونا بھائی، نوٹوں والے، پرانے کوٹوں والے کے پاس گئے اور اس انجمن کے بنانے پر مبارک باد دی۔ انہوں نے فوراً موبل آئل میں تر ترانی جلیبیوں کی پلیٹ ہماری طرف بڑھائی، جوہڑ کا پانی ملے دودھ کی چائے کے ڈبل کپ کا آرڈر دیا جس میں کیکر کی چھال کے علاوہ چنوں کا چھلکا بھی استعمال کیا گیا تھا، جو اعصاب کے لیے خصوصاً گھوڑوں کے اعصاب کے لیے مفید مانا گیا ہے۔ اس کے بعد بھس ملے تمباکو کی بیڑی ہمیں پیش کرتے ہوئے کہا۔

"بابا، یہ انجمن ہماری نہیں ہے۔ ہم تو درویش گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شہرت سے ہمیں نفرت ہے۔ نام و نمود کا شوق نہیں، اسی لیے خفیہ تہہ خانوں میں اپنا کام کرتے ہیں اور پبلک کی خدمت بجا لاتے ہیں۔ اگر کوئی منصفی کرے تو دیکھے کہ فیملی پلاننگ والوں سے زیادہ مفید کام تو ہم کرتے ہیں۔ آخر آبادی کو کم ہی تو کرنا ہے، پریذیڈنٹ صاحب نے یہی تو کہا ہے۔"

اس کے بعد بھٹے کی اینٹوں سے بنے ہوئے کتھے اور پیپل کی لکڑی کی سپاری کا پان پیش کرتے ہوئے کہا۔ "حکومت کہتی ہے اناج بچاؤ۔ جب ہم نے اناج بچایا اور اپنے گوداموں میں بھر لیا۔ خود میرے تہہ خانے میں کئی سو بوریاں ہوں گی۔ تو اب حکم نکالا ہے کہ یہ بری بات ہے، اسے باہر نکالو، سستا بیچو۔ بابا تم اخبار والا ہے، حکومت کو سمجھاتا کیوں نہیں۔ رزق جیسی انمول چیز کو سستا کیسے بیچ دیں۔"

☆☆☆

اب ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ انجمن بسوں، ٹرکوں اور رکشہ والوں نے بنائی ہے۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ہمارا دھیان سب سے پہلے اس طرف کیوں نہ گیا، جو پبلک کی خدمت کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور فٹ پاتھ پر ٹرک چلا کر اور نالے میں بس گرا کر ثابت کرتے ہیں کہ انسان ہمت کرے تو بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانا بھی کچھ مشکل کام نہیں۔ ہم پتا پوچھتے پوچھتے ٹرک ٹرانسپورٹ یونین کے دفتر پہنچے تو اس کے سیکریٹری جنرل نے فوراً ٹرانسسٹر کی آواز دھیمی کر کے نسوار کی چٹکی سے ہماری تواضع کی اور کہا "ابھی حقہ تازہ کر کے لاتا ہوں۔"

ہم نے کہا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے، صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ کی انجمن معین الاموات کی اس ماہ میں کیا کارگزاری ہے اور آیا بس والوں کا پلہ بھاری رہا ہے یا ٹرک اسے ہارن دیئے بغیر پاس کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

ہماری بات ان کی سمجھ میں آئی تو فوراً تھرڈ گیئر میں گفتگو کرنے لگے اور پھر فورتھ گیئر میں آنے کو تھے کہ ہم نے وہاں سے بھاگنے میں سلامتی دیکھی۔ اس اثناء میں سامنے "انجمن معین الاموات شاخ کراچی" کا بورڈ نظر آ گیا۔ ہم نے ہانپتے کانپتے اندر داخل ہو کر کہا۔

"صاحبو! ہماری مدد کرو......" اس پر ایک صاحب جو مٹکوں کے درمیان بیٹھے ٹھا ناپ رہے تھے بولے۔

"جناب ہمارا کام تو مردے کو اس کی ابدی آرام گاہ تک پہنچانا ہے۔ زندوں کے امور میں ہم دخل نہیں دیتے۔ وہ سامنے ٹرک آ رہا ہے، پہلے اس کے سامنے لیٹ جائیے پھر ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔"

☆☆

باتیں رابعہ رضوان سے

شاہین رشید

1۔ ”اصلی نام؟“
”رابعہ افسر حسین“
2۔ ”پیار کا نام؟“
”رابعو“
3۔ ”تاریخ پیدائش؟“
”13 دسمبر 1986“
4۔ ”قد/ستارہ؟“
”5 فٹ 4 انچ/قوس
5۔ ”مادری زبان؟“
”اردو“
6۔ ”تعلیمی قابلیت؟“
”بی بی اے آنرز“
7۔ ”شادی/بچے؟“
”جی شادی شدہ ہوں اور تین بچے ہیں۔“
8۔ ”شوبز میں کس نے متعارف کرایا؟ گھر والوں کا ردعمل/پہلے کیا کیا تھیٹر، فلم یا ڈرامہ؟“

”کسی نے متعارف نہیں کرایا خود ہی آئی تھی اور گھر والوں کا ردعمل بہت اچھا تھا۔ سب بہت سپورٹیو رہے۔ اور ہاں سب سے پہلے میں نے مووی کی۔“

9۔ ”بہن بھائی/آپ کا نمبر؟“
”ہم پانچ بہن بھائی ہیں اور میں گھر میں بڑی ہوں۔“

10۔ ”بچپن میں کس کے قریب تھیں۔ بہن بھائی یا ماں باپ کے؟“
”مما کے قریب تھی۔“

11۔ ”پہلا ڈرمہ/وجہ شہرت؟“
”اقتدار“ پہلا ڈرامہ تھا۔ وجہ شہر“م سے محبت۔“

12۔ ”کس کی آواز پر صبح لازمی اٹھنا پڑتا ہے۔ شوہر، الارم یا کوئی اور؟“
”الارم کی آواز پر۔“

13۔ ”اپنی کس عادت سے پریشان اور کس عادت کو پسند کرتی ہیں؟“
”ٹائم مینجمنٹ پر کام کرنا ہے۔ اچھی عادت یہ کہ پوزیٹو رہتی ہوں اور پینک نہیں ہوتی بہت جلدی۔“

14۔ ”زندگی کی پہلی کمائی کس کے ہاتھ میں رکھی اور کیا تھی پہلی کمائی؟“
”بہ حیثیت ٹیچر کے پہلی کمائی کی اور گفٹ لیے اپنے سسرال والوں کے لیے جو سانپ نکلے۔“

15۔ ”آپ کی زندگی کی سب سے بڑی اچیومنٹ؟“

”ہم نے وہاں سے اٹھایا ہے خود کو
جہاں سے لوگ سکھے سے لٹک جاتے ہیں۔“

16۔ ”گھر میں کس کا رعب ہے؟“
”کسی کا نہیں۔ جیو اور جینے دو۔“

17۔ ”آپ کی صبح اور رات کتنے بجے ہوتی ہے؟“
ویک ڈیز میں جلدی سونا اور اٹھنا ہوتا ہے اور ویک اینڈ پہ آرام سے اٹھنا ہوتا ہے۔“

18۔ ”اسپورٹس سے لگاؤ/کون سا کھیل پسند ہے؟“

''کوئی خاص نہیں، زندگی پہلے سے ہی بہت کھیل کھیل رہی ہے۔''

19۔ ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

''برطانیہ۔''

20۔ ''بھوک میں آپ کی کیفیت؟''

''بھوک میں کھانا نہ ملے تو چڑچڑاپن آجاتا ہے۔''

21۔ ''پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟''

''ایک ایسی نعمت جس قرض کا ہم نہیں چکا سکتے۔''

22۔ ''پہلی بار کیمرے کا سامنا کیا تو کیا کیفیت تھی؟''

''نروس تھی کافی لیکن پر اعتماد بھی تھی۔''

23۔ ''سیاست میں کون پسند ہے۔ کس کا رول کرنے کی خواہش ہے؟''

''انجیلا مریکل اور کوئی پسند نہیں ہے۔''

24۔ ''پسندیدہ سیاسی لیڈر؟''

''کوئی بھی نہیں۔''

25۔ ''کیا زندگی میں کبھی کوئی معجزہ ہوا؟''

''معجزات سے بھری پڑی ہے میری زندگی۔''

26۔ ''قسمت پر کتنا یقین ہے؟''

''قسمت انسان خود بناتا ہے۔''

27۔ ''کس بات پر آپ کی آواز اونچی ہوجاتی ہے؟''

''جب کسی کو آواز نہ آرہی ہو تب۔''

28۔ ''کیا کیا چیزیں خریدنا آپ کا خواب ہے؟''

''دنیا گھومنا میرا خواب ہے۔''

29۔ ''کس کی خاطر فیلڈ چھوڑ سکتی ہیں؟''

''کسی کی خاطر فیلڈ جوائن نہیں کی اور نہ ہی کسی کی خاطر فیلڈ چھوڑوں گی۔''

30۔ ''خاندان میں کون جلدی ناراض ہوجاتا ہے؟''

''کوئی نہیں۔''

31۔ ''کسی کی ایک اچھی عادت جو آپ چاہتی ہیں کہ آپ میں آجائے؟''

''کسی کی نہیں۔''

32۔ ''زندگی میں کچھ واپس ملنے کا چانس ملے تو؟''

''تو یونیورسٹی لائف واپس لینا چاہوں گی۔''

33۔ ''دل کا ٹوٹنا قابل برداشت نہیں یا موبائل کا ٹوٹنا؟''

''دونوں کا نہیں۔''

34۔ ''اپنے گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟''

''ہر کونے میں۔''

35۔ ''بیمار ہونے پر بیماری کو سیریس لیتی ہیں؟''

''یہ بات منحصر ہے کہ کون بیمار ہے۔''

36۔ ''اس فیلڈ میں کیا کیا کر چکی ہیں؟''

''ٹی وی ڈرامہ، کمرشل، فلم اور اسٹینڈ اپ کامیڈی''

37۔ ''کردار کون سے پسند ہیں، پوزیٹو یا نگیٹو؟

''کامیڈی، پوزیٹو اور نگیٹو، کوئی بھی مل جائے سب کرلوں گی۔''

38۔ ''پہلا ڈرامہ سیریل؟''

''برنس روڈ کا'' رومیو جیولٹ۔''

39۔ آپ شاہ خرچ ہیں یا تھوڑی کنجوس؟''

''میرا ہاتھ بہت کھلا ہے۔''

40۔ ''کچن سے لگاؤ؟''

''میں نے کافی سال کوکنگ کی ہے اور مجھے کوکنگ کرنا پسند ہے بیکنگ کرنا پسند ہے اور نئے نئے کھانے بنانا کا بھی۔''

41۔ ''کوئی فیصلہ جو غلط ثابت ہوا ہو؟''

''بہت سارے زندگی اسی کا نام ہے۔''

42۔ ''کس کو دیکھے بنا نیند نہیں آتی؟''

"رب سے بات کیے بنا۔"

43۔ "کس شخصیت میں چاہتے ہوئے بھی غصہ نہیں کر سکتیں؟"

"غصے والی حرکت پہ کسی پر بھی غصہ کر سکتی ہوں۔"

44۔ "ملک کی ترقی کی راہ میں کون رکاوٹ ہے حکمران یا عوام؟"

"حکمران۔"

45۔ "کیا آپ برانڈ کونشس ہیں؟"

"نہیں۔"

46۔ "کھانے کی ٹیبل پر کیا ہونا ضروری ہے؟"

"صاف اور اچھے برتن۔"

47۔ "کبھی غربت میں وقت گزارا؟"

"جی ہاں۔"

48۔ "ایک مضمون جو آج تک ناپسندیدہ ہے؟"

"پاکستان اسٹڈیز۔"

49۔ "ڈاکٹر، حکیم، ہومیو پیتھک کس پر اعتبار ہے؟"

"ڈاکٹر پر"

50۔ "دنیا کا سب سے بورنگ کام۔"

"کپڑے استری کرنا۔"

51۔ "کیا دل سے اترا ہوا انسان دوبارہ اپنی جگہ بنا سکتا ہے؟"

"نہیں کبھی نہیں۔"

52۔ "کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟"

"دنیا گھومنے۔"

53۔ "وقت کی پابندی کتنی قائل ہیں؟"

"تھوڑی تھوڑی۔"

54۔ "گھر کا کون سا کام کرنا پسند نہیں؟"

"سب کام کر لیتی ہوں۔"

55۔ "کس طرح کے کردار ریجیکٹ کر دیں گی؟"

"ہر کردار کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ بات اسکرپٹ کی ہوتی ہے۔"

56۔ "غصے میں آپ کی کیفیت؟"

"یا تو چپ ہو جاتی ہوں یا پھر اظہار کر کے غصہ نکال دیتی ہوں۔ دل کی بھڑاس نکال دیتی ہوں۔"

57۔ "کون سی تاریخیں یاد رہتی ہیں؟"

"اپنی اور بچوں کی سالگرہ کی تاریخ؟"

58۔ "آپ کے علاوہ کون کون اس فیلڈ میں ہے؟"

"بھائی اور پھوپھو۔"

59۔ "ایک نصیحت جو سب کو کرتی ہیں؟"

"جیو اور جینے دو۔"

60۔ "آج کل کیا آن ایئر ہے کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"کفیل اور دام محبت آن ایئر ہے اور کچھ پروجیکٹ ان شاء اللہ جلد ہی آن ایئر ہوں گے۔"

61۔ "کیا اپنا ڈرامہ بار بار دیکھتی ہیں؟"

"نہیں۔"

62۔ "گھر میں کون پڑھا کو تھا؟"

"بہن۔"

63۔ "مشکل میں کس کو کال کرتی ہیں؟"

"سب سے پہلے اللہ کو پھر بہن کو اور پھر دوستوں۔"

64۔ "کبھی بچپن میں مار کھائی؟"

"جی ہاں......بالکل۔"

65۔ "گھر میں کون بی بی سی ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

66۔ "کن چیزوں پر زیادہ خرچ کرتی ہیں؟"

"ہر چیز پہ الحمدللہ۔"

67۔ "لٹریچر سے آپ کا لگاؤ؟"

"شدید ہے۔"

68۔ "سوشل میڈیا سے آپ کی دلچسپی؟"

"کافی حد تک ہے۔"

69۔ "گھر میں بچت کی عادت کس کو ہے؟"

"مما کو۔"

70۔ "اپنے ملک کے پسندیدہ شہر؟"

"کراچی، اسلام آباد۔"

71۔ "ادھار کس سے بلا جھجک مانگ لیتی ہیں؟"

"ماں سے۔"

72۔ "کس کے روٹھ جانے سے پریشان ہو جاتی ہیں؟"

"اپنے قریبی لوگوں سے۔"

73۔ "پسندیدہ تہوار؟"

"سارے تہوار پسند ہیں۔"

74۔ "گھر میں کون حاتم طائی ہے؟"

"میں ہی ہوں۔"

75۔ "کبھی چھپ چھپ کر دوسروں کی باتیں سنیں؟"

"جی ہاں۔"

76۔ "قسمت یا جدوجہد کس پر یقین

الف لیلہ
ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہے؟"
"دونوں پر۔"
77۔"دنیا کی خطرناک مخلوق؟"
"خود پرست لوگ"
78۔"سائنس کی بہترین ایجاد۔"
"گوگل میپس"
79۔"شادی کی کن رسموں کے خلاف ہیں؟"
"ہر قسم کی جو بلاوجہ ہوں۔"
80۔"کون سا کھانا مشکل سے کھاتی ہیں؟"
"کوئی بھی نہیں۔"
81۔"فیملی میں مزاج کا کون گرم ہے؟"
"کوئی نہیں۔"
82۔"مہینے میں کتنی بار گھر سے باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟"
"تقریباً روزانہ کام پہ ہونے کی وجہ سے۔"
83۔"کھانا کھانے کا کہاں مزہ آتا ہے۔ اپنے بیڈ پر، چٹائی پر یا ڈائننگ ٹیبل پر۔"
"کھانا کہیں بھی کھائیں بس کھانا مزیدار ہو۔"
84۔"اچھی یا بری خبر سب سے پہلے کسے سناتی ہیں؟"
"ماں کو۔"
85۔"کن باتوں سے موڈ خراب ہوجاتا ہے؟"
"جھوٹ اور بناوٹی باتوں سے۔"
86۔"کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"
"کوئی بھی نہیں۔"
87۔"کیا چیزیں لیے بغیر سے نہیں نکلتیں؟"
"فون اور والٹ۔"
88۔"جانوروں میں پسندیدہ جانور؟"
"کتے۔"
89۔"کیا آپ کے اندر بھی ایک ولن ہے؟"
"کس میں نہیں ہے؟"
90۔"آپ کے گھر سے کون اس فیلڈ میں آنا چاہتا ہے؟"
"فی الحال کوئی نہیں۔"
91۔"غصے میں پہلا لفظ؟"
"ڈیم اٹ لعنت ہے۔"
92۔"پہلی ملاقات میں شخصیت کی کس چیز کا جائزہ لیتی ہیں؟"
"ذہانت کا۔"
93۔"شوبز میں آنے کی وجہ؟ کس نے متعارف کرایا؟"
"کوئی پلان نہیں تھا بس اتفاق ہوا اور راستے بنتے چلے گئے۔"
94۔"کس قسم کی کتابیں زیادہ پڑھتی ہیں؟"
"میں زیادہ تر فکشن پڑھتی ہوں۔"
95۔"سوشل میڈیا نہ ہوتا تو؟"
"تو پھر فاصلے زیادہ ہوتے"
96۔"پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"
"کراچی کی بوٹ بیسن اور Leukit lein lang ملائیشیا کی۔"
97۔"آپ کے موبائل پہ صبح سویرے پہلا میسج کس کا آتا ہے؟"
"کسی کا نہیں۔"
98۔"اگر اپنا ریسٹورنٹ کھولیں تو کون سی ڈش کبھی نہیں بکنے دیں گی؟"
"سب کچھ بکے گا۔"
99۔"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"پہلے عروج تو آئے۔"

رنگ عید کے

ادارہ

عید خوشیوں بھرا تہوار...... تہواروں کی خوشی بھی ماند نہیں پڑتی ہر سال عید آتی ہے اور ہم اسی جوش و جذبے سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ہر بار نیا لطف نئی خوشی ملتی ہے۔
عید کی روایتیں اپنے اندر بڑا حسن رکھتی ہیں۔ مہنگائی کے باوجود سب ہی اپنی بساط کے مطابق عید کا اہتمام کرتے ہیں۔ اپنے لیے نہ سہی لیکن بچوں کے لیے ضرور کپڑوں اور دیگر لوازمات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔
ہم نے حسب روایت قارئین سے عید سروے کا اہتمام کیا ہے۔ پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔
سوالات یہ ہیں
1۔ کبھی کوئی ایسی عید منائی جب نامساعد حالات کی وجہ سے عید کی تیاری کے لیے آپ کے پاس وسائل کم تھے۔ ایسی صورت میں آپ نے اپنے سلیقے اور سمجھ داری کے ساتھ سب کچھ کس طرح سنبھالا اور کسی کو احساس تک ہونے دیا۔
2۔ عید کی خریداری میں آپ کی پہلی ترجیح کیا ہوتی ہے۔ چاند رات کو کیا تیاری کر کے سوتی ہیں۔ عید کے دن گھر والوں کی طرف سے کس ڈش کی فرمائش ہوتی ہے۔
آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

فرخندہ سلیم ملتان

1۔ خواتین ڈائجسٹ کی بہنوں عید مبارک سب کو اور ہائے اللہ! بہت ہی جذباتی سا سوال ہے تو جذباتی انداز میں ہی پڑھ لیں اور دوسرا جواب پڑھ کر گرما گرم سموسے کے سنگ پودینے اور ہری مرچ کی تیکھی چٹنی کا لطف اٹھالیں۔
تو ایک عید ایسی بھی آئی تھی جب حالات نے جیب کو یوں ہلکا کر دیا تھا کہ بازار کا رخ کرنا بھی سوچ سمجھ کر پڑ جاوے تھا، مگر میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ بچوں کی خوشی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہونے دوں گی۔
نئی خریداری ممکن نہ تھی، تو میں نے الماری کھولی اور پرانے مگر عمدہ کپڑوں کو اس نظر سے دیکھا جیسے کوئی ماہر درزی ہو وے جو کپڑے نہیں، امکانات دیکھتا ہے۔
کہیں آستین کا انداز بدلا، کہیں باریک سی کڑھائی سے نیا نقش پیدا کیا، کہیں دامن پر نفیس سا فیتہ لگا دیا۔ کپڑا وہی تھا مگر صورت بدل گئی اور یہی تو گھریلو ہنر ہے کہ کمی کو بھی وقار کے ساتھ چھپالیا جاوے۔
بچوں کو میں نے بڑے اطمینان سے بتایا کہ اس بار ہم سادگی میں خوب صورتی پیدا کریں گے اور ان کے کپڑے اس اہتمام سے سنبھالے کہ انہیں خود بھی احساس نہ ہوا کہ نیا کیا ہے اور سنوارا ہوا کیا۔
دلی کے بزرگ کہا کرتے تھے کہ آدمی کو ہمیشہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں، سو میں نے بھی یہی کیا، مگر اس انداز سے کہ کسی کے چہرے پر ملال نہ آوے۔
تیاری کے دوران ایک چھوٹی سی دلچسپ بات

بھی ہوتی۔ جب میں کپڑوں کو آخری بار استری کر رہی تھی تو بچوں میں سے ایک نے پوچھا کہ
"اس بار کپڑے اتنے قرینے سے کیوں رکھے جا رہے ہیں۔"
تو میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ خوب صورتی ہمیشہ نئے ہونے سے نہیں، سلیقے سے پیدا ہوتی ہے کہ حالات گھر کے پاکستان اور انڈیا والے تھے۔ صبح جب وہی سنوارے ہوئے لباس پہن کر سب کے سامنے آئے تو چہروں کی چمک دیکھ کر یوں لگا جیسے محنت نے خود اپنا تعارف کرا دیا ہو۔ اس لمحے دل میں یہ اطمینان جاگا کہ اگر تدبیر ساتھ ہو تو آدمی مشکل وقت میں بھی "آبرو رکھ لیتا ہے۔" اور کسی کو احساس تک نہیں ہونے دیتا کہ پس منظر میں کتنی محنت چھپی ہے۔

گھر کے بزرگوں کی نگاہیں بھی اس دن خاص طور جائزہ لے رہی تھیں، مگر ان کی خاموشی میں ایک طرح کی رضامندی تھی، جیسے بغیر کہے تسلیم کر لیا ہو کہ معاملہ سنبھل گیا۔

میں نے دل میں مسکرا کر سوچا کہ بعض اوقات عورت کی خاموش محنت ہی گھر کی اصل شان ہوتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے مواقع پر دل کو مضبوط رکھنا پڑتا ہے، ورنہ پریشانی ظاہر ہو جائے تو خوشی دھندلا جاتی ہے۔ اس لیے میں نے ہر مرحلے پر یہی کوشش کی کہ بچوں کو صرف تہوار کی خوشی محسوس ہو، کسی کمی کا شائبہ بھی نہیں آئے۔ بزرگوں کی ایک اور بات یاد آئی کہ جہاں سلیقہ ہو وہاں کمی ظاہر نہیں ہوتی اور میں نے اسی اصول کو اپنی رہنمائی بنایا۔

یوں وہ عید بظاہر سادہ تھی مگر میرے لیے نہایت معنی خیز بن گئی۔ اس میں دکھاوے کی چمک کم تھی مگر اپنائیت کی روشنی زیادہ تھی، اور بچوں کی مسکراہٹ دیکھ کر یہی لگا کہ اصل خوشی نئے کپڑوں میں نہیں بلکہ اس محبت اور اہتمام میں ہے جو انہیں پہناتے وقت دل میں ہوتا ہے۔ اس تجربے نے مجھے پھر یقین دلایا کہ گھریلو تدبیر اور حوصلہ ساتھ ہو تو مشکل سے مشکل گھڑی بھی سنبھل جاتی ہے، اور تہوار کی رونق دلوں میں باقی رہتی ہے،

چاہے وسائل کم ہی کیوں نہ ہوں اور اب یہ ہوا اس جذباتی سین کا اینڈ۔

2۔عید کی خریداری میں ہماری پہلی ترجیح ہمیشہ وہ چیزیں ہووے جس کے بغیر گھر میں فوراً تبصروں کی محفل جم جاوے ہے اور ہر کوئی ایسے دیکھے ہے جیسے میں نے تہوار نہیں، کوئی امتحان بگاڑ دیا ہو۔

سب سے پہلے بچوں کے کپڑے لیتی ہوں، کیونکہ بچے خوش ہوں تو آدھا گھر خود بخود مطمئن ہو جاتا ہے، اور اگر وہی اداس ہو جائیں تو پھر بات بچوں کی نظر میں ''ناک کٹنے'' تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس کے بعد سیدھا رخ ہمرا کچن کی طرف ہووے ہے، سویاں، میوہ، دودھ، مسالے کیونکہ اگر عید کے دن دسترخوان ذرا سا بھی کمزور لگ جائے تو فوراً رائے سازی شروع ہو جاوے ہے، جیسے پورے خاندان کی عزت کا وزن ایک دیگ پر رکھا ہو۔ بازار میں قیمتیں سن کر دل تو چاہیے ہے واپس مڑ جاؤں، مگر گھر کی توقعات ایسی ہوتی ہیں کہ بندہ'' لوہے کے چنے چبانے'' پر بھی آمادہ ہو جائے۔

خریداری کے دوران ہر چیز کو یوں پرکھتی ہوں جیسے کوئی ماہر جوہری نگینہ دیکھے ہے، کیونکہ بعد میں اگر ذرا سی کرہ جائے تو وہی جملہ سننے کو ملتا ہے کہ ''اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔''

3۔چاند رات کو باقی لوگ خوشی میں مصروف ہووے ہیں اور میں گھر کو اس طرح سمیٹتی ہوں جیسے صبح بیٹی کی ہونے والی چلتر سی ساس، اکھڑ مزاج نند اور ظالم جیٹھانی اور پھنورے سے جیٹھ نے آنا ہو۔

کچن میں ایک ایک چیز ترتیب سے رکھتی ہوں۔ سویاں بھون کر الگ، میوہ کاٹ کر الگ، دودھ تیار، برتن چمکائے ہوئے چانٹے مار کر اور آٹے کو پیٹ کر گوندھ دیا تاکہ صبح کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

کپڑے لتے استری کر کے ایسے سنبھال کر رکھتی ہوں، جیسے قارون کا خزانہ ہووے، کیونکہ اگر عین وقت پر کوئی چیز نہ ملے تو سب کی نظریں ایک ساتھ میری طرف اٹھتی ہیں جیسے میں ذمہ دار ہوں۔ بچوں کو بار بار سمجھاتی ہوں کہ اپنی چیزیں اپنی جگہ رکھو، مگر صبح وہی حال کہ ڈھونڈنے والوں کا جلوس نکل آتا ہے اور میں دل میں سوچتی ہوں کہ یہاں ہر چیز خود سے غائب نہیں ہوتی، کسی نہ کسی کی'' اپنی ڈفلی اپنا راگ'' والی عادت بھی کارفرما ہووے ہے۔

عید کے دن گھر والوں کی فرمائشیں سن کر کبھی کبھی یوں لگے ہے جیسے میں باورچی نہیں، ایک ساتھ کئی مزاجوں کو راضی کرنے والی ملکی سفیر ہوں۔ کسی کو شیر خورما گاڑھا چاہیے، کسی کو میٹھا ہلکا، کسی کو میٹھا کم، کسی کو خوشبو زیادہ اور میرا سب کی بات بن کر دماغ خراب ہو جاوے، حالانکہ دل میں ہلکی سی ہنسی بھی آتی ہے کہ ایک ہی دیگ میں سب کی پسند کیسے سما جائے۔ مگر جب دسترخوان بچھتا ہے اور سب مطمئن ہو کر کھاتے ہیں تو ساری تھکن جیسے ہوا میں تتلی طرح اڑ جاتی ہے۔ تب دل میں یہی خیال آتا ہے کہ گھریلو عورت کی عید دراصل ذائقوں سے زیادہ برداشت، سلیقہ اور تھوڑی سی خوش مزاجی جمع تیکھے اور چٹ پٹے پن کا نام ہے جہاں محبت بھی ہے، ذمہ داری بھی، اور ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ بھی، رشتوں کا ذرا سا چلتر پن بھی، جو سب کچھ سنبھالے رکھتی ہے تو یہ ہے خواتین ڈائجسٹ کی دوپٹا بدل سہیلی فرخندہ سلیم کا کھٹی میٹھی عید کے دن کا ماجرا اور یہ کیسا لگا تبصروں میں ضرور بتائیں۔

سلمیٰ مسرت......راولپنڈی

1۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب گھر بن رہا تھا، بچے بہت چھوٹے تھے، کمیٹیاں ڈال کر دو دو جابز کر کے میرے میاں نے اور میں نے کفایت شعاری سے اللہ کی توفیق اور کرم سے ہر مرحلہ طے کیا۔ اس دوران دو تین عیدیں میں نے گھر پر اس لیے گزاریں نہ میکے گئی نہ سسرال نہ کسی سے ملنے اس شہر میں بہانہ بنایا۔ سبزی پلاؤ آلو کے کباب جو بھی میسر تھا بنا کر بچوں کو پارک گھمالائے۔ کپڑے وغیرہ امی ابو بنا دیتے تھے الحمدللہ کسی کو بھی پتا نہیں لگا۔

2۔خاص تیاری گھر کی خاص صفائی رمضان

سے پہلے کر لیتی ہوں پھر 20 رمضان کو درس کی دعا کروا کر گھر کی طرف قیام اللیل کی طرف مکمل توجہ ہوتی ہے، بچوں کی گروسری میرے میاں ہی کرتے ہیں مجھے ہمیشہ سے بیڈ شیٹس اور گھر کی ڈیکوریشن کا شوق رہا ہے عید پر ہر سال یہ اہتمام ہوتا ہے۔ چھوٹی موٹی کوئی چیز بچوں کی رہ جائے تو مارکیٹ بالکل ہمسائے میں ہے عائشہ اور ماہا جا کر لے آتی ہیں بلکہ اب تو آن لائن ہی کام چلتا ہے۔

سب گھر والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ عبادت کے لمحے ضائع نہ ہوں۔

3۔ چاند رات کو سب کپڑے پریس کر کے صبح ناشتے کے ساتھ پکوان کی تیاری کر کے سوتی ہوں گھر تو رات کو ہی صاف ستھرا کر لیتے ہیں کیونکہ صبح عید کی نماز بہت جلدی ہو جاتی ہے، واپسی پر قبرستان سے ہوتے ہوئے گھر آتے ہیں عید کی نماز میں ساری فیملیز سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

آج کل دوپہر میں بریانی اور عمر کی فرمائش پر عید کے دن پکوڑے اور دہی پھلکیاں ضرور بنتی ہیں۔

رضوانہ وقاص......کرلاں ہری پور

1۔ الحمدللہ شکر ہے اللہ پاک کا کہ جس نے ہمیں بے شمار نعمتوں سے نوازا۔ اس رب کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ بچپن کی عیدیں تھیں۔ کیونکہ ہمارے ابو سعودیہ میں کام کرتے تھے۔ تو تھوڑا بہت مسئلہ ہو جاتا تھا۔ لیکن میری امی نے کبھی ہمیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔

مجھے یہ بات نہیں بھولتی کیونکہ بچپن کی بات ذہن میں رہ جاتی ہے میری امی کی طرف نانو کا فون آیا ہوا تھا۔ چوتھا یا پانچواں روزہ تھا۔ تو نانو نے امی سے پوچھا۔

"روزے کی تیاری ہے کیا بنایا ہوا ہے۔"

امی نے صرف کڑھی بنائی تھی لیکن نانو کو بولا کہ میری روزے کی تیاری بہت اچھی ہے۔

تو میں پاس بیٹھی سن رہی تھی میں نے سوچا امی نے ایسا کیوں کہا اور وہ بات اب جا کر سمجھ میں آئی ہے کہ بیٹیاں جو ہوتی ہیں والدین کو پریشان نہیں کرتیں۔ اب تو شکر ہے اللہ پاک کا۔ میری اب یہی کوشش ہوتی ہے کہ میرے بچوں کی تیاری عید کی اچھی ہونی چاہیے۔

2۔ عید تو بچپن کی ہوتی تھی۔ اب بھی شکر ہے اللہ کا۔ کپڑے ساتھ میں میچنگ چوڑیاں لازمی ہونی چاہئیں اور مہندی میری تیاری ہوگئی۔

امی چاند رات کو چنے ابالنے کے لیے رکھ دیتی ہیں۔ کہ صبح دیر نہ ہو جائے ہمارے گھر میں چنا چاٹ لازمی بنتی ہے اور بہت ہی مزیدار۔ امی اب پاپڑی وغیرہ ڈالنے لگی ہیں۔ لیکن مجھے سادہ چاٹ اچھی لگتی ہے اور فرمائش پر گھر کی سویاں۔ امی سے فرمائش کر کے بنواتے ہیں سب گھر والے۔

میشے علی خان......خانیوال

دیکھیں جی جو مہنگائی اور کمائی کا ریشو چل رہا ہے نا تو نامساعد حالات کا سامنا تو مجھے لگتا ہے مڈل کلاس فیملیز کو اکثر ہی رہتا ہے تاہم ان حالات کی وجہ سے بچوں کی عید کی تیاری پر فرق نہیں پڑنے دیا کبھی الحمدللہ۔ ہاں خود کے لیے جی مارنا پڑے تو الگ بات ہے ویسے ہوا نہیں کبھی اور جہاں تک بات ہے کسی کو پتا نہ چلنے کی تو بات یہ ہے کہ میکہ بالکل ہی ساتھ ہے گھر میں دھیمی آواز میں بولیں بھی تو آواز ادھر جاتی ہے تو ان سے کچھ چھپانا ناممکن ہے۔ (اللہ میرے میکے اور ماں کو ہمیشہ سلامت رکھے جو آج امی کے گزر جانے کے پانچ سال بعد بھی باجی منور اور ابو کے دم قدم سے تا حال قائم ہے اور ہمیشہ رہے آمین۔)

اور میکے کے علاوہ میرا نہیں خیال کہ کسی کو بھی ہمارے حالات سے فرق پڑتا ہو۔ باقی سب کی اپنی رائے کسی کو برا لگے تو معذرت۔

2۔ عید کی تیاری میں پہلی ترجیح دونوں بیٹیوں اور بیٹے کے کپڑے، جوتے اور دیگر اشیاء کی ہی ہوتی

ہے۔عید کے دن کے لیے تیاری بچوں کے، ان کے ابو کے کپڑے استری شدہ ہوں جوتوں کے ڈبے سامنے ہوں اور بچیوں کی باقی اشیاء بھی کہ اگر وہ تیار ہونا شروع ہوں۔

تو بار بار مجھے نہ ملانا پڑے کہ عید کی صبح بہت مصروف ہوتی ہے۔

گھر والوں کی طرف سے کچھ خاص فرمائش نہیں وجہ یہ کہ میں بچوں کو جنک فوڈ نہیں کھانے دیتی تو عید کا دن تو میرب، مشعال کے لیے واقعی عید ہوتا ہے کہ عیدی لی اور نکل گئیں باہر اب گول گپے کھاؤ، پکوڑے سموسے یا برگر ماں کہاں روک پائے گی۔

اور مجھے تو گھر کا سالن روٹی ہمیشہ اور بروقت ہی پسند ہے تاہم عید والے دن سہ پہر کو بچوں کو لے جاتی ہوں برابر کچھ کھلانے کے لیے یا اگلے دن تو بچوں کے لیے فینٹسی کہ ماں ان کی مرضی کا کھلا دیں گی بھلے فاسٹ فوڈ ہی ہو اور مشعال کو کھلونے آ جائیں تو بس وہ خوش ہی خوش۔ اور عالیان کو سارا دن گھر سے باہر کزنز کے ساتھ انجوائے کرنے دیا جائے۔ لیں جی گزر گئی ہماری عید۔

1۔اس کا جواب ہے کہ شکر اللہ کا ایسی کوئی عید نہیں آئی کہ حالات کی وجہ سے عید کی تیاری نہ کی جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ بہت اچھی طرح عید منائی ہے پہلے امی پاپا ہمارے لیے عید کی پوری تیاری کرواتے تھے شادی کے بعد میرے ہزبینڈ نے ہمیشہ بہت اچھی عید کروائی اب میرے بچے بہت اچھی عید کی تیاری کرواتے ہیں پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

2۔سب سے پہلی ترجیح اپنی جیب کو دیتی ہوں زیادہ فضول خرچی نہ میں کرتی ہوں اور نہ ہی شروع سے بچوں کو کرنے دی تو بچوں کو بھی وہی عادت ہے کہ یہ لوگ بھی صرف ضرورت کی چیز لیتے ہیں۔ بہر حال اس دور میں بھی کوشش کرتی ہوں کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی خیال رکھوں۔ کیونکہ ہم تو خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں لیکن وہ لوگ جو کچھ خریدنے کی

طاقت نہیں رکھتے اُن کے لیے عید کی خوشیوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوں۔ اور رمضان میں بھی رمضان پیکیج کے باکس بنوا کر پاکستان میں کئی فیملیز کو دیتی ہوں بہت خاموشی اور رازداری سے کرتی ہوں اور

دعا کرتی ہوں کہ اللہ یہ نیکی کو قبول فرمالیں۔

2۔ چاند رات کو بہت کام ہوتا ہے پہلے شیر خورما بناتی ہوں۔ بریانی کا مسالہ تیار کرتی ہوں۔ کوئی ایک سالن کا مسالہ بنا کر رکھتی ہوں شامی کباب بناتی ہوں۔ چاند رات کا تو مت پوچھیں بہت کام ہوتا ہے پھر گھر کی صفائی ہوتی ہے، صبح نماز میں جانے کے لیے سب کے کپڑے پریس کرتی ہوں بھئی بہت کام ہوتے ہیں۔

3۔ عید کے دن سب گھر والوں کی ایک ہی فرمائش ہوتی ہے کہ بریانی۔ شامی کباب اور چکن 65 بنائیں۔ یہ چیزیں ضرور بنتی ہیں۔

حامدہ بیگم...... کراچی

1۔ جی ہاں بالکل ایسی عید بھی گزری ہے کہ گھر میں مسائل تھے میرے شوہر مرحوم کا اچھا خاصا چلتا کام ٹھپ ہوگیا تھا۔ پہلے ان کا چھوٹا سا کارخانہ بڑا چلتا تھا پھر مسئلے ایسے ہوئے کہ پہلے انہیں ملازموں کو نکالنا پڑا خود بے چارے اکیلے کام کرنے لگے لیکن نجانے کیسی نحوست تھی کہ کرایہ کیسے ادا کرتے مشینیں گھر لے آئے پر کیا بتائیں۔ عید آئی تو جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے۔ لہٰذا سب نے اس بات کو سمجھا نہیں کھانے پینے میں ویسے بھی سسرال میں برکت تھی پھر مبارک مہینہ بچے چھوٹے تھے آرام سے گزارہ ہوگیا۔ دو جوان نندیں اور ایک دیور غیر شادی شدہ تھے کپڑے کیسے بناتے پچھلی عید کے کپڑے بچوں کے نئے رکھے تھے خاموشی سے ان ہی کپڑوں کو استری کرکے رکھ دیا کسی کو نہ کہا لیکن میرے شوہر مرحوم کو قلق تھا کہ یہ پہلی عید بچوں کی اسی طرح گزرے گی لیکن مجبوری تھی۔

عید سے چند دن پہلے میرے دیور جو بیرون ملک رہتے تھے ان کو حالات کا علم ہوا اور انہوں نے میری ساس کو پیسے بھجوائے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ بچے نئے کپڑے جوتے وغیرہ نہ لیں۔ بہر حال ساس نندیں ضد کرکے بازار لے گئیں اور بچوں کے لیے نئے کپڑے خریدے اس وقت ریڈی میڈ ہی اتنے اچھے کوالٹی کے کپڑے نہیں ملتے تھے، کپڑا خریدا گیا اور بچوں کے لیے کپڑے سر پر کھڑے ہوکر سلوائے لیکن اتنی جلدی کون سیتا ہے۔ پہلے دن بچوں نے پرانے اور دوسرے دن نئے بھاگم بھاگ والے کپڑے پہنے۔

2۔ عید کی خریداری میں پہلی ترجیح ظاہر ہے کہ کپڑے ہی ہوتی ہے اور رب العزت کا شکر ہے کہ ہر سال جو نیا کپڑا آتا تھا اس کے ہم اپنی بچیوں کے کپڑے بناتے۔ پھر چوڑیاں، میچنگ کی ضروری اور سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ میری ساس نندوں کو بچیوں کی فکر ہوتی کہ سب آگیا۔

چاندرات کی تیاری میں شادی شدہ زندگی کے معاملات کنواری لڑکیوں کے مقابلے میں الگ ہوتے ہیں اور اس کے لیے ہم مہینہ بھر پہلے گھر کی صفائی ستھرائی سے آغاز کرتے ہیں، ویسے یہ کام میری نند نے خوب انجام دیا میرا کام پکانے کا ہوتا تھا میرے ہاتھ کا پلاؤ خاندان بھر میں پسند کیا جاتا تھا تو یخنی کی تیاری ضروری ہوتی، ویسے شام کو سب نندوں، دیوروں کے گھر والے آتے ہلا گلا رہتا۔ میں، میری دیورانی اور نند مصروف بھی رہتے اور ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ بھی چلتی۔

آج اسپتال کے بیڈ پر ہوں، نانی دادی بن چکی ہوں۔ اس سروے کے سوالات نے ماضی کے کئی در وا کر دیے کتنا خوب صورت زمانہ تھا وہ بھی۔

میرے ہے کہ بھابھی جان پلاؤ کے ساتھ لہسن اور لال مرچوں کی چٹنی بھی ہو تو کیا بات ہے۔ آج کل کے دور میں وہ محبتیں نہیں رہیں شاید مہنگائی بھی ایک سبب ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مہنگائی کا رونا تو اس وقت بھی تھا حالانکہ ہم کھاتے پیتے لوگ تھے شاید اب موبائل فون نے فاصلے بڑھا دیے اور بڑوں کی وہ اہمیت نہ رہی۔

☆☆

رضوانہ وقاص.....کرلاں ہری پور

سب سے پہلے "ہمارے نام" دیکھا اتنی بیار ہوئی ہوں۔ لیکن کسی نے یاد نہیں کیا۔ اب آتے ہیں اپنے خواتین کی طرف، ہنستی مسکراتی ماڈل بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔ کپڑوں کا رنگ بہت ہی پیارا۔ "کہی سنی" پڑھی یہ سانحہ تو بھول ہی نہیں سکتے۔ اللہ پاک ان کے والدین کو صبر دے۔ آمین۔

"کرن کرن روشنی" میں بہت سی اچھی باتیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ پھر بچوں کو بھی پڑھ کر سناتی ہوں اور سمجھاتی بھی ہوں۔

صائمہ نور سے ملاقات اچھی لگی۔ "اکبری اصغری" پڑھا۔ عروہ کا پڑھ کر ہنسی آتی رہی۔ ایلفی کے ساتھ بھی کوئی جوڑتا ہے بٹن۔ (ہاہاہاہا)

"اے، ٹی، ایم" پڑھا۔ بھائی کو اے ٹی ایم کارڈ کیوں دیا پاس ہی رکھ لیتا۔ "رنگا رنگ پھول" بہت ہی اچھا لگا پڑھ کر۔ "خاتون کی ڈائری" میں سب کی غزلیں اچھی لگیں۔ "موسم کے پکوان" پڑھا "مکئی کی روٹی سرسوں کا ساگ" کی ترکیب پڑھی۔ میری امی بناتی ہیں بہت ہی مزے کا۔ جب اس میں دیسی گھی ڈالیں تو کیا لذت ہوتی ہے۔ اور اگر دھوپ میں بیٹھ کر کھائیں اور ساتھ میں لسی ہو تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ لیکن میں لسی نہیں پیتی سردیوں میں۔ مکئی کی روٹی کی ترکیب امی کو بتائی تو انہوں نے کہا کہ اسے ہماری زبان میں ڈاڑہاڑا کہتے ہیں۔

"نفسیاتی الجھنیں" ن۔م کراچی اور مس صاحبہ کراچی کا پڑھا۔ اللہ پاک سے دعا ہے سب کی پریشانیاں دور کریں۔

ج: پیاری رضوانہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کلی سے نوازے۔ آمین

خواتین آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔

فرخندہ سلیم.....ملتان

بہت مصروف رہی میری سب سے چھوٹی نند آ گئی تھی دس بارہ دن کے لیے رہنے، اس کا رسولی کا آپریشن ہوا تھا، سب لڑکے ہیں کون دیکھ بھال کرتا تو ہمارے گھر

نامۂ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:Info@khawateendigest.com

ہی رہی، بے چاری کا بہت بڑا آپریشن ہوا، تین رسولیاں تھیں بڑی تکلیف برداشت کی تو گھر میں بہت ہی رونق لگی رہی۔ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی آتا رہا ملنے اور میں بیٹی کے ساتھ گھر کے کام کرتی رہی نند کو سنبھالنا۔ بے چاری کو پیشاب اور خون کی نالی لگی ہوئی تھی، اب کچھ بہتر ہے اب گھر گئی ہے خوب دعائیں دیں بچوں کو اور مجھے، پرانے وقت کی بری تلخ باتوں کو میں سمجھتی ہوں بھلا دینا چاہیے تو ایسا ہی ہے وہ بھی اچھی ہے، میں کیوں برائی کروں۔

سرورق حسین ترین ہوتے ہیں اور کہانیاں قسط وار چاند لگا رہی ہیں بس یہ کہنا چاہوں گی کہ کوئی نیا سلسلہ بھی شروع کرو کہ آٹھ نو سال سے سب پرانے ہی ہیں سلسلے۔ ذرا تبدیلی اچھی لگتی ہے اب صفحے تو زیادہ ہونا مشکل ہے تو کسی کو کم یا روک کر۔

سب سے پہلے تو جنوری کے خواتین کے سرورق کا ذکر کہ اتنا حسین تھا کہ الفاظ کم ہیں تعریف کے لیے اور اب

فروری کا بھی۔ سنیعہ عمیر کی نئی کہانی پہلے کی طرح جاندار ہے، منفرد پلاٹ اور نام کافی دلچسپ ہے۔ لفاظی اگرچہ عام تھی مگر کردار نگاری مجھے بہت پسند آئی۔ فواد کی ہمت اور اچھی امید، سائرہ اور صارم کی کہانی اور راحین کی کہانی، اس کی بیاری، رشید کا کردار سب حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں اور میں تو سمجھتی ہوں ہر کہانی اصل ہوتی ہے بس کرداروں کے نام بدلے ہوتے ہیں مگر کتنا کچھ انسان کہانیوں سے سیکھ جاتا ہے۔ ہم تو کہانیاں ڈائجسٹوں کو پڑھ کر جیتی ہیں۔

سمیرا حمید نے اس بار "کونج" لکھ کر کتنی لڑکیوں کو ہمت دی جو عینی جیسی قسمت کی ماری ہوتی ہیں مگر کہانیاں ہی امید کا دیا بن جاتی ہیں جیسے ہیروئن نے اپنی طلاق کے بعد بھی، اتنے شدید رویے برداشت کرتے ہوئے بھی ہمت نہیں ہاری اور محنت سے خود کو منوالیا، سمیرا کا قلم جینے کی امید دیتا ہے۔

عنبرین ابدال ہمیشہ معاشرتی موضوع پر عرق ریزی سے لکھتی ہیں۔ زرکشا نام بہت اچھا لگا جس کا شوہر جلیل ایک نمبر کا ذلیل ہی تھا انسان کی شکل اچھی نہ ہو کام تو اچھے کرے۔ گڑ نہ دے گڑ جیسی بات ہی کردے۔ اینڈ بھی خوش گوار تھا تو کہانی پڑھنا اچھا لگا۔

عقیلہ ہاشمی کا قلم بڑا شگفتہ اور دلچسپ وشوخ انداز میں ایسا لکھتا ہے کہ پڑھ کر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ہائے اماں کے سارے خواب ٹوٹے جب بلی کو بہو کے روپ میں دیکھنے کا شرف حاصل کیا۔ معراج صاحب کا کردار دلچسپ لگا۔ کہانی سادہ مگر شوخ سا انداز اچھا لگا اور وہیں آخری سین پڑھ کر ہنسی آنا ظاہر ہے ضروری تھا۔

نزل کوثر کی رعنا افسانہ اس قدر دلکش انداز اور پس منظر میں لکھا گیا تھا بالکل میری پسند والا انداز تھا منظر کا، الفاظ کا چناؤ بہت ہی عمدہ تھا۔

شازیہ الطاف کا لکھا مجھے ہمیشہ پسند ہے چاہے تلخ ہی ہو کہ یہ سب حقیقتیں ہوتی ہیں، افسانے میں شازیہ نے بیتوی کے توسط سے بہت اچھا سبق دیا کہ اگر وہ طلاق لے لیتی تو اکیلی کیسے سب کرتی اور میکے میں ماحول بھی اس کے لیے سازگار نہیں تھا اس نے سمجھوتا کیا اور عورت کا دوسرا نام سمجھوتا ہی ہے جس کا پھل ملتا ضرور ہے مگر بہت دیر بھی ہو سکتی ہے۔

ہیبہ عائش کا افسانہ رمضان کی مناسبت سے کافی تروتازہ تھا جس میں بچوں کے ساتھ بڑوں کے لیے بھی بہت ہی اصلاحی پہلو بتائے گئے کہ رمضان میں کھانے پینے پر توجہ ہوگی تو مقصد ہی ختم ہو جائے گا افسانہ صدقہ جاریہ تھا۔

ریحانہ وقاص کا افسانہ بہت ہی معیاری تھا کہ طویل ہونے کے ساتھ روانی اور پلاٹ بہترین پھر شمسہ جیسی لڑکیوں کے لیے گہرا سبق تھا جو اپنی عادتوں کی وجہ سے اپنی زندگی برباد کرتی ہیں۔

حسنہ حسین کا بتایا تو اتنی خوشی ہوئی تھی کہ یقین تھا کہ شعاع میں عمر یسرا کی طرح کمال آنے والا ہے اور وہی ہوا قسم سے غضب کی کہانی ہے دونوں قسطوں پر رائے دوں کہ پچھلے ماہ لیٹ ہوگئی تھی۔ پلاٹ منفرد، پراسرار انداز، شاعری کے الفاظ اور فلسفہ اور کہانی میں الفاظ کی بنت، رویے لہجے سب بے حد پسند آرہے ہیں۔ ابتہال اور اس کی ماں میرال کی کہانی، دل ربا کی شاہ زل کے ساتھ بے وفائی، سفیر کا کردار، ماضی کی جھلکیاں، قبر کے منظر، حویلی کا انداز، ذرا پراسرار اور خوفناک سا کچھ یہ سب پڑھنا بہت اچھا لگ رہا ہے کہ بہت منفرد شروع کیا ہے نہ تیکھا پن شوخی والا بلکہ ایک الگ ہی کاٹ دار انداز ہے اور سب سے بڑھ کر الفاظ کی بنت اعلیٰ ہے۔ آئلہ کی اس قسط میں بے بسی ریشم کا ظالمانہ انداز اور ابتہال کے دوست، یہ کردار کہانی بہت مزے کی شروع ہوئی ہے اور آگے جا کر مزید دلچسپ ہوگی یقین ہے۔

ج: پیاری فرخندہ! بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے آپ نے خوش رہیں اور اسی طرح دوسروں کو خوش کرتی رہیں۔

آپ کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ پرانی باتوں کو بھلا دینا چاہیے۔ جن کے دل صاف ہوتے ہیں ان کے چہرے پر رونق ہوتے ہیں۔

ناہید اسمٰعیل......کراچی

ٹائٹل پر ماڈل کا خوب صورت پرنٹڈ سوٹ اس پر ٹیکہ، گلوبند اور جھمکے سجے سنورے دلکش چہرے کے ساتھ

سر پر دوپٹہ، واہ کیا عجب بہار چھائی ہے۔ کرن کرن روشنی میں رمضان المبارک کی نسبت سے اہم اور مفید معلومات روح کو تراوٹ بخشنے کا ذریعہ بنیں۔

''ابتهال'' کی دوسری قسط پہلی سے بڑھ کر متاثر کن رہی، کہانی زبردست اور اس پر حسنیٰ حسین کا خوب صورت انداز تحریر اور دل کو چھو جانے والی شاعری کا انتخاب، سچ دل کر رہا ہے تمام اقساط اکٹھی پڑھنے کو مل جائیں، کسی بھی کہانی میں مسلسل سسپنس قاری کو اکتاہٹ میں مبتلا کرنے لگتا ہے سو اچھی بات یہ بھی ہوئی کہ دوسری ہی قسط میں کہانی واضح ہونی شروع ہو گئی اور ہماری دلچسپی مزید بڑھ گئی۔ دوسرا سلسلے وار ناول کب شروع ہوگا۔

''بازی کدہ'' تمام تحریروں پہ بازی لے گیا اب اس بازی کدہ میں کس کو شہ اور کس کو مات ہوگی شدت سے انتظار ہے۔ فواد اور اس کے والدین کی قابل رشک قناعت پسندی، شکر گزاری اور خوش امیدی پڑھنے والوں کی بہترین تربیت کر رہی ہے۔ سدیعہ کا انداز تحریر اس قدر منفرد اور خوب صورت ہے کہ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

''گونج'' سمیرا احمید کی ایک اور یادگار تحریر، عینی نے خاموشی کی راہ اپنا کر، صبر، محنت اور عزم و حوصلے کو اپنا ہتھیار بنایا تو سرخروئی اس کا مقدر بنی۔ بازی کدہ اور گونج جیسی تحریریں بلاشبہ کم حوصلہ اور مایوس دلوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

عنبرین ابدال کی تحریر کا عنوان پہلے تو ہیرو ہیروئن کے درمیان ڈائیلاگ کا ایک رومانٹک حصہ محسوس ہوا ظاہر ہے ہم جیسے عام انسانوں کی سوچ پہلے الٹی سمت ہی جاتی ہے ہاہا، جب پوری کہانی پڑھی تب جا کر ہماری عقل شریف کو سمجھ میں آیا کہ یہ تو ایک ماں کا اپنے بیٹے سے قطع تعلقی کا اعلان تھا جو بالکل جائز بھی تھا۔ فیصل کی بے حسی پر تاسف ہوا مگر تعجب بالکل بھی نہیں۔ ابرک کی اعلاظرفی اور جلیل کی کم ظرفی، ثروت بیگم کی کشادہ دلی اور انصاف پسند شخصیت کہانی اور کرداروں کی نفسیات پر عنبرین کی مضبوط گرفت نے اس تحریر کو اور بھی متاثر کن بنا دیا۔

عقیلہ ہاشمی ''بوبے کی دلہنیا'' سجا کر لائیں نہ کوئی سیاست نہ کوئی سازش تمام کردار لاجواب تھے، ایک سنجیدہ مسئلے کو ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں پیش کرنے پر عقیلہ یقیناً ستائش کی حقدار ہیں۔ ایسی مزیدار تحریریں ہر ماہ ہونی چاہئیں۔ ''نزل کوٹ کی رعنا تراب'' نے افسردہ کر دیا مگر اس کا فیصلہ درست لگا کیونکہ یہ وہ صورت حال نہیں تھی جس میں صبح کے بھولے کا شام کو لوٹ آنا خوش گوار ہوتا یہاں عمر بھر کے خسارے کے ساتھ زندگی کی بھی شام تھی سو اس کا لوٹ جانا ہی بہتر تھا، کہانی کی جزیات سے جڑی منظر کشی اور انداز بیاں بڑا دلکش لگا۔

ایسہ عائش بہت اچھا لکھ رہی ہیں ''رونقیں رمضان کی'' دکھاتے ہوئے انہوں نے غیر محسوس انداز میں ایک بہترین نصیحت ہم تک پہنچائی یہاں تو ہر چینل پر ایسا کہرام مچا ہوا ہے کہ جیسے سارا سال ہم بھوکے رہے ہوں اور اب کھانا کھایا گیا ہو ہاہا۔ ''اجالا تیری یادوں کا'' اچھی تحریر تھی ریحانہ وقاص نے شمسہ کی عادت و خصائل بڑی خوبی سے بیان کیے۔ شازیہ الطاف نے زندگی کا ایک اور کڑوا سچ بیان کیا۔ اس نے واپسی کا فیصلہ کر کے سمجھ داری کا ثبوت دیا کہ والدین کے گھر میں رہتے ہوئے تو بچی کھچی خودداری اور عزت نفس بھی داؤ پر لگ جاتی تھی۔

گو ہمیں پنجابی کی سوجھ بوجھ بالکل نہیں لیکن انشا جی کی پنجابی نظم بڑی سہولت سے سمجھ میں بھی آئی اور بہت پسند بھی آئی۔ حمیرا شفیع سے ملاقات کا دوسرا حصہ بھی بہت خوب رہا، والدین کی بیماری کے بارے میں انہوں نے جب بتایا تو میرا بھی دل بھر آیا۔ بے شک اس انمول رشتے کا کوئی نعم البدل نہیں، ہر چیز وقت کی دھول میں دھندلا جاتی ہے سوائے اپنے پیاروں کی یاد کے، جو کبھی ... نہیں پڑتی کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ یادیں مزید گہری ہوتی جا رہی ہیں اتنی گہری کہ ان میں ڈوب کر پھر ابھرنے کا دل ہی نہیں چاہتا، کہیں سے وہ پیارے آ جائیں ان کی گود میں سر رکھ کر پرسکون نیند سو جائیں، دل میں چھپی محبت کے وہ سارے اظہار جو ہو نہ پائے وہ سارے اعتراف جو کر نہ پائے، وہ سب کر ڈالیں دل کی ساری باتیں جو ادھوری رہ گئیں وہ تمام تمنائیں آرزوئیں جو حسرت بن گئیں اب کبھی پوری نہ ہو سکیں گی۔ یہ سوچ کر

دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ بہرحال جب تک زندگی ہے جینی ہے۔ بات ہو رہی تھی حمیرا اشفیع سے ملاقات کی پچھلے ماہ بھی ان کی تحریر بہت اچھی لگی تھی اس ماہ نہیں لکھا انہوں نے جبکہ ہمیں انتظار تھا۔ عندلیب زہرہ بہت عرصے سے نہیں لکھ رہیں ان کی کوئی خیر خبر؟ اور کوئی ہماری پیاری فاخرہ جبیں کو بھی ہماری یاد دلا دے۔ نام تو بے شمار ہیں جنہیں ہم بہت مس کر رہے ہیں لیکن اگر لکھنے شروع کر دیے تو پھر صفحات کے صفحات اپنی پیاری رائٹرز کے ناموں سے تمام ہو جائیں گے۔

فوزان خان سے باتیں اچھی لگیں لیکن ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے ان کا کوئی ڈرامہ دیکھا ہے۔ فرحانہ مہناز کا باورچی خانہ اچھا لگا لیکن بہت مختصر تھا۔ موسم کے بھی پکوان لذیذ لگ رہے ہیں، بیاض کے تمام اشعار اچھے لگے ڈائری بہت بہت خوب صورت ہے۔ خصوصاً حمدہ خان اور صدف ناصر کا انتخاب لا جواب لگا۔ نفسیاتی الجھنیں میں دونوں بہنوں کے لیے دعا کی۔ ساتھ ہی عدنان بھیا کے لیے بھی دل سے دعا نکلی۔

بہنوں کی محفل کے تمام ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے ہیں ریحانہ چودھری نے ابتہال پر بڑا حقیقی تبصرہ کیا، پہلی قسط پر میرے بھی یہی محسوسات تھے لیکن ریحانہ۔ کے جیسا خوب صورت لفظوں کا ذخیرہ کہاں سے لاتے۔ صدف ناصر کا تبصرہ حسب معمول شان دار ہے صدف آپ کی کشادہ دلی کو سیلیوٹ ہے صدف اور ریحانہ آپ دونوں کا بہت شکریہ آپ کے الفاظ میرے لیے اعزاز ہیں اور آپی آپ کے الفاظ اور حوصلہ افزائی نے تو اس اعزاز پر پکی مہر لگا دی ہے جی۔ بہت شکریہ پیاری آپی۔

فرخندہ سلیم اس ماہ غیر حاضر ہیں اور عینا عمر رستہ بھول گئیں شاید۔ ثمن تحریم کے لیے دل سے دعائیں کیں اللہ ان کے حالات اچھے کر دے آمین۔ اللہ پاک سلمی مسرت کی فیملی کے مرحومین کی مغفرت اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ عروج یوسف اور ثانی رانی نے مالا کے اختتام کے بارے میں درست رائے دی۔ تمام بہنیں اب تک افسردہ ہیں آپی آپ کی تشفی بجا لیکن مالا اور پردیس کوئی دو ڈھائی صفحات کی کہانی تو تھی نہیں کہ ہم پڑھ کر نظر انداز کر دیتے (اور ہم تو وہ بھی نظر انداز نہیں کر پاتے) جیسا کہ رائٹرز نے قارئین کے جذبات نظر انداز کر دیے۔ بھئی ہم یہ زیادتی نہیں بھولیں گے دل تو کرتا ہے بینرز لے کر نکلیں جس پر جلی حروف میں نعرہ لکھا ہو ظالمو جواب دو ظلم کا حساب دو ہاہاہا۔

ج: پیاری ناہید! اف آپ کے خط کی زبان و بیاں۔ خوب صورت الفاظ زبردست پڑھ کر مزا آ جاتا ہے۔ پھر کہانی پر بالکل درست تجزیہ سونے پر سہاگہ ہے۔ جانے والے کے بارے میں آپ کے جذبات واحساسات سب یہی بتا رہے ہیں کہ آپ کو سنجیدگی سے کہانیاں لکھنے پر توجہ دینا چاہیے۔

فرحانہ مہناز......گوجرہ

اس چھوٹے سے شہر اور جوائنٹ فیملی میں زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے۔ اسلام آباد میں بچے اسکول اور میاں صاحب آفس تو میرے پاس وقت ہی وقت ہوتا۔ بہت سے افسانے لکھ کر بھیجے تب اور اب کافی عرصے سے خط بھی نہیں لکھ سکی۔ افسانہ لکھا پڑا ہے۔ وہ بس ساتھ لے آئی۔ ناہید اسمٰعیل میں نے اسی دن آپ کا پیغام آپی فاتحہ رابعہ کو سینڈ کر دیا تھا میں اگر آن لائن ڈائجسٹ میں نہ بھی ہوں تو بھی سب کا خیال ہوتا ہے 25 سال سے اس سے وابستہ ہوں۔ تلمبہ کی بہنیں مجھے یاد کرتی ہیں ان کا بے حد شکریہ۔ اب شمارے کی طرف حمیرا اشفیع جی پچھلی بار آپ کا انٹرویو افسانوں کی طرح دلچسپ تھا۔ ناہید جی نے کہا کہ آپ اور میں ہر ماہ ایسے افسانے میں مزاح والے لکھیں تو سوچا شاید ہمارے سائیڈ کی مٹی میں مزاح ہے۔

''کرن کرن روشنی'' میں صلوۃ التسبیح کی اہمیت بیان کی، بہت خوب صورت۔ میرے ابو جی اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلا مقام دے دادی جی کو فطرانہ پکڑ دیتے کہ محلے میں ضرورت مندوں کو دے دیں دادی جی کچھ محلے میں دے کر باقی پوتے پوتیوں میں بانٹ دیتیں (ہی ہی ہی) دو تین سال بعد ابو جی کو پتا چلا۔

''ابتہال'' اچھی اسٹوری ہے ابھی میرال کی کہانی کھلی نہیں، ظاہر ہے دوسری قسط میں تو نہیں کھول سکتے

جبکہ ہماری رائیٹر تو کافی قسطوں کے بعد کہانی کی ہیروئن کو کا ماضی کھولتی ہیں ''دلربا'' بہت ہی فضول لڑکی ہے جبکہ شاہزل نام سے ہی ہیرو لگتا ہے افسانے چاروں اچھے تھے ''نرل کوٹ کی رعنا تراب'' فلسفہ سے بھرپور ماضی کا افسانہ تھا۔ خاص کر ''اجالا تیری یادوں کا'' ریحانہ وقاص نے خوب لکھا۔ شمسہ کی طرح کی فطرت کچھ لڑکیوں میں ہوتی ہے جو چاہ کر بھی نہیں بدل سکتی۔ ''گونج'' سمیرا حمید کا لکھا دلفریب سا انداز کسے پسند نہیں۔ اس ناولٹ میں بہت کرب تھا، سمیرا لڑکیوں کو بہت دکھی دکھاتی ہیں۔ عینی میں صبر کی انتہا تھی۔ سنیعہ عمیر بہت اچھا لکھتی ہیں ان کے قلم کی روانی اور خوب صورتی بھاتی ہے۔ ''آپ کا باورچی خانہ'' ماشاء اللہ بہت خوب لکھا۔

ج: پیاری فرحانہ! آپ نے محفل میں شرکت کی خوشی ہوئی۔ پرچے میں مزاح کی کمی تو ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے پتا نہیں کیوں بیشتر مصنفین آج کل زندگی کے تلخ حقائق پر زیادہ لکھ رہی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ زندگی میں تلخیاں زیادہ ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندگی پھر بھی بہت خوب صورت ہے۔ اس کے خوشگوار پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔ تو پڑھنے والوں کو خوشی جیسی انمول دولت ملتی۔

عشاء مشا سسٹر...... رومی والا

''میں نے اور میری سسٹر نے ستمبر سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا ہے۔ ہم بھی سے (ستمبر سے) سے تمام خط لکھنے والی سسٹرز کے خط بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ نمرہ احمد کا ناول ''مالا'' اچھا تھا افسوس ہم اس کی دو قسط ہی پڑھ سکے آخری اور اس سے پہلے والی۔ سنیعہ عمیر کا ناول ''کر چلے جاں نثار ہم'' یہ ہم چوتھی قسط سے پڑھنے لگے ہیں اور اسی ناول کی وجہ سے ہم نے باقاعدگی سے ناول ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا ہے اب تو آخری قسط بھی پڑھ چکے ہیں۔ پیپی اینڈنگ اچھی لگی ویسے ہمیں ایک بات سمجھ میں نہیں آئی یہ افسانے، ناولٹ، ناول اور سلسلے وار ناول کیوں دیتے ہیں سلسلے وار ناول سے میرا مطلب لکھنے سے ایک رائٹر کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ پلیز آپ بتایئے گا ضرور اصل میں ہم ڈائجسٹ ناولز وغیرہ سے متعلق کچھ بھی نہیں جانتیں۔

''گوشی جمال کا خط پڑھنا ہمیں بہت اچھا لگتا ہے ناہید اسماعیل اور بھی بہت ساری سسٹرز ہیں۔ ساری سسٹرز یقین مانیں استاد ہیں۔ ''خیر ڈائجسٹ پڑھنا ہم نے ایک تو سنیعہ عمیر کے ناول کی وجہ سے اور دوسرا آپ سب سسٹرز کے ناموں کی وجہ سے کیا ہے۔ ''نام ایسے ہیں جسے ٹک ٹاک ویڈیو پر کمنٹ۔

ج: پیاری عشاء اور مشا! آپ بھی تو ہمارے اپنوں میں شامل ہیں۔ آپ کو اس محفل میں کیوں جگہ نہیں ملے گی۔ خواتین پڑھنے والی سب بہنیں ہماری اپنی ہی ہیں۔

سلسلے وار ناول مکمل، ناول، ناولٹ اگر طویل ہوں تو انہیں قسطوں کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے کیونکہ پورا ناول ایک ساتھ دیں گے تو ایک ہی تحریر شامل ہوگی۔ دوسری کوئی تحریر شامل نہیں ہوسکے گی۔

آپ کی دوست ہمیں اپنی کہانیاں ڈاک سے بھجوا دیں، ایڈریس لکھنا ضروری نہیں۔ اپنا نام ضرور لکھیں۔

فرزین چودھری...... خانیوال

گلابی گلابی سی ماڈل سیدھی دل میں اترتی محسوس ہوئی۔ ابھی جمعہ کو یعنی چھ کو شمارہ ہاتھ میں آیا اور ہم نے گیارہ بجے تک سارا پڑھ بھی ڈالا۔ شام کی چائے بنائی تو ایک ہاتھ میں چائے کا کپ اور دوسرے ہاتھ میں خواتین ٹھنڈی میٹھی شام واہ مزہ دوبالا ہوگیا۔ ''ہم تم سے'' عنبرین ابدال کے ناول میں اتنے گم ہوئے کہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ ہی بھول گیا۔ بابا کی آواز پر ہم نے ارد گرد نظر دوڑائی تو ہوش میں آئے کہ ہم نے تو ابھی تک چائے نہیں پی۔ بابا نے کہا چلو قبرستان چلتے ہیں فاتحہ کے لیے۔ ہم جمعے والے دن فاتحہ کے لیے جاتے ہیں۔

رات کو وہیں سے سلسلہ جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ واہ عنبرین جی نے تو دل جیت لیا۔ کردار جاندار، کہانی شاندار۔ بازی کدہ۔ واہ سنیعہ جی کیا خوب صورتی سے صبر، محبت، عزت کا پیغام دیا ہے۔ اگلی قسط کا بے صبری

سے انتظار ہے۔

بات ہو جائے ''ابتہال'' کی۔ جس نے پہلی ہی قسط سے اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ تیمور گردیزی شاید وہی ہے جو پہلی قسط میں تہہ خانے میں پایا جاتا ہے۔ اور مجھے تو یقین ہے یہ ہی ہیرو ہوگا۔ ''ابتہال'' پر تھوڑا غصہ آتا ہے ماں کے ساتھ کوئی ایسے کرتا ہے۔ ماں بھی وہ جو پہلے ہی دکھوں کی ماری ہو۔

ماں کی قدر کیا ہوتی ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔ میری ماں بھی پندرہ سال پہلے ہمیں یونہی چھوڑ گئی تھی۔ ان کے ایک غلط فیصلے کی وجہ سے نجانے کتنی زندگیاں خراب ہو گئیں۔ میں تب چھ سال کی تھی اور میرا بھائی پانچ سال کا۔

میری پھوپھو نے ہماری پرورش کی۔ ہماری خاطر انہوں نے شادی نہیں کی۔ میری پھوپھو بہت اچھی ہیں۔ میں نے انہیں ہی ماں کہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پھوپھو اچھی نہیں ہوتیں۔ مگر الحمد اللہ میری تینوں پھوپھیاں تو بہت اچھی ہیں۔ اللہ پاک میری پھوپھو کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔ آمین

لو جی میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ گونج سمیرا حمید اچھا سبق، اچھا انتخاب۔ خیر فوزان خان سے ملاقات اچھی ہی رہی۔ ویسے فوزان نام سمجھ میں نہیں آیا۔ نام تو میرے جیسا ہو، جو سمجھ میں بھی آئے (فرزین چودھری) (آہم آہم) حمیرا شفیع اچھی بہت ہی اچھی رائٹر ہیں۔ ان سے درخواست ہے کہ اب کوئی اچھا سا ناول بھی لکھ ہی ڈالیں۔ افسانے بہت پڑھ لیے ہم نے آپ کے۔ عینا آصف کا انٹرویو کریں پلیز۔ افسانے بھی اچھے تھے مگر تہنیت آفرین کا افسانہ بازی لے گیا۔ آسیہ رئیس خان کی کمی محسوس ہوئی شدت سے۔ کیونکہ جب وہ نہ ہوں تو رسالہ پھیکا پھیکا لگتا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ انڈیا سے ہونے کے باوجود اتنا اچھا لکھتی ہیں اور تینوں شماروں میں لکھتی ہیں۔ ایک انٹرویو ان کا بھی کریں۔ شاہین رشید تک ہماری خواہش پہنچا دیجیے۔ (آہم آہم)

اور کچھ کہانیاں اور افسانے لکھ رکھے ہیں۔ لکھنے کا طریقہ بتا دیں۔

ج: پیاری فرزین! شعاع کی محفل میں خوش آمدید ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔

صفحے کے ایک جانب لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ صفحے کا کچھ حصہ چھوڑ کر لکھیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ جس صفحے پر لکھیں۔ اس صفحے کی پشت پر نہ لکھیں۔ یعنی صفحہ پلٹ کر اس پر نہ لکھیں۔ اسے خالی چھوڑ دیں۔

سلمٰی مسرت......راولپنڈی

پچھلے ماہ خط جلدی لکھا کیونکہ رسالہ لیٹ ملا حالانکہ سعیدہ عمیر کے ناول پر تبصرہ فوراً بنتا تھا۔ بہرحال اس آخری قسط نے تو کمال کر دیا۔ بشار کا کردار بھی انمٹ لازوال کرداروں میں شامل ہو گیا ہے ہر قسط لاجواب تھی۔ آسیہ کا مکمل ناول بھی خوب صورت تھا۔

نئے سال کے شعاع خواتین دونوں کے ٹائٹل بہت خوب صورت آئے ہیں نظر نہ لگے۔

اس بار ڈریس لاجواب میرا فیورٹ کلر اور ویسا ہی خوب گلابی مسکراتا چہرہ۔

یکم مارچ کو ہماری سالگرہ ہے۔ میں سب سے کہتی ہوں کہ اگر میرا تبصرہ رسالے پر پڑھنا ہے تو صدف کا تبصرہ پڑھ لیا کریں۔ سیم میری وہی رائے ہوتی ہے دراصل میری گھر کی روٹین ایسی ہے کہ میں ایک دم نہیں آہستہ آہستہ پڑھتی ہوں، گھر سے نکلتے وقت اپنے پرس میں رسالے رکھنا نہیں بھولتی گاڑی میں پڑھتی ہوں۔ آج کل اسلام آباد کا موسم بے حد خوب صورت ہو رہا ہے۔

آج جلدی میں کہیں جانا تھا، چائے کا مگ اپنا رسالہ اٹھایا اور مرحا کو گود میں لیا میاں کے پہلے ہارن پر گاڑی میں موجود تھی الحمد اللہ بہت با مقصد زندگی رب نے عطا کی ہے۔

نیا ناول حسنہ حسین کا ہے۔ ان کا ''عسر یسرا'' بہت شاندار تھا دونوں قسطوں میں شاعری باکمال ہے مکمل ناولز پر تبصرہ ان شاء اللہ اگلے ماہ ہوگا۔

رضوانہ وقاص آپ کے لیے ان شاء اللہ رمضان کی بابرکت ساعتوں میں بھی دعا کروں گی، اللہ آپ کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔

ج: پیاری مسرت! جنم دن مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت منداور خوش خرم رکھے۔ اورآپ اسی خوش دلی کے ساتھ زندگی کی خوش گوار ذمہ داریاں نبھاتی رہیں۔ آمین

سلمٰی! آپ کا تبصرہ اب کیسے پڑھیں۔ اس بار صدف کا خط موصول ہی نہیں ہوا۔

اسلام آباد سے صائمہ علی نے لکھا ہے

رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ اسلام آباد کا موسم تو ابھی تک ٹھنڈا ہے سحری اور افطاری کے وقت ابھی بھی سوئیٹر پہننا پڑتا ہے۔ دوپہر میں بغیر سوئیٹر گزارہ ہو جاتا ہے۔

اب آتے ہیں فروری کے شمارے کی طرف سرورق پر ماڈل اچھی لگی مگر کاٹن کے کپڑوں کے ساتھ گلوبند اور ٹیکہ کچھ اوور لگ رہا تھا۔ کہانیوں میں سب سے خوب صورت تحریر "گونج" تھی۔ یقین کریں اگر اس تحریر کا لوگوں پر اثر ہو جائے تو یہ معاشرہ سنور جائے۔

سمیرا حمید نے اس تحریر سے بتادیا کہ اصل امتحان ایسی بہنوں یا بیٹیوں کے گھر والوں کا ہوتا ہے جو چاہے جنت کمالیں اور جو چاہے دنیا اور آخرت میں جہنم۔

عنبرین ابدال کا ناول "ہم تم سے" پڑھ کر مزا آیا۔ کہانی کی بنت خوب صورت تھی۔

واجبی شکل و صورت کے لڑکوں کی شادی بہت خوب صورت لڑکی سے ہو جائے تو وہ اکثر اپنی بیوی پر شک کرتے ہیں۔ "بازی کدہ" بھی اچھی تحریر ہے اب دیکھیں، اگلی قسط میں پتا چلے گا کہ کیا ہوتا ہے۔ غریب ہیرو اور امیر ہیروئن اور امیر بھی اتنی کہ خدا کی پناہ ویسے زندگی میں بہت امیر آدمی کی شادی مڈل کلاس میں ہو جاتی ہے مگر اتنے غریب گھرانے کے لڑکے کی شادی اتنی امیر لڑکی سے ہوتے نہیں دیکھی۔ چلیں دیکھتے ہیں آگے کیا ہوگا۔

"ابتہال" ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کہانی آگے بڑھے گی تو بات کریں گے۔ "بوبے کی دلہنیا" اور "اجالا تیری یادوں کا" دونوں تحاریر دلچسپ تھیں۔

ج: پیاری صائمہ! موسم تو کراچی کا بھی ایسا ہی ہے۔ کبھی گرمی کبھی سردی اب بہار کی آمد ہے۔ "ابتہال" بہت دلچسپ اور منفرد کہانی ہے۔ آپ اسے توجہ سے پڑھیں یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔

حسینہ یاسین مصباح..... کوٹ چھٹہ

جن کی کتابیں ہم راز ہوں تو انہیں کبھی بھی تنہائی پریشان نہیں کرتی اور میرا دل جب جب اداس ہوتا ہے، میں کتابوں میں سکون تلاشتی ہوں جب سے ہوش سنبھالا ہے رسالوں کو ہی اپنے ساتھ پایا ہے اور ان کے لیے کتنی مار کھائی ابو، امی سے یہ الگ کہانی ہے، اتنی سختی ہونے کے باوجود بھی رسالوں کا ساتھ نہیں چھوٹا کیونکہ ان سے لگاؤ ہی اتنا ہو گیا تھا کہ چھوڑنے کا سوچ کر بھی دل و جاں میں گہری اداسی چھا جاتی تھی۔ کئی دفعہ ابو نے جلائے، امی نے تو میرے سالوں کے جمع رسائل کو اکٹھے آگ کی نذر کر دیا لیکن میں نے نہ چھوڑے اور دیکھیے یہی مستقل مزاجی میرے کام آ گئی۔ امی نے چپ سادھ لی ہے اور ابو جان کے بھی انجان بنے رہتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ابھی تک ابو سے چھپ کر پڑھتے ہیں۔ امی نے شکایت لگائی بھی تو میری چھوٹی بہن رومیصہ نے رسالے اٹھا کے ابو کو دکھا دیا۔ (ہاں صفحہ حمد اور نعت والا ہی کھولا) یہ کہانی پھر کبھی سناؤں گی ابھی تو میں نے خط اپنی کہانیوں کا پوچھنے کے لیے لکھا ہے۔

ج: پیاری حسینہ! آپ کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی اس دور میں لوگ رسالوں کو برا سمجھتے ہیں۔ جبکہ میڈیا پر وہ کچھ بھی دکھایا جا رہا ہے جو نہیں دکھانا چاہیے۔ کم از کم یہ لوگ ایک بار پڑھ کر تو دیکھ لیں ان پرچوں میں کیا چھپ رہا ہے۔

آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔

☆☆

خامشی کو زباں ملے

ادارہ

میرا نام بریرہ حسن ہے، میری تعلیم میٹرک تک ہے میں نے چار سالہ عالمہ کا کورس بھی کیا ہے الحمدللہ میری تاریخ پیدائش یکم اگست ہے رسالے پڑھنا، ڈرامے دیکھنا، اپنے بہن بھائیوں سے اپنے بچپن کی باتیں سننا، اب میری تعلیم مکمل ہوئی ہے تو فراغت کے مزے لوٹ رہی ہوں اور ہاں مہمان نوازی بے حد پسند ہے۔

خوبیاں:

ہائے میں اپنی خوبیاں کیسے بتاؤں، چلیں کچھ بتا دیتی ہوں اپنے بڑے بھائی کے بقول میری یہ بہن بہت شریف ہے (آہم) میری کچھ دوستیں کہتی ہیں تم بہت ہنس مکھ ہو اور ایک خوبی کہ دل کو جلد صاف کر لیتی ہوں اور دوسروں کو معاف کر دیتی ہوں۔

مزاج تو میرا ٹھنڈا ہے لیکن بے تکی باتوں پر غصہ کس کو نہیں آتا، سب کو آتا ہے ناں؟ لہٰذا مجھے بھی آتا ہے کوئی بڑا ہی خلاف مزاج بات کرے تو برداشت نہیں ہوتی، ٹوک دیتی ہوں میری نظر میں یہ ایک خامی ہے۔

خواتین سے تعلق؟

خواتین سے تعلق زیادہ پرانا نہیں چند سال پہلے جب میں نویں کلاس میں تھی تو میری کزن (چچازاد) کے پاس خواتین تھا، اس نے کہا تم یہ رسالہ بھی پڑھا کرو پھر نہ پوچھیں ایک نہ ختم ہونے والا تعلق قائم ہو گیا۔

وہ تحریریں جو اب تک یاد ہیں؟

عمیرہ کی تحریر، دانہ پانی، موتیا مراد جو اپنوں کی ہی بے حسی سے مل نہ سکے، اتنگا پھول کھلیں گے کی ثانیہ کی بے وقوفیاں نہیں بھولیں گی ویسے دادی بھی نہ بھولنے والا کردار تھا اور بھی بہت سی تحریریں ہیں جو ذہن پر نہ مٹنے والے نقش چھوڑ گئی ہیں۔

کیا سالگرہ مناتی ہیں؟

نہیں نہیں سالگرہ نہیں مناتی، بس سب کو بتا دیتی ہوں کہ آج میری سالگرہ ہے، اگر یاد نہ ہو تو پیارے ابو یاد کروا دیتے ہیں ویسے میں سالگرہ منانا اچھا نہیں سمجھتی اگر کوئی کیک کھلا دے تو برا بھی نہیں سمجھتی ہاہاہا۔

اپنی زندگی کا کون سا دور بھول نہیں سکتی؟

مجھے اپنا بچپن کبھی نہیں بھولے گا، گرمی میں شہتوت کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں جھولا جھولنا، باغ میں جانا آم توڑ توڑ کے کھانا، پکڑن پکڑائی کھیلنا ٹیوب ویل پر نہانا، اسکول جانا واپسی پر بیٹھ کر چیز کھانا چھٹی کے دن موج مستیاں کرنا، یہ زیادہ پرانی بات نہیں صرف دس بارہ سال پہلے کی بات ہے لیکن غور کرنے کی بات اتنے سے عرصے میں ماحول کتنا بدل گیا۔

آپ کی پسندیدہ رائٹر؟

عمیرہ احمد، نمرہ احمد، راحت جبیں، عنبرین ابدال، عائشہ نصیر، مصباح نوشین، ام ہانی، مریم عزیز، نعیمہ ناز، سائرہ رضا، شازیہ اینڈ نازیہ جمال طارق نگہت سیما، زارا منجر ا، سمیرا حمید اور بہت سی رائٹر ہیں جو اچھا لکھتی ہیں۔

کس کہانی نے رلایا؟

ویسے میں جلدی رونے والوں میں سے نہیں اگر رونا آئے تو کنٹرول مشکل ہو جاتا ہے ویسے کسی کردار نے رلایا تو نہیں ہے دکھی کیا ہے لیکن میں نے ایک کہانی پڑھی ہے شام سے پہلے اس میں جو لڑکی کے ساتھ ہوا بہت برا ہوا، پہلے سوتیلے باپ کے چنگل سے نکلی تو جابر شوہر ملا جب بچہ پیدا ہوا تو باپ نے چوری سے شوہر کو اٹھا کے دے دیا اور بچہ کتنا چھ ماہ کا بس پھر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆

حسنیٰ حسین

ابتہال

شاہ زیب اور میرال کی بیٹی ابتہال جو اپنی دادی عصمت بیگم کے گھر پرورش پارہی ہے شاہ زیب اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ پردیس میں ہیں۔ میرال اور ابتہال نوکروں کی مانند زندگی گزار رہی ہیں۔

دل ربا اپنے نام کی طرح خوب صورت لیکن بدمزاج ہے، وہ اپنے شوہر شاہزل کو ناپسند کرتی ہے اسے اپنی ننھی سی بیٹی امل سے بھی کوئی لگاؤ نہیں وہ ہر صورت شاہزل سے طلاق اور اپنے سابقہ محبوب فیضان سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

عصمت بیگم ابتہال کی شادی کرنا چاہتی ہے، زندگی میں پہلی بار میرال ان کے حکم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے اسے گھر سے بھاگی ہوئی ماں کی بیٹی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

تیسری قسط

مرے بس میں ہو تو کبھی کہیں
کوئی شہر ایسا بساؤں میں
جہاں فاختاؤں کی پھڑپھڑاہٹ
ہے نغمہ زارِ حیات میں
جھنجھناتی سانسوں کی جھانجھریں چھنک اٹھیں
تو دھنک کے رنگوں میں بھیگ جائیں حواس تک!
جہاں چاند ماند نہ ہو کبھی

جہاں چاندنی کی ردا بنے
مری بانجھ دھرتی کے باسیوں کا لباس تک۔
جہاں صرف حکمِ یقیں چلے!
جہاں بے نشاں ہو قیاس تک!
جہاں آدمی کے نطق ولب پہ
نہ شہریار کا خوف ہو
جہاں سرسرائے نہ آدمی کی رگوں میں کوئی ہراس تک
جہاں واہمہ ہو نہ دلوں میں واہمہ کا سہم ہو
جہاں ''سچ'' کو ''سچ'' سے ہو واسطہ
جہاں جگنوؤں کو ہوا دکھاتی ہو راستہ
جہاں خوشبوؤں سے بدلتی رُت کو حسد نہ ہو!
جہاں پستیوں سے بلندیوں کو بھی قد نہ ہو۔
جہاں خواب آنکھوں میں جگمگائیں تو
جسم و جاں کے سبھی دریچوں میں تیرگی کا گزر نہ ہو
کوئی رات ایسی بسر نہ ہو کہ بشر کو اپنی خبر نہ ہو
جہاں داغ داغ سحر نہ ہو
جہاں کشتیاں ہوں رواں دواں

تو سمندروں میں بھنور نہ ہو
جہاں برگ وبار سے اجنبی
کوئی شاخ کوئی شجر نہ ہو
جہاں چہچہاتے ہوئے پرندوں
کو بارشوں کے عذاب کا ڈر نہ ہو۔

☆☆☆

وہ آئلہ حدید تھی۔
اسلام آباد کے شفا کالج آف میڈیسن میں ایم بی بی ایس کے تیسرے سال کی طالبہ۔
مضبوط، نڈر، زندگی کے ہر موڑ، ہر آزمائش اور سختی پر شکست تسلیم نہ کرنے والی...... اس کے تایا رفیق عثمان نے ہمیشہ اسے ہمت اور بہادری سکھائی تھی، زندگی کے گر پڑھائے تھے، کامیابیوں کے راز بتائے تھے۔
وہ کوئی خواہش کرتی تو رفیق جھٹ سے پوری کر دیتے۔ کوئی خواب دیکھتی وہ تعبیر بن جاتے، دشوار راہوں کو اس کے لیے ہموار کر دیتے۔
"میں ایک دن آپ کا ہر احسان چکاؤں گی ابو۔" وہ خوش ہو کر کہہ دیتی۔ وہ خوش ہو کر سن نہ پاتے۔ اکثر خفا ہو جاتے، ڈانٹ بھی پلا دیتے۔ کہ یہ ان کا فرض ہے، "احسان" نہیں......
مگر ناصرہ تائی کے خیالات ان سے مختلف ہوتے، سوچ جداگانہ...... وہ اکثر تلخ ہو جاتیں۔
"یہ جو اتنا پیسا آپ اس لڑکی پر لگا رہے ہیں، دیکھیے گا ایک دن یہ بھی آپ کے بھائی کی طرح آپ کو اکیلا کر جائے گی۔" ناصرہ تائی کو اکثر ان کی فیاضی پر غصہ آ جاتا۔
"جو میں کر رہا ہوں وہ نیکی ہے ناصرہ، کس نے کہا مجھے اس بچی سے کچھ چاہیے!" ان کا لہجہ نرم، ان کی آنکھوں میں ٹھنڈک رہتی۔ قطعاً برا مانے بنا وہ محبت سے جواب دے کر بحث وہیں ختم کر دیتے۔ اسے دیکھتے اور مسکرا دیتے، آنکھوں سے اشارہ کر کے سمجھا بھی دیتے کہ تائی ہے، بڑی ہے، ایسا ویسا بول دیتی ہے برا نہ مانو...... اور وہ اثبات میں سر کو جنبش دے دیتی اور برا نہ مانتی۔
بھلا تائی ایسا سوچتی بھی کیسے ہیں کہ وہ رفیق عثمان کو چھوڑ دے گی؟ حدید کی اولاد کیا حدید سے مختلف نہیں ہو سکتی؟ اس کے فیصلے اپنے باپ سے الگ نہیں ہو سکتے۔
ناصرہ کی ہر بات دل کو آزار کر دیتی۔ وہ آنے والوں وقتوں میں بے حسی اور خود غرضی کا کچھ ایسا نقشہ کھینچتیں کہ اس کا دل بند ہو جاتا۔
"وقت ثابت کرے گا میں کتنی مختلف ہوں۔" وہ اکثر سوچتی، اکثر کہہ بھی دیتی، ناصرہ ہنس پڑتیں۔ "شروع میں سب یہی بولتے ہیں، مجھے دیکھو...... کپڑے سلائی کر کر کے اپنے بہن بھائیوں کو تعلیم دلوائی تھی، رکھتا ہے کوئی میری خبر؟ کوئی ملنے آتا ہے مجھ سے؟" تلخی سے مسکرا کر پھر وہ اسے دیکھتیں۔ "یہ سب باتیں ہیں، کوئی کسی کے لیے نہیں رکتا، جو رک جاتے ہیں وہ مٹ جاتے ہیں، جیسے میں...... جیسے تمہارے تایا!"
جیسی وہ۔
جیسے تایا!
رفیق منزل کے اس تاریک کمرے میں آئلہ حدید کی سسکیاں دب گئی تھیں۔ ماضی کا شور حال پر حاوی ہونے لگا۔
اپنے مستقبل کا جو خاکہ اس نے کھینچ رکھا تھا، اس کی لکیریں اب ٹیڑھی ہو رہی تھیں، جو خواب اس نے دن کے اجالے میں دیکھے تھے وہ شب کی تاریکی میں "قابوس" (ڈراؤنے خواب) بن رہے تھے، جو خواہشات

نجاح (کامیاب) زندگی سے جڑی تھیں، وہ آج ناکامی کا روپ بن رہی تھیں۔
''جو رک جائیں، وہ مٹ جاتے ہیں، جیسے میں...... جیسے تمہارے تایا!''
چارپائی پر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے اس کا جسم اکڑ چکا تھا، موبائل ہاتھوں میں تھامے وہ سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ سامنے دیکھ رہی تھی، اس نے اتنا رو لیا تھا کہ آنکھیں گویا اب خالی ہو چکی تھیں۔ وہ اتنی حساس کبھی نہیں ہوئی تھی، زندگی کے معاملات میں اتنی کمزور بھی کبھی نہیں پڑی تھی۔
فیصلے جلد بازی میں اس نے کبھی نہیں کیے تھے مگر کرنے میں وقت ہمیشہ وہ بہت کم ہی لیتی تھی، آج پہلی بار ایسا ہوا تھا دو گھنٹوں کی سوچ و بچار کے بعد بھی وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی تھی۔
جال گہرا اور مضبوط تھا جو اس کے اطراف میں بچھایا گیا تھا۔ مسز ظہیر کی محنت چھ سالوں پر مشتمل تھی۔ ایک پورا سینیاریو ترتیب دینے میں انہیں کافی وقت لگا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھیں۔
وہ جان گئی تھیں ان کا انتخاب صرف وہ ہی کیوں تھی، کیوں ان کا ہر منصوبہ اس کے وجود کے بنا نامکمل تھا، کیوں انہیں اپنی تحریر کے عنوان پر اس کا نام ہی درکار تھا۔
اس نے اپنا سر ہاتھوں میں دبا کر آنکھیں بند کر لی تھیں، گہری سانسیں لیتی وہ اپنے ذہن کو ہر جانب دوڑانے لگی تھی۔
کوئی راستہ۔ کوئی حل...... کوئی ایسا سرا جسے پکڑ کر وہ پاتال میں اترنے سے بچ جائے۔ اشرافیہ کی جنگ میں ہتھیار نہ بن پائے؟ کوئی اسے استعمال نہ کر سکے؟ اس کا استحصال نہ کر سکے؟
مگر ذہن میں تاریکیوں کا سمندر تھا، وحشتوں کی لہریں تھیں، اور گہرائیوں میں سوائے شکست خوردہ جذبات کے اور کوئی شے نہ تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ خود کو اتنا بے بس محسوس کر رہی تھی۔
''خدا کے لیے آئلہ...... میری بچیوں کے لیے......''
''یہ کڑوا گھونٹ پی لو آئلہ۔''
ایک جانب ناصرہ تائی کا چہرہ تھا، دوسری جانب مسز ظہیر کا سراپا تھا، وہ سراپا جو روشنیوں میں سیاہی بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔
''ہماری ہر جنگ کامیاب ونا کام تم لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔''
اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کر ڈالیں، چہرے کے اطراف میں بکھری لٹوں کو سمیٹ کر کانوں کے پیچھے کر دیا۔ اپنے تایا کو یاد کرتے، ان کی قربانیوں کو سوچتے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔
بہت سخت زندگی گزاری تھی انہوں نے...... بہت آزمائشوں سے گزر کر وہ اب جینے کے قابل ہوئے تھے، ان کی تکلیف بڑی تھی، ان کے درد بڑے تھے، ایسے میں اس صدمے نے انہیں مکمل توڑ کر رکھ دیا تھا، وہ چور نہیں تھے، مگر اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر پا رہے تھے...... مسز ظہیر کی موجودگی میں کچھ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔
اس لمحے مسز ظہیر کو سوچتے اسے اپنے اندر شدید غصے کا ابال اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اس کی سبز — آنکھوں میں شعلوں کی لپک آٹھہری تھی۔
اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا گل دان اٹھا کر دیوار پر دے مارا، پھر چیخ اٹھی تھی۔
اس سے بھی اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ سرد نہیں پڑ سکی تھی۔ اس کے اعصاب متحمل نہیں ہو سکے تھے، دل کے زخموں پر کوئی مرہم نہیں لگ سکا تھا۔
''مجھے تمہاری زندگی چاہیے!''
اسے فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لگا مگر اس نے کر لیا، دل پر بھاری پتھر رکھے اس نے مسز ظہیر کے نمبر پر میسج کر دیا، توقع کے عین مطابق کچھ ہی دیر میں جواب موصول ہو گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک موبائل اسکرین پر ابھرتے اس جملے پر نگاہ جمائے رہی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھی۔ اپنے تاثرات میں ایک سرد پن لیے اس نے نہا دھو کر کپڑے

بدلے۔ اپنے ہینڈ بیگ میں ضرورت کی چند اشیاء اور ایک سوٹ رکھا، چند کارڈز، اور اپنے ڈاکومنٹس سنبھالے۔
اپنے لمبے سیاہ بالوں کو جوڑے میں مقید کیے سر پر دوپٹہ لیتی وہ کمرے سے باہر آ گئی تھی۔
سامنے ہی راہداری کے اس جانب ڈرائنگ روم تھا جس کے وسط میں ناصرہ تائی جائے نماز پر سجدہ ریز دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی سسکیوں کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ ہاتھ اٹھائے اب وہ گڑگڑا کر اس مصیبت کے ٹل جانے کی دعا کر رہی تھیں جو ان کی زندگیوں میں آ کر ٹھہر گئی تھی۔ ان کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کی تاریکی میں انہیں اپنی پوری زندگی اندھیرا لگ رہی تھی۔
سلام پھیر کر انہوں نے ہاتھ اٹھائے۔ کچھ دیر تک دعا کرتی رہیں۔ پھر عقب میں آئلہ کی موجودگی کا احساس کر کے انہوں نے بے اختیار گردن گھمائی۔
سفید رنگ کے سادہ شلوار سوٹ میں ملبوس، سیاہ رنگ کا لمبا سویٹر زیب تن کیے، دوپٹہ سر پر لیے وہ سرخ چہرے کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سبز آنکھوں میں سرخی ٹھہری تھی۔ بھرے بھرے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے، تاثرات میں ایک خاموشی ٹھہری تھی۔
اسے تیار دیکھ کر وہ تسبیح ہاتھ میں پکڑے اپنی جگہ سے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ننگے پاؤں فرش پر چلتی وہ اس کے پاس آ گئی تھیں، آنکھوں میں بے یقینی تھی اور شدت سے دھڑکتا دل کسی اچھی خبر کا متمنی تھا۔
ان کے گھر کے بیرونی گیٹ کے اس پار ایک سیاہ گاڑی آ رکی تھی، اگلی نشست پر یونیفارم میں ملبوس ڈرائیور بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر ریشم براجمان تھی۔
''میں جا رہی ہوں!''
ناصرہ کی پھٹی پھٹی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔
''چھوڑ کر جا رہی ہو ہمیں؟ اپنی جان بچا رہی ہو تم بھی؟'' آنسو ان کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرے، جسم لرزا، آواز کپکپائی۔
''اپنی جان داؤ پر لگا رہی ہوں!'' الفاظ اس کے حلق سے ٹوٹ کر نکلے تھے، وحشتیں اس کے آس پاس منڈلانے لگی تھیں۔
''ابو جب جیل سے باہر آئیں۔'' تمام تر قوت اور مضبوطی کے باوجود اس کی آواز رندھ گئی، خشک لبوں کو تر کر کے، کچھ ہمت پکڑتے، اس نے سر اٹھایا۔ ''ان سے کہیے گا ان کا بھائی مجھے لے گیا ہے!''
ناصرہ تائی پر ایک لمحے کے لیے سکتہ طاری ہوا، دم سادھے وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔
کیا فیصلہ ہو گیا؟ مصیبتیں ٹل گئیں؟ آسانیاں ہو گئیں؟ اتنی جلد؟ اتنی آسانی سے...... سجدے میں مانگی گئی دعا میں اتنی طاقت...... آنکھوں سے گرتے آنسوؤں میں اتنی تاثیر...... پکار میں اتنی کشش۔ ان کی صدا یقیناً عرش تک گئی ہے، ان کے لیے حل فوری اتارا گیا ہے۔
''اور اور رفیق...... اسے کب تک چھوڑیں گے وہ لوگ؟ کب تک وہ گھر آ جائیں گے؟'' ناصرہ کو ابھی بھی صرف رفیق کی فکر تھی۔
''کل صبح تک آ جائیں گے۔''
سکھ بھری سانس لیتے انہوں نے بے اختیار اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے تھے، پھر وہ جائے نماز پر سجدہ شکر میں گر گئی تھیں۔
ان کی اللہ نے سن لی تھی۔
آئلہ حدید کی نگاہیں ان کے سجدے پر ٹک گئیں، سماعت ان کی آواز پر، توجہ ان کی پکار پر ٹھہر گئی۔
انہوں نے ایک پل کے لیے بھی اس کی جانب نہیں دیکھا۔ اس کا چہرہ نہیں دیکھا، درد نہیں دیکھا۔ وہ

الوداع کہنے کو اس کے پاس بھی نہ آئیں۔
وہ خاموشی سے گیٹ کی جانب بڑھ گئی تھی، دروازہ کھولے وہ تاریک رات کے آخری پہروں میں گھر سے نکلی تو اس کے عقب میں ناصرہ نے ایک بار پھر سجدہ کیا تھا۔
سیاہ کار کی کھڑکیوں سے ریشم اسے دیکھتی نظر آئی، اس کے تاثرات انتہائی سنجیدہ تھے۔ڈرائیور نے فوراً اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تھا، اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے اس نے قدم بڑھا دیے تھے، وہ گاڑی میں سوار ہوئی تو لگا موت کے اڑن کھٹولے پر سوار ہو رہی ہے۔
گاڑی تاریک راستے سے آگے کو نکلی تو رفیق منزل کے درودیوار پر سجے اس کی زندگی کے تمام رنگ سیاہ پڑ گئے۔
کتابیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں، تعلیمی اسناد پر آگ بھر گئی۔
ناصرہ سجدے سے اٹھ کر اس کے کمرے میں آگئیں۔الماری کھولے اب وہ اس کے کپڑے نکال رہی تھیں، رفیق کے آنے سے پہلے پہلے انہیں آئلہ کا سامان وہاں سے ہٹانا تھا تاکہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں آئلہ کے حوالے سے کوئی شک نہ ہو۔وہ یقین کریں کہ آئلہ اپنے والد کے ساتھ جا چکی ہے۔
کمرے سے باہر شب کی سیاہی میں کئی راز پوشیدہ رہ گئے تھے۔کئی جھوٹ سچ، اور کئی سچ جھوٹ بن چکے تھے۔
گاڑی اپنے سفر رواں رہی تھی۔
آئلہ حدید نے رفیق کے لیے اپنی ذات کی قربانی دے ڈالی تھی۔

☆☆☆

قصر جلال کی زمینی گہرائیوں میں بند کمرے کی تاریکیوں میں یکا یک ایک بلب روشن ہوا تھا، متحرک سلاخوں کی آواز پر اس نے میز پر سے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تھا۔
قدموں کی ایک چاپ سلاخوں کے اس پار ٹھہر گئی تھی اور ایک اس کے پاس آ کر تھم گئی تھی۔
"مالک آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"
مالک کے ذکر پر ہی نوجوان کی آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی تھی۔سلاخوں کے اس پار کھڑا لڑکا ہاتھوں میں لالٹین تھامے اس پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا، اس کے چہرے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔
سامنے دیوار پر لگی اسکرین روشن ہو گئی۔ویڈیو کال پر کوئی تھا، اس نے لب بھینچ کر اس چہرے کو دیکھا۔
آفس کرسی پر براجمان وہ شخص دائیں بائیں جھولتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔
بال سلیقے سے جمے ہوئے، داڑھی تراشیدہ سی، سرخ و سپید رنگت، چہرے کے خدوخال میں کشش، لبوں پر مسکراہٹ لیے۔
"سنا ہے تم نے فرار کی کوشش کی تھی!"
"اسی ڈر سے نہیں آئے تم۔" وہ بولا تو لہجے میں غراہٹ تھی۔اس کا بس نہیں چلتا تھا اس شخص کو اسکرین سے باہر نکال کر فرش پر پٹخ دے۔
"ڈر تو اس وقت تم رہے ہو، ایسے نیند میں خوف سے اٹھ کر بھاگے جا رہے تھے۔کسے ڈھونڈ رہے تھے۔؟"
"تمہاری موت کو۔"
اس شخص کی ہنسی بے ساختہ تھی۔"میری موت جلال پیلس میں کیا کر رہی ہے؟"
"تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" اس کی آنکھیں خون سے سرخ ہونے لگیں۔
"جان کر خوشی ہوئی۔" وہ مسکرایا۔" کتنا اچھا ہو اگر ہم دوستوں کی طرح بات کریں۔"
"دشمنی نبھا کر دوستی کی بات کرتے ہو۔"
"دشمنی؟ تم اسے دشمنی کہتے ہو؟" وہ اس کے جواب سے محظوظ ہوا تھا۔" سوچو اگر میری دشمنی ایسی ہے تو

میری محبت کیسی ہوگی ہاشم؟"
"کتنی بار بتاؤں میرا نام ہاشم نہیں ہے!" وہ آنکھوں میں نفرت لیے اسے بھاری سانسوں کے ساتھ دیکھتا رہا۔
"ہاشم نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ بتاؤ؟"
وہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔
"تمہیں تو اپنے نام پر یقین نہیں ہے، میرے لفظوں پر کیا ہوگا!" ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ آفس چیئر کے ساتھ پشت لگاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔
ارباز اس کے پیچھے اپنی پشت پر ہاتھ باندھے سیدھا کھڑا تھا، اس کے عقب میں سلاخوں کے اس پار کھڑے شیر دل نے گہری سانس بھر کر سارنگ کو دیکھا جو اسٹپس پر بیٹھا تھا۔
اندر کیا بات ہو رہی تھی اس کی آواز باہر نہیں آرہی تھی۔
"چھوٹے مالک کوئی غنڈے ونڈے ہیں کیا؟" اس نے گردن موڑ کر سارنگ سے پوچھا۔
سارنگ اپنی گردن پیچھے کو جھکائے پتھریلی چھت کو دیکھ رہا تھا، اس کا سوال سن کر نفی میں گردن ہلائی۔
"مگر انہیں دیکھ کر تو ایسے لگتا ہے جیسے......"
"جیسے وہ کسی جہنم سے نکلا ہو؟" جملہ سارنگ نے مکمل کیا۔ شیر دل چپ ہو گیا۔
"بڑے مالک سے انہیں اتنی نفرت کیوں ہے؟" وہ اس راز میں نیا شامل ہوا تھا، اسے کسی بات کا علم نہ تھا۔
"تمہارے چھوٹے مالک کی یادداشت نہیں ہے اس لیے......"
سارنگ کے عقب میں اوپر اندھیرے میں گم ہوتی سیڑھیوں پر ایک سراپا ابھرا تھا۔ جس کا نہ کوئی سایا تھا، نہ کوئی آہٹ تھی۔
"یادداشت نہیں ہے؟" شیر دل حیرت زدہ سا سارنگ کو دیکھنے لگا۔ "انہیں جب کچھ یاد نہیں ہے تو وہ بڑے مالک سے اتنی نفرت......"
"تمہیں اگر کوئی اس طرح قید کر دے تو کیا تمہیں اس سے محبت ہوگی؟"
شیر دل کا دل بے اختیار نفی میں ہلا۔ "اس کا مطلب ہے بڑے مالک غلط کر رہے ہیں؟"
"وہ صحیح کر رہے ہیں یا غلط......اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں شیرو۔"
شیر دل چپ ہو گیا۔ اس کا ذہن اب الجھنوں کا شکار ہو رہا تھا۔
"اگر چھوٹے صاحب کی یادداشت واپس آگئی تو کیا سب ٹھیک ہو جائے گا؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔
"ہاہا......تمہارے چھوٹے صاحب اس سے زیادہ نفرت کریں گے تمہارے مالک سے......بلکہ جان پر آجائیں گے!"
"کیا ایسی دشمنی ہے؟"
"بڑی پرانی دشمنی ہے!"
سیڑھیوں پر کھڑا ہیولا تاریکی سے زرکار روشنی میں آگیا، نازک ننگے پاؤں پتھریلی سیڑھیوں پر پڑنے لگے، داہنا ہاتھ دیوار پر متحرک ہوا۔
ٹپ ٹپ گرتی پانی کی بوندوں میں سارنگ نے یکا یک روانی محسوس کی۔ شیر دل کو مزید نہ بولنے کا اشارہ کرتے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ کان کے پاس داہنا ہاتھ لے آکر اس نے سننے کی کوشش کی۔
"کیا تم سن پا رہے ہو؟" اس نے شیر دل سے پوچھا۔
"کیا؟"
"پانی کی آواز!"
"یہاں تو ایسی کوئی آواز نہیں ہے!"

''ہے..... پہلے کم تھی، اب زیادہ ہے!'' نسوانی وجود اس کے عین عقب میں آن کھڑا ہوا۔ ست رنگا مفلر آج بھی ہاتھ میں بھیگا ہوا تھا۔
سارنگ نے گردن گھما کر اوپر جاتی سیڑھیوں کو تاریکی تک دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔
''میرا وہم..... میرا خیال!'' اس نے گہری سانس بھر کر اپنی لالٹین اٹھالی۔
عین اسی لمحے سلاخیں سلائڈ کر گئی تھیں۔ ارباز باہر آچکا تھا۔ اس نے زجاجی دروازہ اپنے عقب میں بند کر دیا۔
سارنگ نے ایک اچٹتی نگاہ ارباز پر ڈالی۔
''سمجھ نہیں پارہا بڑے مالک نے شیر دل کو یہاں آنے کی اجازت کیوں دی ہے؟''
''یہ ہمارا سوال نہیں ہے سارنگ!'' ارباز نے اسے ٹوکا۔
شیر دل نے دونوں کی شکل دیکھی۔ خشک لبوں کو تر کرتے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ تینوں اوپری دروازہ کھول کر جاچکے تھے۔
سیڑھیوں پر وہ لڑکی ابھی بھی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ست رنگے مفلر سے پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگی تھیں۔ وہ نیچے نقرئی روشنیوں میں نظر آتے شیشے کو دیکھ رہی تھی جس کے اس پار دیوار کی اوٹ لیے، سلاخوں کے حصار میں وہ نوجوان اپنا سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔
''یتیم نہیں ہوں میں۔ نہیں ہوں یتیم!'' میز پر رکھا شیشے کا گلدان اس نے سلائڈ پر دے مارا تھا۔
''میں جانتا ہوں تم مجھے سن رہے ہو، تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔ کبھی نہیں آؤں گا!''
اس نے پھر کرسی اٹھا کر فرش پر پٹخ دی تھی۔
سیڑھیوں پر کھڑی وہ لڑکی الٹے پاؤں واپس پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

ظہیر ہاؤس/اسلام آباد:
ریشم کے ہمراہ وہ ظہیر ہاؤس میں داخل ہوئی تو اس وقت رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ گھر کی تمام روشنیاں ہنوز مدھم، اور سناٹے گہرے ہو رہے تھے۔
مسز ظہیر لاؤنج میں اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں، قدموں کی آہٹ پر انہوں نے سر اٹھایا، پھر اسے دیکھ کر مسکرائیں۔
''تم نے کہا تھا، واپس تم مر کر ہی آسکتی ہو، بتاؤ..... مر کر آئی ہو یا زندہ ہو ابھی بھی؟''
''یہ تو وقت بتائے گا میں آپ کے پاس زندہ ہو کر آئی ہوں یا مردہ بن کے.....''
مسز ظہیر کو اس کے جواب نے کافی محظوظ کر دیا، وہ بے اختیار ہنس دیں۔
''کافی غصے میں لگ رہی ہو!''
''صرف غصہ نہیں۔'' اس کے لب ہلے۔ آواز مضبوط۔ ''مجھے آپ سے شدید نفرت بھی ہو رہی ہے!''
''مجھ سے نفرت؟'' انہوں نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔
''اپنی اس اولاد کے لیے جو اس دنیا میں نہیں ہے، آپ کسی اور کی اولاد کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔''
''آئی بلیو تمہارے پیرنٹس مجھ سے پہلے ہی تمہیں اس خطرے میں ڈال چکے ہیں۔''
''میرے پیرنٹس میری زندگی میں نہیں ہیں، آپ انہیں میرے معاملات میں کبھی مت لائیں!''

''لانا ضروری ہے تاکہ تم اپنی پوزیشن اور پوزیشن کو اچھے سے سمجھ سکو! اگر تایا جیل میں رہا تو پھر تم کیا کرو گی؟ پڑھائی مکمل کر پاؤ گی؟ یا تمہاری تائی ناصرہ وہ اس کے بغیر زندگی گزار پائے گی؟''

''یہ میرے سوال کا جواب ہرگز نہیں ہے۔''

''جواب تو ہے، چاہے کسی بھی سوال کا ہو۔''

میں کوئی ہتھیار نہیں ہوں جسے آپ اپنی مرضی سے استعمال کریں۔''

''میرے لیے تو ہو۔''

آنکھوں میں سختی لیے وہ دم سادھے انہیں دیکھتی رہی۔

''میں تمہیں ایک نئی زندگی، ایک نئی پہچان دے رہی ہو ڈیئر! اس ایک کام کے بدلے جو تم میرے لیے کرو گی۔''

آئلہ نے لب بھینچ کر اپنا غصہ دبا لیا تھا۔

''اس کام کے بعد...... آپ میں اور قاتل میں کیا فرق رہ جائے گا؟''

''وہ قتل ظلم...... یہ قتل انصاف۔'' ان کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔

''تمہیں میں ہی غلط لگ رہی ہوں گی، کیونکہ تم نے اپنی اولاد کے ٹکڑے نہیں دیکھے، اس کی مسخ شدہ لاش کو نہیں چھوا تم نے...... تمہیں کسی نے اس کی تشدد زدہ تصویریں بھی نہیں بھیجیں۔'' ان کی سیاہ آنکھوں میں وحشتیں اتر آئی تھیں، ان کے چہرے کے تاثرات میں غم شدت نظر آنے لگی تھی، ان کی آواز میں درد کی سختی آئلہ حدید کے رونگٹے کھڑے کر گئی تھی۔

مسز ظہیر پہلی بار اسے ایک مشتعل ماں کے طور نظر پر آئی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک انہی تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتی رہیں، پھر گہری سانس بھر کر اپنا رخ بدل گئیں، گھنگریالے بالوں میں انگلیاں چلاتے وہ یہاں وہاں دیکھتے گہری سانس لیتی رہیں۔ پھر اپنے اعصاب پر قابو پا کر اس کی طرف پہلے جیسے تاثرات کے ساتھ مڑیں، اور مسکرا دیں۔

''آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں!'' خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے وہ صوفے پر جا بیٹھیں۔

''جب تک میرے تایا جیل سے باہر نہیں آ جاتے، کوئی بات نہیں ہو گی!'' اس کا ارادہ واضح اور لہجہ حتمی تھا۔

''مجھے تمہارا جواب اچھا لگا۔'' انہوں نے مسکرا کر اپنا موبائل اٹھا لیا۔ خالص انگلش میں انہوں نے دوسری طرف کسی سے بات کی، ''یہ کام جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔'' حکم دے کر انہوں نے کال کاٹ دی تھی، پھر انہوں نے ایک بار پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ اپنے بیگ کی اسٹرپس پر گرفت جمائے وہ سنگل صوفے پر ان کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

''کھانے کا انتظام کرو ریشم...... اس صدمے میں بے چاری نے کہاں کچھ کھایا ہو گا۔''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ سخت لہجے میں گویا ہوئی۔

''ٹھیک ہے، سو جاؤ، آرام کر لو کچھ دیر کے لیے ریشم گیسٹ روم میں لے جاؤ اسے۔''

''جب تک تایا جیل سے باہر نہیں آ جاتے میں یہاں سے نہیں اٹھوں گی۔''

مسز ظہیر کے تاثرات میں سنجیدگی آ گئی۔ آئلہ حدید ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی۔

''تمہیں مجھ پر ابھی بھی بھروسہ نہیں ہے؟''

''بھروسہ تو ابو کو بھی آپ پر بہت تھا۔''

مسز ظہیر مسکرا کر رہ گئیں۔

''ٹھیک ہے، تم یہاں بیٹھ کر انتظار کر سکتی ہو۔'' انتہائی سنجیدگی سے کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں ''رفیق کی آزادی تمہاری قید ہے آئلہ، یاد رکھنا! جب تک تم میرا کام نہیں کر دیتیں، تب تک اپنے تایا کو خطرے سے باہر مت سمجھنا، میں یہ سارا کھیل دوبارہ بھی رچا سکتی ہوں، میں اپنا ٹارگٹ اگلی بار رفیق کے بجائے، فہد، عائشہ کو بھی بنا سکتی ہوں۔''

ایک ادا سے سیڑھیاں چڑھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

ریشم محض چند لمحوں کے لیے وہاں رکی تھی پھر وہ بھی وہاں سے چلی گئی تھی۔

اس کی اٹکی ہوئی سانسیں اس ایک لمحے میں بحال ہوئیں، سنجیدہ تاثرات میں یکا یک وحشت اتر آئی۔

قتل اور زوہ؟ اندر سے وہ ریزہ ریزہ ہونے لگی۔

کیسے؟ آخر کیسے؟ اس نے بے بسی سے اپنا سر ہتھیلیوں پر گرا لیا تھا۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ ابتہال کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے کی نیم تاریکی میں آتش دان کے سامنے ہی جائے نماز بچھائے میرال سجدہ ریز تھی۔ کروٹ بدل کر اپنا سر تکیے پر رکھے وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

سجدہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا، اور جب وہ اٹھ کر بیٹھی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''جو لڑکیوں کو کپڑوں کی طرح بدلتا ہے، اس نے تمہیں بدلنے کے لیے کیا لیا؟'' کچھ اذیت سے آنکھیں میچ کر اس نے دوبارہ سجدہ کیا تھا۔

ابتہال اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ کافی دیر تک اسے دیکھتی رہی، یہاں تک کہ میرال اپنی تہجد کی نماز سے فارغ ہو گئی۔

یہ روٹین وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی۔ ایسی کوئی رات میرال کی زندگی میں نہیں آئی تھی جس کے آخری پہر اس نے نفل نہ پڑھے ہوں یا دعا نہ کی ہو۔

جائے نماز سمیٹتے اس کی نگاہ میرال پر پڑی تو لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ آ گئی۔

''جاگ گئی ہو تو نفل پڑھ لو، دعا کر لو!''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''اللہ راضی ہوگا، پریشانیاں دور ہوں گی۔''

''آپ تو کئی سالوں سے پڑھ رہی ہیں، آپ کی پریشانی دور ہوئی؟ اللہ راضی ہوا؟''

میرال نے مصلی رکھ کر اسے دیکھا۔

''جب اللہ آپ کو نہیں دے رہا، مجھے کیوں دے گا؟''

''وہ مجھے دے رہا ہے، تمہیں بھی دے گا۔''

''مجھے آپ کی زندگی نہیں چاہیے۔''

میرال اپنی جگہ رک گئی۔

''انفیکٹ مجھے کچھ بھی ایسا نہیں چاہیے جو آپ کو مل رہا ہے۔''

''تو وہ مانگو جو تمہیں چاہیے۔''

''آپ کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں، میری بھی نہیں ہوں گی۔''

میرال کا دل گہرے پاتال میں جا گرا۔ ''ایسا نہیں ہے ہالا۔''

"ایسا ہی ہے۔"
حتمی لہجے میں کہہ کر وہ بستر پر واپس لیٹ گئی۔
"ویسے آج آپ نے اپنے اللہ سے کیا مانگا؟ شاہ زیب؟ اس کی محبت؟ یا میری موت؟"
"ہالا!" میرال نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔
اس نے لحاف سر تک تان لیا۔

☆☆☆

فجر نماز کی ادائیگی کے بعد گہری سانس بھر کر آئلہ نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا لیے تھے، اس نے کچھ مانگنے کی کوشش کی پر مانگ نہ سکی، آواز بیٹھی ہوئی تھی، چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا، ساری رات ایک اندرونی جدال میں گزر گئی تھی، راستے کا انتخاب اس نے کر لیا تھا، اب آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی، ریشم نے آٹھ بجے کا وقت بتایا تھا، رفیق کی رہائی چند گھنٹوں کے فاصلے پر تھی، اور وہی فاصلہ اس کے اعصاب پر بھاری پڑ رہا تھا۔

ایک دل چاہا وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں سے بھاگ جائے، اپنے باپ سے رابطہ کرلے یا اپنی ماں کے پاس چلی جائے یا پھر زمین پر یوں روپوش ہو کہ کبھی کسی کو دکھائی نہ دے۔ مگر ایسا کچھ بھی ممکن نہ تھا۔

نماز کے بعد وہ ایک بار پھر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ریشم آفس روم سے نکل کر اس کے پاس آ گئی تھی، اس کے ہاتھ میں موبائل تھا، اس نے اسکرین آئلہ کے سامنے کر دی تھی۔

وعدے کے عین مطابق رفیق کو رہائی مل چکی تھی، تھانے سے باہر وہ ناصرہ تائی اور فہد سے ملتے نظر آ رہے تھے، ان کی حالت ابتر ہو چکی تھی، چند ہفتوں میں وہ سالوں کے بیمار نظر آ رہے تھے، وہ رو رہے تھے، اور مسکرا بھی رہے تھے۔ وہ فہد کے گلے کافی دیر تک لگے رہے تھے۔

"چند لمحے پہلے کی ویڈیو ہے۔" ریشم نے موبائل پیچھے ہٹا لیا۔

"جب وہ گھر پہنچ جائے گا تو اس کی اپ ڈیٹ بھی دے دوں گی، تم بتاؤ اب۔ ناشتا یہیں لو گی یا گیسٹ روم میں جانا پسند کرو گی۔"

گہری سانس بھر کر آئلہ نے اپنے آنسو صاف کر ڈالے، خشک لبوں پر زبان پھیرتے اس نے سر اٹھایا۔

"کمرے میں جانا چاہوں گی۔"

ریشم کی مسکراہٹ ابھر کر ختم ہوئی۔

"اچھی بات ہے کہ تم سمجھ داری سے کام لے رہی ہو، اور اس سے بھی اچھا رہے گا اگر تم کوئی چالاکی نہ کرو۔" آئلہ کی خاموش نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ "تم سے پہلے میم نے جس بندے کو ہائیر کیا تھا، اس نے کی تھی چالاکی، اس نے باقاعدہ دھوکا دے دیا تھا، جانتی ہو اب وہ کہاں ہے؟"

آئلہ کے حلق میں کوئی شے پھنس گئی تھی۔ مگر تاثرات میں سختی لیے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی تھی۔

"بالکل درست سمجھیں، گولی میں نے ہی چلائی تھی، اور یاد رکھنا میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔"

"تو آپ کر لیتیں یہ کام؟" ریشم جانے کو مڑی تو وہ فوراً سے بول پڑی۔ "مروان جلال کا نشانہ بھی آپ ہی لگا لیتیں۔"

ریشم رک گئی۔

"کہا نا۔ یہ وہ کام ہے جو تم زیادہ اچھے سے کر سکتی ہو۔" وہ جا چکی تھی۔ اور آئلہ حدید اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

گل ویلفیئر ہائی اسکول میں گھنٹیاں بج اٹھی تھیں۔ بریک کا وقت ہو چکا تھا، تمام بچے کلاسز سے بھاگتے دوڑتے باہر نکل رہے تھے۔ اس دوران ابتہال بھی اپنا بیگ بند کر کے باہر آ گئی تھی۔

وہ نیچے گراؤنڈ کی طرف جا رہی تھی جب رمشہ نے اسے آواز دے کر روک لیا تھا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے!''

''کہو!''

جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔

''آئم سوری۔ اس دن میں نے تمہارے ساتھ کافی بدتمیزی کی!''

''میرا خیال تھا تم نے میری ڈائری پڑھی ہو گی مگر۔''

ابتہال رک گئی۔ اب وہ رمشہ کو دیکھ رہی تھی۔ ''مگر اپنی وہ ڈائری تو میں اسکول لاتی ہی نہیں ہوں۔'' اس نے اسکارف کا پلو گردن پر درست کیا۔ پھر اس نے وہ سوال کیا جو گزشتہ رات سے اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

''ابتہال۔ تمہیں۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟''

اپنی آنکھوں میں خاموشی لیے ابتہال نے اب کے رک کر اسے دیکھا۔

''کیا کیسے پتا چلا؟''

''جو تم نے اس دن کہا؟'' اس نے بے قراری سے نچلا لب کاٹا۔

''کیا کہا تھا؟''

''میری ماں کے بارے میں۔ کہ وہ مجھے مار دیں گی۔''

''کیا ایسا نہیں ہے؟''

ابتہال کے سوال پر وہ آنکھوں میں الجھن لیے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ لڑکی اس کی پڑوسن نہیں تھی، اس کے ساتھ اس کی دوستی نہیں تھی، وہ اس کے گھر حالات سے کسی طور واقف نہیں ہو سکتی تھی، اسے اس کی ماں کے رویے کا کسی طور بھی علم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ جو کچھ بھی کرتی تھیں بند کمرے میں کرتی تھیں، مار دھاڑ اور تشدد اب روز کا معمول تھا۔

''تم نے کیسے......''

''تمہیں برا لگا میں نے تم سے وہ بات کہی؟''

رمشہ کا سر نفی میں ہلا، آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کے لیے فکر دکھائی تھی۔

''سگی ماں ہے؟''

اس کا سر نفی میں ہلا۔

وہ سویٹر کی آستین کو کھینچتے اپنا زخم چھپا رہی تھی۔

''تم نے بتایا نہیں...... تمہیں کس نے بتایا اس بارے میں؟ میرے بارے میں؟''

''تمہارے قلم نے۔''

رمشہ نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ ''میرا قلم؟''

''مذاق کر رہی ہوں!'' وہ مسکرا کر سنجیدہ ہوئی۔ ''یہی حال رہا تو ایک دن سچ میں وہ تمہیں مار ڈالیں گی۔''

''کیا تمہارے پاس جنات ہیں؟'' رمشہ کے چہرے پر ہراس پھیل گیا۔ ''کسی مخلوق کا سایہ ہے تم پر؟''

''کیا خبر ایسا ہی کچھ ہو، کیا تم ڈر رہی ہو؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

خوف کے باوجود رمشہ نے نفی میں سر ہلایا۔
''ویری گڈ۔'' وہ جانے کو مڑی تو رمشہ نے دوبارہ پکارا۔ ''کیا ہم روز ساتھ بیٹھ سکتے ہیں؟''
ابتہال رک گئی۔ روزانہ تاخیر سے آنے کی وجہ سے دونوں کو جگہ ایک ساتھ ہی ملتی رہی تھی، اور آج ابتہال پہلی رو میں بیٹھ گئی تھی تو رمشہ کو لگا وہ ناراض ہے تب ہی اپنا جگہ بدل چکی ہے۔
ابتہال نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔
گہری سوچ میں ڈوبی رمشہ وہاں کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ہربائی کا جنگل سرد ہواؤں کی زد میں تھا، سہ پہر کا وقت تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھیں، اموجان باہر بنچ پر بیٹھی تھیں، ان کے قریب آگ جل رہی تھی، دور درختوں کے جھنڈ اور بلندی سے راکان اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ بھاگتا دوڑتا جا رہا تھا۔ اس کی چیخ و پکار کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں، اخروٹ کے ایک درخت کی کٹی ہوئی شاخوں کو پکڑ پکڑ کر وہ اوپر تک چڑھ گیا تھا، اور کبھی وہ شاخ سے الٹا لٹک کر جھولنے لگتا تھا، اس کے ساتھی بھی پھرتیلے تھے مگر وہ ایسا کرتب نہیں دکھا سکتے تھے جیسے وہ دکھاتا رہتا تھا۔ شاخ سے جھول کراب کے وہ نیچے اترا تو ایک بار پھر بچوں میں دوڑ شروع ہو گئی۔ ریچ پوائنٹ اموجان کا وہ بنچ تھا جس پر بیٹھ کر وہ ڈبے پر نقش بنا رہی تھیں۔
چند ہی لمحوں میں وہ اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑتا ان تک پہنچ گیا تھا۔
''جیت گیا!'' وہ پیچھے ان کی کمر کے گرد بازو باندھے لپٹ گیا تھا۔
اموجان اس کا لمس پا کر مسکرائیں۔ اس کے ساتھیوں نے سوچا راکان تو جیت چکا اب وہ بنچ تک کیوں بھاگیں، سو وہ شور مچاتے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔
''اموجان پوچھیں مجھ سے...... میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا؟''
''کیا بنو گے؟'' ان کے ہاتھ میں ووڈ کارونگ نائف تھی، وہ ڈبے کی عقبی سائڈ پر نرگسی پھول کا نقش بنا رہی تھیں۔
''میں...... ریسر بنوں گا امو۔'' وہ ایک عزم سے بولا۔ ''میں روز ریس میں سب سے جیت جاتا ہوں۔''
اموجان نے مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھا۔ دو روز پہلے تک اس کا خواب ٹیچر بننے کا تھا، اس سے پہلے وہ گھڑ سواری کو اپنا مستقبل بتا چکا تھا، ایک بار روٹی کے چھوٹے پیڑے کو اس نے اچھے سے گول کر لیا تو اس نے کہا وہ بڑا ہو کر شیف بنے گا، روٹیاں بنایا کرے گا، اموجان کو وہ ہر روٹی فری میں دے گا۔
''میں تو ابتہال سے بھی جیت سکتا ہوں، مگر وہ میرے ساتھ دوڑتی نہیں ہے۔''
اموجان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ بھاگنے دوڑنے، کھیلنے کودنے کے باعث سرخ ہو رہا تھا، آسمانی مفلر گردن سے لپیٹ کر اس کے سروں کو اس نے ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا، اونی کیپ نے کچھ بال چھپا رکھے تھے اور کچھ بال اس کے ماتھے پر، اور کانوں سے بھی نظر آرہے تھے۔
اسی لمحے انہیں راکان کے عقب میں چڑھائی کے راستے سے ایک خاتون نیچے اترتی نظر آئیں۔ خاتون کے ساتھ اس کا ملازم بھی تھا جو وہیں رک گیا تھا۔
''جاؤ کھیلو!'' باکس رکھ کر انہوں نے راکان سے کہا جو اسی وقت میز سے کودا اور مشرقی سمت بھاگا۔
احتیاط سے قدم اٹھاتی خاتون نے اس آٹھ نو سالہ بچے کو برق رفتاری سے بھاگتے دور تک دیکھا۔ پھر وسیع سبزہ زار پر قدمی دھرتی اموجان کی طرف جانے لگی۔

اس کا لباس سیاہ فراک نما تھا، کھلا ڈھلا سا، جس کی تنگ آستینوں پر اس نے چند کڑے پہن رکھے تھے، سر پر ہیٹ کے نیچے سیاہ شال تھی جسے اس نے اوڑھ رکھا تھا، اور جس کے سروں میں اس کا چہرہ کافی حد تک پوشیدہ رہا تھا۔

راکان نے بلندیوں سے اس عورت کو اموجان کے پاس بنچ پر بیٹھتے دیکھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ نہر کی طرف بھاگ گیا۔

☆☆☆

ظہیر ہاؤس کے عالیشان گیسٹ روم میں وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، دیوار گیر کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے، کمرے کی روشنیاں بھی اس نے مدھم کر رکھی تھیں۔ ملازمہ کچھ دیر پہلے اسے ناشتا دے کر گئی تھی جو میز پر جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری کہ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تھی۔ دروازہ کھول کر ریشم اندر آ گئی تھی۔ مسز ظہیر اسے اوپر بلا رہی تھیں۔ پیروں میں جوتے اڑستے وہ ریشم کے پیچھے بے حد خاموشی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپری منزل پر آ گئی۔

یہاں کئی کمرے، کئی دروازے تھے، لاؤنج اور راہداریاں تھیں، وہ ریشم کے ساتھ ایک بند دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔

ریشم نے دستک دے کر اسے اندر جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ گہری سانس بھر کر ہمت مجتمع کرتے وہ اندر داخل ہو گئی تھی۔

وسیع و عریض کمرہ سرخ اور سفید تھیم میں سجا ہوا تھا، منقش براؤن فرنیچر کے اطراف میں پردے لٹک رہے تھے، کھڑکیوں کے پردے سنہری، سفید فرش پر بچھا قالین بھی سنہری تھا۔ انہی سنہری رنگوں میں کئی یادیں بسی تھیں، کئی خواب بند الماریوں میں ٹھہرے رہ گئے تھے، کئی کتابیں بے جان سی ریکس میں پڑی رہ گئی تھیں۔

سامنے والی دیوار پر پریسا لکھا تھا۔ وہ نام ایک مرکز تھا، اس نام کے ساتھ کمرے کی ہر ایک شے جڑی ہوئی تھی۔ گو کہ بتیاں جل رہی تھیں مگر پھر بھی اسے اس کمرے کی وسعت میں تاریکی کا احساس ہوا تھا۔ وہ تاریکی جو بیڈ پر بیٹھی مسز ظہیر کے وجود سے امڈتی آ رہی تھی۔

ان کے بال کھلے ہوئے تھے، ان کی آنکھوں میں نمی ٹھہری تھی، تصویر کا ایک فریم ان کے ہاتھ میں تھا، وہ تصویر ان کی بیٹی کی تھی۔

''یہ پریسا کا کمرہ ہے، پیارا ہے نا!'' بات کرتے ان کی آواز سے محبت جھلکی۔ ''جس طرح وہ سیٹ کر کے گئی تھی، بالکل ویسے ہی پڑا ہوا ہے، میں نے اس کی ایک چیز بھی یہاں سے وہاں نہیں کی۔''

آنلہ خاموش رہی۔

انہوں نے تصویر کا ایک فریم اس کے سامنے کیا۔

اس نے دیکھا تصویر کے وسط میں ایک ہنستا مسکراتا نوجوان کھڑا تھا جس کے دائیں بائیں تین لڑکیاں کھڑی تھی۔

''پریسا۔'' انہوں نے اپنی بیٹی کے چہرے پر انگلی رکھی۔ ''یہ نایاب ہے۔'' انہوں نے دوسری لڑکی کا چہرہ چھوا۔ ''اور یہ زرگل ہے۔'' ان کی انگلی اب تیسری لڑکی پر آ ٹھہری تھی۔

''تمہیں شاید حیرت ہو یہ جان کے..... مروان کے ساتھ کھڑی ان تین لڑکیوں میں کوئی ایک بھی زندہ نہیں ہے!''

آئلہ حدید سانس نہیں لے سکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے جذبات ایک ساتھ امڈ آئے تھے۔

گہری سانس بھر کر اب وہ سامنے دیکھنے لگی تھیں۔

"میں نے پریسا کو بہت سمجھایا تھا، میں نے اس سے کہا تھا نایاب کی موت کو نظر انداز مت کرو، مگر اس کی آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے مروان کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا!"

انہوں نے پھر اٹھ کر وارڈروب کے سارے خانے کھول دیے۔

پریسا کے دیدہ زیب مہنگے ملبوسات سے الماری بھری پڑی تھی، درازوں میں اس کے گولڈ اور ڈائمنڈ کے سیٹ چمک رہے تھے، انگوٹھیوں کا کلیکشن چار بڑے ڈبوں پر مشتمل تھا، اس کے نام پر جتنی جائیدادیں اور پراپرٹی خریدی گئی تھی وہ کاغذات بھی وہیں رکھے تھے۔ مسز ظہیر نے ایک ایک شے اسے دکھائی تھی۔

اپنی نم آنکھوں میں ایک الوہی سی چمک لیے وہ اس کی طرف مڑیں۔ "بس ایک بار تم مروان کی جان لے لو، یہ سب تمہارا ہوگا!"

آئلہ حدید کے اندر سناٹے چھا گئے تھے۔

"اپنی ہر وہ پراپرٹی جو میں نے پریسا کے لیے خریدی تھی، تمہارے نام کر دوں گی، میں تمہیں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہوں آئلہ۔ بدلے میں مجھے بس وہ لڑکا مردہ چاہیے۔"

"یہ سب کیسے ہوگا؟" ان کے برابر میں بیٹھے، اپنے تاثرات میں ہنوز خاموشی اور سرد مہری لیے اس نے سیدھا سوال کیا تھا۔ مسز ظہیر کے عزائم سے وہ آگاہ تھی، مگر پلاننگ پر ابھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی...... وہ ان کے ذہن تک پہنچنا چاہتی تھی، ان کی چال کو سمجھنا چاہتی تھی۔

مسز ظہیر کچھ دیر گہری سوچ میں گم پریسا کی کوئی اور تصویر دیکھتی رہیں۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

"میں نے پریسا کو قصر جلال میں بھیجا تھا، میں تمہیں بھی وہاں بھیجوں گی۔"

آئلہ کی دھڑکن شدید ہوئی تھی۔

"فرق حیثیت اور پوزیشن میں ہوگا، تم وہاں ایک ہاؤس منیجر کے طور پر جاؤ گی۔"

آنکھوں میں حیرت لیے وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

"دو ماہ پہلے ان کی سابقہ ہاؤس منیجر نے استعفیٰ دے دیا تھا، تب سے وہ زرقا کرسٹ اسٹیٹ سے رابطے میں ہیں، ایک نئی ہاؤس منیجر کے لیے...... اور زرقا اور میری دوست ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے انہوں نے کچھ سوچا۔

"پچھلے ماہ بھی اس نے کچھ پروفائلز بھیجی تھیں، لیکن وہ ریجکٹ کر دیتے ہیں، نیکم کو وہ دوبارہ بھیجے گی، اور ان میں اس بار تمہارا نام بھی شامل ہوگا۔"

آئلہ نے ان کی پوری بات سانس روک کر سنی تھی، مسز ظہیر نے تمام معاملات طے کر رکھے تھے، ان کا پلان مکمل تھا۔

"مگر میرا ان معاملات میں کوئی تجربہ نہیں ہے۔" اس نے صاف کہہ دیا

"کیا تمہیں پہلے بھی کبھی کسی تجربے کی ضرورت پڑی ہے آئلہ؟"

ان کا سوال آئلہ حدید کو لاجواب کر گیا۔

"ایک بار بس دیکھتی ہو اور سیکھ جاتی ہو۔"

"سیکھنا الگ بات ہے...... اسے اپلائی کرنا الگ ہے!"

”تمہیں کیا لگتا ہے آئلہ میں بے وقوف ہوں؟“ اب کے مسز ظہیر نے اپنے تاثرات میں سختی ٹھہرا لی۔ ”تمہیں جانتی نہیں ہوں؟“

آئلہ کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے۔

”تم صرف دیکھتی تو نہیں ہو، سب ریکارڈ کرتی ہو، کوئی بھی بات تمہارے ذہن سے محو نہیں ہو سکتی۔“

وہ چپ رہی۔

”تم مروان جلال کی ایک ایک حرکت کو بہتر سمجھ سکتی ہو، اس کے موڈ پر کھ سکتی ہو،..... قصر جلال رازوں سے بھرا ہے، اور میں یہ بھی جانتی ہوں مروان بغیر کسی وجہ کے دوارِیان میں نہیں رکا۔ کچھ تو ہے جو وہ چھپا رہا ہے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے آپ میری پروفائل بھیجیں اور وہ مجھے ریجکٹ کر دیں۔“ اس نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”مروان کا بٹلر ارباز۔ ہمیشہ اپنے مالک اور قصر جلال کے لیے بہترین کی تلاش میں رہتا ہے، پچھلی بار میل اور فیمیل دونوں قابل نام موجود تھے مگر تفصیلات پڑھ کر اس نے ریجکٹ کر دیے۔ جانتی ہو کیوں؟“ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ”کیونکہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی خلا ہم نے چھوڑا تھا، کیونکہ ہم چاہتے تھے وہ ریجکٹ ہوں۔“

”تو اب۔ اب اس ایک ماہ میں..... کیا کیا ہوگا؟“

”تمہیں کل ہی ریشم زرقا کرسٹ لے جائے گی، ان کی پوری ٹیم ہے، اسٹاف ہے،“ وہ تمہیں ایلیٹ کے رہن سہن اور ان کی خدمت داریوں کے تمام گر سکھا دیں گے، تمہیں وہاں کام کیسے کرنا ہے، کیسے رہنا ہے اور کیسے ایک پروفیشنل ہاؤس منیجر کے طور پر ابھر کر سامنے آنا ہے۔ سب کچھ۔“

”وہ میرا بیک گراؤنڈ چیک بھی تو کر سکتے ہیں، وہ جان بھی تو سکتے ہیں کہ مجھے پلانٹ کیا جا رہا ہے۔“

”ہم تمہاری کہانی میں کوئی ایسا ردوبدل نہیں کر رہے جس کی بنیاد پر یہ سوال ان کے ذہن میں آئے، تم حدید اور عمارہ کی بیٹی ہو، دونوں نے علیحدہ ہو کر اپنے گھر بسا لیے، تم اپنے تایا کے ہاں پلی بڑھیں، ان کے ساتھ تمہارے ٹرمز اچھے نہیں، جلد ہی تم نے زرقا کرسٹ اکیڈمی جوائن کر لی۔ کورسز کیے، زبانیں سیکھیں، اور پھر یہاں اپلائے کر دیا۔ اور اب تم پہلی بار کہیں کام کرنے والی ہو۔“

انہوں نے کہانی کا پورا پلاٹ ترتیب دے کر اسے کردار بنا ڈالا تھا۔

”پہلی بار؟“ اس نے پرسوچ انداز میں انہیں دیکھا۔ ”وہ کیوں ایک ایسی ہاؤس منیجر کو ہائر کریں گے جس کا تجربہ پہلے کہیں بھی نہیں رہا۔“

”یہی تو پلس پوائنٹ ہے!“ مسز ظہیر شیطانیت سے مسکرائیں۔ ”خیر دیکھتے ہیں تمہاری قسمت کیا پلٹا کھاتی ہے۔“

وہ انہیں دیکھ رہی تھی، اور سوچ رہی تھی انٹرویو کے دوران ہی کچھ ایسا ہو جائے جس کی بنا پر ارباز اسے رد کر دے، کوئی غلطی، کوتاہی، کوئی جھوٹ پکڑا جائے..... کوئی شک سامنے آ جائے۔

ممکن ہے قصر جلال پہنچنے۔ سے پہلے ہی یہ قصہ تمام ہو جائے۔

دل میں امید لیے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے ریشم کے پیچھے چلتے ہوئے اس نے اپنا ذہن اس ایک لمحے میں ہر جانب دوڑا لیا تھا، ہر ممکنہ خطرے کو جانچ لیا تھا، ہر ممکنہ حساب کو پرکھ لیا تھا۔

مروان جلال۔

اور مسز ظہیر۔

دونوں کی جنگ میں وہ ایک ہتھیار بنی وسط میں کھڑی تھی۔

☆☆☆

قصر جلال کے میناروں پر روشنیاں دھری تھیں، شب کی تاریکی میں قصر کا اندرونی حصہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ اسٹاف متحرک تھا۔

لمبی ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کے لوازمات رکھے جا رہے تھے۔

جلال صاحب آتش دان کے سامنے آرام دہ صوفے پر بیٹھے دیوار گیر کھڑکی سے باہر، باغ کے درختوں کو دیکھ رہے تھے جن کی شاخیں ہواؤں کی شدت سے جھکی چلی آ رہی تھیں۔

ان کے بائیں جانب شیشے کی دیوار تھی، اس دیوار کی دوسری جانب سوئمنگ پول تھا جس کے اطراف میں کئی پودے رکھے تھے۔ وہیں کرسی پر سارنگ اپنے یونیفارم میں ملبوس بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنجیر تھی جسے وہ انگلیوں پر گھمائے جا رہا تھا۔

اس کے عین سامنے سوئمنگ پول کے پانیوں میں یکا یک بھنور بنا تھا۔ جیسے کوئی آہستگی سے پانی کے اندر اتر گیا ہو۔

سارنگ نے بے اختیار نگاہ اٹھائی پھر دوبارہ جھکا لی۔ وہ بھنور متحرک سا پول کنارے اس کے قدموں کے قریب آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''کیا خبر ہے؟'' کچھ ہی دیر میں ارباز وہاں آ گیا تھا۔

''نیا آرٹیکل چھپا ہے، نئے ہیش ٹیگ چلائے جا رہے ہیں، نام تو ابھی بھی بڑے مالک کا وہی ہے...... وہی نیلی داڑھی والا بادشاہ!''

ارباز کی پرسوچ نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

''تم مالک کے لاڈلے ہو...... کہہ دو بال رنگ لیں اپنے...... نام بڑا سوٹ کرتا ہے۔''

''تمیز سے سارنگ!'' ارباز کی سخت بھاری آواز کا رعب اسے خاموش کر گیا۔

''مذاق کر رہا تھا میں۔'' زنجیر گھماتے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

''تمہارے مذاق اب حد سے گزرنے لگے ہیں۔'' سارنگ کھسیانا ہو گیا۔

''اور شیر دل کے ساتھ فضول باتیں مت کیا کرو۔''

''اسے سمجھاؤ، سوال بہت کرتا ہے!''

''کرنے دو سوال۔ جو بات اسے بتانی ہو گی وہ میں اسے بتاؤں گا!''

''پتا نہیں مالک کو کیا سوجھی...... اس ڈرپوک کو بھی اس راز میں شامل کر دیا۔ دو چھاپے پڑ گئیں گے سب کچھ اگل دے گا۔''

''مالک کا فیصلہ۔ مالک کی مرضی۔''

سارنگ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

☆☆☆

زمان ہاؤس شادی گھر کی رونقیں عروج پر تھیں، گھر کے چھوٹے بڑے کسی نہ کسی کام میں مصروف دکھائی دیتے تھے، کوئی آ رہا ہے، جا رہا ہے، ملازمین کی دوڑیں الگ سے لگوائی جا رہی تھیں،

لاؤنج میں براجمان ہو کر شیشے کی ایک دیوار کے اس پار سبزہ احاطے کا جائزہ لیتے انوشے نے شگفتہ کو چائے کا حکم دیا تھا، اور بنا کر اس کے سامنے رکھنے والی میرال اسفند تھی۔ ''رکو!''

کپ رکھ کر وہ دو قدم ہی بڑھی تھی کہ رکنا پڑا۔ مڑ کر اس نے انوشے کو دیکھا۔

سفید گاؤن میں ملبوس وہ ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھی تھی، پھیلی ہوئی آستینوں سے جھالریں سے لٹک رہی تھیں، جوتا بھی سفید ہی تھا، ایرنگز بھی، سنہری ڈائی بال اس نے کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

یہاں کے سبھی ملازمین کے ساتھ اس کا تعارف ہو چکا تھا۔ ایک وہی رہ گئی تھی۔

''میرال۔''

انوشے نے اسے بغور دیکھا۔

آنکھوں کے حلقے گہرے، پژمردہ چہرے سے تھکاوٹ عیاں تھی، ملازم تو گھر میں اور بھی تھے مگر کسی کی حالت بھی ایسی نہ تھی جیسی اس کی تھی، وہ لڑکی اسے برسوں کی بیمار لگی تھی۔

اس کے وجود پر کھدر کا ہلکے رنگ کا کھلا ڈھلا سا سوٹ تھا، جس کی قمیض کے دامن پر سلائی لگا کر پھٹے ہوئے کپڑے کو جوڑا گیا تھا۔

''یہاں کب سے کام کر رہی ہو۔''

اس کی پلکیں لمحے بھر کے لیے جھکیں، پھر اٹھ گئیں۔ ''کافی عرصہ ہو گیا ہے!''

چائے کا ایک گھونٹ لے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے پاس آ کر ایک لفافہ آگے بڑھایا۔

''کل میں نے ساری میڈز کو دیا تھا، تم رہ گئی تھیں۔''

میرال اسفند کی نگاہیں اس کے ہاتھ سے پھر چہرے پر جمی رہ گئیں۔

''شکریہ۔ مجھے رہنے ہی دیں۔'' اس نے پیسے نہ لیے۔ فوراً سے پلٹ گئی۔ میرال کی یہ حرکت انوشے کو انتہائی ناگوار گزری۔

''مالکن ہونے کے ناطے تمہیں بونس دے رہی ہوں۔'' اپنی ناگواری چھپا کر وہ دوبارہ مسکرائی۔

''مالکن!؟'' کوئی بھالا سا میرال کے دل میں گڑ گیا۔ ہاں وہ اس گھر کی اصلی مالکن ہی تو تھی۔ جسے اس کا شوہر ہرگز بھگا کر نہیں لایا تھا، جس کے ساتھ نکاح والدین سے چھپ کر نہیں کیا گیا تھا، جسے جھوٹی امید نہیں دلائی گئی تھی۔

انوشے کا ہاتھ ابھی بھی اٹھا ہوا تھا۔ وہ منتظر تھی کب میرال لفافہ پکڑے تو وہ ہاتھ نیچے کرے۔

''تم یہاں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی ہو، کل دیکھا تھا میں نے اسے، پیاری لڑکی ہے، اسکول جاتی ہے، کون سی کلاس میں پڑھتی ہے؟ اس کے لیے کچھ لے لینا!''

میرال کی نگاہیں انوشے کے چہرے پر جمی رہ گئیں۔ انوشے بضد تھی وہ پیسے لے۔ غالباً انکار نے اس کی نفسیات پر کوئی چوٹ ڈالی تھی۔

''بہت شکریہ، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ صاف انکار کر کے کچن میں چلی گئی۔ انوشے کے لب کچھ ناگواری سے بھنچ سے گئے،

''کتنی روڈ لڑکی ہے۔ ایسا ایٹیٹیوڈ تو ملازم نہیں دکھاتے!''

موبائل پر کچھ لکھتے شاہ زیب وہاں سے گزرا تو اسے دیکھ کر رک گیا۔

''کون روڈ ہے؟''

''یہ میرال...... پیسے دے رہی تھی، نہیں لیے! سب کو بونس دیا ہے میں نے۔ مگر اس لڑکی کے تو مزاج ہی نہیں مل رہے تھے۔''

شاہ زیب چونک گیا۔

"کچھ کہہ رہی تھی؟" اس نے بے پروائی سے پوچھا۔
"نہیں ایسے دیے تو انکار کر دیا۔" انوشے واپس صوفے پر جا بیٹھی۔ شاہ زیب نے گردن موڑ کر راہداری کی طرف دیکھا۔ کچن کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شگفتہ میراں کو نیا حکم پہنچاتی نظر آرہی تھی۔
عصمت بیگم نے اپنے کمرے کی صفائی کروانی تھی اور اس کے لیے انہیں میراں ہی چاہیے تھی۔
"بھئی جب آپ محتاج ہیں تو یہ اکڑ کیسی؟" وہ ہنوز بڑبڑا رہی تھی، چائے کا دوسرا گھونٹ بھر کر کپ میز پر پٹخ دیا۔ ذائقہ اب بدل چکا تھا۔
"ذرا اچھی نہیں بنائی!"
شاہ زیب نے جیسے کچھ سنا نہیں۔ سر کھجاتے اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔ انوشے کی بھنویں ہنوز سکڑی ہوئی تھیں۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ظہیر ہاؤس کے گیسٹ روم میں، آسمانی کارپٹ پر دوزانوں بیٹھی گیلری میں محفوظ اپنے پاپا کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ پشت پر کھلے لمبے بے ترتیب بال کارپٹ کو چھو رہے تھے، آنکھوں کی سرخی کچھ بڑھی ہوئی تھی۔
اس کے واٹس ایپ پر زینی کی طرف سے کئی میسج آچکے تھے، کئی بار وہ اسے کال کر چکے تھے۔ اس کا نمبر بند تھا مگر واٹس ایپ وہ بند نہیں کر سکی تھی۔
ایک بار پھر ان کی کال آرہی تھی،
گہری سانس بھر کر اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ کچھ دیر بعد موبائل خاموش ہو گیا۔ وہ اب گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھی تھی۔
یکایک موبائل پر نوٹیفکیشن موصول ہوا، اس نے اٹھا کر دیکھا تو تاشا جے کا نام لکھا تھا۔ ویب سائٹ پر نئی قسط شائع کر دی گئی تھی۔ اپنے معاملات میں وہ ایسی الجھی تھی کہ اب تک شائع ہونے والی دو اقساط وہ پڑھ ہی نہ سکی تھی۔
یونہی ذہن بھٹکانے کو اس نے تاشا جے کا انسٹاگرام پروفائل کھول لیا تھا۔
پچھلے ہفتے وہ گیلڈفورڈ میں تھی، آج کل وہ مانچسٹر گھوم رہی تھی۔
اس نے پائیڈ پائپر کے کچھ مقولے شیئر کیے تھے، بچوں کے ہجوم کی ایک تصویر میں اس نے مجسمہ بنے پائپر کے کندھے پر اپنے جالی دار دستانے میں مقید ہاتھ رکھا ہوا تھا،
نئی تصاویر میں وہ سرخ مشروب کا گلاس دکھا رہی تھی، ایک تصویر زہر کی نشاندہی کرتی تھی، ایک پوسٹ مکڑی کے جال پر بنی ہوئی تھی، ایک منظر گڑیا گھر پر ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک تصویر پھولوں کے اس ڈھیر کی تھی جو مرجھا کر سیاہ ہو چکے تھے۔
"کچھ صلاحیتیں منظر عام پر آجائیں تو وبال بن جاتی ہیں۔" اس نے ایک مقولہ لکھ رکھا تھا۔
گہری سانس بھر کر اس نے موبائل رکھ دیا۔
اب وہ کھڑکیوں سے باہر دھند میں لپٹے لان کو دیکھ رہی تھی جس کی لان لائٹس اس تاریکی اور کہر میں مبہم سا تاثر بن کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

شام کے پانچ بج رہے تھے انوشے بالکنی میں کھڑی تھی، بھورا، سیاہ اونی لباس زیب تن کیے وہ دھند میں لپٹی، بیرونی دیوار اور اس کے پار نظر آتے اونچے لمبے درختوں کو دیکھ رہی تھی جو دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یکایک

کوئی آواز سماعت سے ٹکرائی تو اس نے بے اختیار نیچے دیکھا۔
شگفتہ اونچی آواز میں کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے گردن جھکا کر دیکھا تو دائیں طرف شاہ بلوط کے نیچے اسے میرال کی چھوٹی بہن نظر آئی۔
کتاب ایک ہاتھ میں لیے وہ اپنا کام کر رہی تھی۔
شگفتہ کو جواب اس نے پست آواز میں دیا تھا، مگر چہرے کی سختی بتلاتی تھی اسے کچھ برا لگا ہے۔ شگفتہ اب اس کے سر پر پہنچ چکی تھی، کمر پر ایک ہاتھ رکھے، دوسرا ہاتھ نچا نچا کر بولے جا رہی تھی۔
''دفع ہو۔''
انوشے سن نہ سکی مگر لبوں کی جنبش سے اندازہ ہوا اس نے ایسا ہی کچھ کہا ہے۔ شگفتہ اسے دو چار باتیں مزید سنا کر چلی گئی۔
انوشے کو کچھ یاد آیا تو کمرے میں واپس آ گئی، اس نے دراز سے وہ لفافہ نکالا جو اس نے صبح میرال کو دینا چاہا تھا۔
لفافہ اٹھائے وہ ارزا، اور یمنیٰ کے کمرے میں چلی گئی، وارڈ روب کھول کر اس نے کچھ فراک ادھر ادھر کیے، پھر ایک نکال لیا، دراز سے چند موزے نکالے، اونی اسکارف اور مفلر بھی۔
پھر سارا سامان پلاسٹک بیگ میں ڈالے باہر آ گئی۔
فضا میں انتہا کی خنکی تھی، جانے وہ لڑکی اس قدر ٹھٹھرتے موسم میں باہر کیسے بیٹھی تھی۔
''ہیلو!'' شاہ بلوط کے پاس پہنچ کر اس نے کہا۔
لڑکی نے کتاب سے سر اٹھایا۔ اس کی سرمئی آنکھوں کا تاثر میرال کی آنکھوں جیسا لگا۔ مردہ، ویران، اور خاموش سا۔
''یو لک ایگزیکٹلی لائک یور سسٹر! پریٹی آئیز آئی مسٹ سے۔'' خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے وہ ایک ادا سے مسکرائی۔ کمر سیدھی، گردن اونچی...... بنچ سے ایک فاصلہ سا رکھے ہوئے۔ جیسے وہ بلندیوں کی ملکہ ہو، اور بہت اونچائی سے نیچے کسی کو دیکھ رہی ہو۔
''نام کیا ہے تمہارا؟''
ابتہال کے لب بھنچے رہے۔ نگاہیں انوشے پر ٹکی رہیں۔
''عجیب بات ہے، شمو کے بیٹے نے تو فوراً جواب دے دیا تھا، اور صائمہ کی بیٹیاں تو چپ ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ بتا رہی تھیں وہ تمہارے ساتھ سکول جاتی ہیں!''
انوشے چند لمحوں تک جواب کی منتظر رہی، پھر اس نے شاپر اس کے برابر میں بنچ پر رکھا۔ ''یہ میری بیٹی کے کپڑے ہیں، ایک دو بار ہی پہنے ہوں گے۔ میں ڈونیٹ کر رہی ہوں، اور یہ میری طرف سے۔'' اس نے لفافہ آگے بڑھایا۔ ''اپنے لیے کوٹ لے لینا! یہ ایسا موسم تو نہیں کہ صرف سویٹر سے گزارا کیا جا سکے۔''
ابتہال کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے لفافہ پکڑا، نہ ہی انوشے کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند سو کے نوٹ نکال کر انوشے کی جانب بڑھا دیے۔
انوشے نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ کچھ نا سمجھی سے۔
''میرے پیسے ہیں، اسکول کی طرف سے انعام میں ملے ہیں۔ رکھ لیجیے! کچھ کھا لیجیے گا۔''
انوشے صدمے سے گنگ، اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اسے ہرگز اندازہ نہ تھا سادہ اور غریب نظر آنے والی وہ لڑکی اس قدر بدتہذیب ہو گی۔

"ہاؤ ڈیئر یو آر انسلٹنگ می لائک دس۔" بہت ضبط سے وہ اپنی آواز کو بلند ہونے سے روک پائی تھی۔
"کیوں؟ چیریٹی کیا صرف آپ دے سکتی ہیں؟"
"شٹ اپ۔" اس کا پارہ شوٹ کر گیا۔
"جو آپ کر رہی ہیں، وہی میں نے کیا تو برا لگ گیا؟ کیوں؟" وہ سوالیہ نشان بنی اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں میں اک بھولا پن تھا، جیسے وہ سمجھ نہ پا رہی ہو کہ انوشے اتنا خفا کیوں ہو رہی ہے؟
"جو کام آپ کے لیے ثواب کا ہے، وہی میرے لیے بھی تو ہونا چاہیے۔ نہیں؟"
انوشے کو لگا شاید وہ لڑکی ناسمجھ ہے، بے عقل ہے، ابنارمل ہے۔
"تم حق دار ہو جبکہ میرے پاس سب کچھ ہے! میں تم سے کیسے کچھ لے سکتی ہوں۔" اس نے ایک لکیر کھینچ کر اپنا اور اس کا فرق واضح کر دیا۔
"اوہ۔" ابتہال کے لب گول ہوئے۔ "آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ تو حق دار ہوئی میں۔ اور کیا کیا دے سکتی ہیں آپ مجھے؟" اس نے یوں پوچھا جیسے زکواۃ، صدقات، تعاون جیسے تمام اصول و فرائض سے ناواقف ہو۔
انوشے سمجھ گئی وہ صرف سوال نہیں تھا۔
"جو میں دے رہی ہوں، اسے رکھ سکتی ہو۔" تحمل سے بولی۔
"جو میں دے رہی ہوں آپ بھی اسے رکھ لیں۔" اس نے پیسے آگے کر دیے۔
"منہ بند رکھو اپنا!" بہت ضبط کے باوجود بھی وہ اپنا لہجہ نرم نہ رکھ پائی۔
"میرا منہ تو بند ہی تھا، آپ نے ہی کھلوایا ہے۔!"
اسی پل بیرونی دروازہ کھول کر ثمرین باہر آئی تھی۔
"انوشے اندر آ جاؤ، امی بلا رہی ہیں تمہیں۔" ساتھ ہی اس نے اس کا بازو پکڑا تھا۔
"ایک سیکنڈ بھابھی۔ خالہ نے گھر میں ملازم ٹھہرا رکھے ہیں یا مالک؟ بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے اس لڑکی کو۔ میرے سامنے زبان چلا رہی ہے!"
"میرے تمیزدار یا بدتمیز ہونے سے آپ کو کیوں فرق پڑ رہا ہے۔"
"ہالہ۔" ثمرہ چچی کی آواز بلند ہوئی۔ "تم جاؤ یہاں سے!"
"جو آئے ہیں وہی جائیں، میں کیوں جاؤں۔" جھٹ سے بنچ پر بیٹھ گئی، پھر سے کتاب کھولی، قلم اٹھا لیا۔
ثمرہ نے انوشے کا بازو پکڑا اور اسے اندر لے گئیں۔
"یہ کس قسم کی میڈز ہیں؟ اکڑ اور غرور ختم ہی نہیں ہو رہا! مجھے پیسے دے رہی تھی۔ مجھے؟" اس کا غصہ کم نہ ہوا۔ بات عصمت بیگم، اور عظمیٰ سے ہو کر آخر میں شاہ زیب تک بھی پہنچ گئی۔
وہ کمرے میں آیا تو تاثرات میں خفگی تھی۔
"یہ پاگل پن ہے انوشے؟ کیوں کیا تم نے اس طرح؟"
انوشے صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ بجائے اس لڑکی کو کھری کھری سنانے کے۔ وہ الٹا اسے ہی سنا رہا تھا۔
"پاگل پن؟ ایک ملازمہ نے تمہاری بیوی سے بدتمیزی کی اور تم۔ تم مجھے جھاڑ رہے ہو!"
"تم اس کے پاس ہی کیوں گئیں؟"
"کیا مطلب کیوں گئیں؟ گھر ہے یہ میرا، ملازم ہیں وہ میرے۔ میں اسے پیسے دینا چاہتی تھی۔"

"مگر کیوں؟"
"یہ سوال آپ کر رہے ہیں؟ میں ہمیشہ چیریٹی کرتی ہوں۔"
"تم صرف چیریٹی نہیں کرتی ہو، تم چیرٹی کو اپنا ذاتی فعل سمجھتی ہو، انا کا مسئلہ بناتی ہو۔"
انوشے دم سادھے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"ایسا نہیں ہے شاہ زیب۔"
"اگر ایسا نہیں ہے تو بتاؤ...... جب صبح میرال نے تم سے پیسے نہیں لیے، تو کیا تک بنتی ہے اس کی بیٹی کو دینے کی؟"
"بیٹی؟" اسے شاک لگا۔ "ماں بیٹی ہیں دونوں؟"
وہ اپنے غصے پر قابو پاتا بیڈ پر جا بیٹھا۔
انوشے لب بھینچ کر ناراضی سے اسے دیکھنے لگی۔
"شاہ زیب! میری انٹنشن غلط نہیں تھیں، میں نے سب میڈز کو دیے ہیں پیسے۔"
"اپنی انٹنشز کی تو تم یہاں بات ہی مت کرو! اٹلی میں اس بندے نے تم سے پیسے نہیں لیے تو تم غصے سے پاگل ہوگئی تھیں۔ کوئی انکار کر دے تو کیوں تمہیں برا لگ جاتا ہے! ایک انسان تم سے کچھ لینا نہیں چاہ رہا تو کیا تم اسے زبردستی پکڑاؤ گی؟"
"انکار طریقے سے بھی کیا جا سکتا ہے، وہ لڑکی الٹا مجھے چیریٹی دے رہی تھی۔ وہ مجھے باتیں سنا رہی تھی"
شاہ زیب نے چونک کر سر اٹھایا۔
"بدتمیزی کر رہی تھی وہ مجھ سے، جیسے کوئی بدلہ اتار رہی ہو۔ کیا خالہ نے ملازمین کو ایسی چھوٹ دے رکھی ہے؟"
ذہن فقط اس ایک لفظ "بدلے" پر اٹک گیا۔ لمحے بھر کے لیے وہ اپنی جگہ تھم گیا تھا۔
شاہ زیب کو احساس ہوا معاملہ گڑبڑ ہو رہا ہے، اسے ادراک ہوا یہ وقت غصہ دکھانے کا نہیں۔ وہ اٹھ کر انوشے کے پاس آگیا۔
"دیکھو انوشے۔۔"
"اس لڑکی نے میری انسلٹ کی ہے، ایسے تو میں نہیں چھوڑوں گی، خالہ سے کہیں گھر سے نکالیں انہیں۔"
"انوشے یار کیا ہوگیا ہے۔"
"آپ کو بھی تو میں ہی غلط لگ رہی ہوں نا۔ پیسے دینے کیوں گئی؟ مجھے خالہ سے بات کرنی ہے۔ میں گھر میں ایسا ایٹیٹیوڈ برداشت نہیں کر سکتی۔"
"میں اماں سے خود بات کروں گا۔" کندھوں سے تھام کر اس نے نرمی سے سمجھایا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر چلی گئی۔

☆☆☆

رات کی تاریکی ہر سو پھیل چکی تھی، اپنے بستر میں دبک کر لیٹی، وہ فلیش لائٹ کی روشنی میں کتاب پڑھ رہی تھی، خاموشی میں الٹتے صفحات کی آواز ذرا سا ارتعاش پیدا کرتی اور پھر وہی انگیٹھی میں لکڑیوں کی چٹخنے کی آواز آتی۔
میرال نیچے کشن پر دوزانو بیٹھی اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بھڑکتی ہوئی آگ کو دیکھ رہی تھی۔ شعلے بلند ہو رہے تھے، تپش بڑھتی جا رہی تھی۔

ذرا سی کروٹ بدلتے اس نے کسی خیال کے تحت سر اٹھایا تو اسے ان شعلوں میں میرال کا پژمردہ چہرہ دکھائی دیا۔ یوں لگا جیسے وہ چہرہ جل رہا ہو۔

یکا یک دروازے پر دستک ہوئی۔

کتاب ایک جانب رکھتی وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ میرال نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے کروفر سے عصمت بیگم کھڑی تھیں۔ غصے سے بھنویں سکیڑے وہ اندر آئیں۔ انتہائی نفرت سے ابتہال کو دیکھا۔ پھر وہ میرال کی طرف مڑیں۔ وہ بولنا شروع ہوئیں تو اگلے پانچ منٹ تک مسلسل بولتی رہیں۔ شکایت اس کی تھی، غصہ میرال پر بھی تھا۔

"یہ تمیز سکھائی ہے تم نے اسے؟ چھوٹے بڑے کسی کا لحاظ رکھا ہے اس نے؟"

میرال نے کچھ بے بسی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ چہرے پر سکون لیے وہ پاؤں جھلاتی عصمت بیگم کو دیکھتی رہی۔

"تم نے وعدہ کیا تھا انوشے کے سامنے کوئی تماشا نہیں ہوگا، وعدہ کیا تھا تم نے مجھ سے۔" وہ میرال پر چیخ پڑیں۔

"اگر آپ کی لاڈلی بہو خود چل کر ہمارے پاس آئے گی تو ہم کیا کریں۔؟" ابتہال بول پڑی

"تم اپنا منہ بند رکھو۔" عصمت بیگم نے اسے جھڑک دیا۔

"ہالہ!" میرال نے خفگی سے ٹوکا۔ وہ کندھے اچکا کر کہیں اور دیکھنے لگی۔

"آخری بار کہہ رہی ہوں، انوشے کو شک بھی ہوا نا تو جان نکال لوں گی۔ تمیز سے رہا کرو اس کے ساتھ۔۔"

"آپ کی زبان میں تمیز سے رہنے کا مطلب اس کے پیسے لینا ہے تو سوری۔ یہ تمیز داری ہم سے نہیں ہو گی۔"

"ہالہ۔" اب کے میرال نے اسے کچھ سختی سے ٹوکا تھا۔ وہ ہنسنے لگی۔ عصمت بیگم آگ بگولا سی ہو گئیں۔

"پاگل ہو چکی ہے تمہاری بیٹی! پاگل!" اپنا سارا غصہ نکال کر وہ چلی گئیں۔

"پاگلوں کے گھر رہ رہ کر، ہو چکی ہوں پاگل!" وہ بلند آواز بولی۔

میرال بے بسی سے ابتہال کو دیکھ کر رہ گئی۔

☆☆☆

دلربا اور شاہزل کے مابین معاملات کافی حد تک بہتر ہو چکے تھے، لڑائی جھگڑے وہ ترک کر چکی تھی، گھر کے چھوٹے بڑوں کا احترام بھی کرنے لگی تھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شاہزل کا دل پھر سے جیتنے اور ماضی کی تمام تلخیاں مٹانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ روزمرہ کی بنیاد پر جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی رپورٹ، فیضان کو بھی دے رہی تھی۔

دردانہ اور سفیر نے اپنے بچوں کے ساتھ یورپ ٹور کا پلان بنایا تو شاہزل نے اس سے بھی بات کی۔

"شاہ زیب بھائی آئے ہوئے ہیں شاہزل، اماں مجھے کب سے کہہ رہی ہیں ہرنائی آ جاؤں لیکن میں ہی ٹالتی جا رہی ہوں......اوپر سے عنبرین کا نکاح بھی تو ہے۔" اس کی مجبوری سمجھ کر اس نے سفیر کو منع کر دیا۔ جس دن سفیر اور دردانہ اپنے بچوں سمیت ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے وہ بے حد خوش تھی۔

موقع پا کر اس نے اگلے چند دنوں میں ہرنائی جانے کا پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا تھا، اور یہ سب اس نے اس وقت طے کیا جب اسے یقین ہو چکا کہ شاہزل کاروباری مصروفیت کی بنا پر اس کے ساتھ جا نہیں سکے گا۔

شاہزل نے ہمیشہ اس کی مرضی کو فوقیت دی تھی، اب کی بار بھی انکار نہیں کر سکا۔ سب کچھ اس کی مرضی و منشاء کے مطابق ہو رہا تھا، اور وہ خوش تھی...... بے حد خوش تھی۔

☆☆☆

صبح سویرے ہی ارزا کے کمرے میں شور مچ گیا تھا، وہ روتی چیختی چلاتی جارہی تھی، شاہ زیب اور انوشے ڈر کر فوراً بھاگے چلے آئے تھے، ملازمہ نے عصمت بیگم کو خبر پہنچائی تو وہ بھی آ گئی تھیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر وارڈروب پر پڑی تو وجود ساکت ہو گیا۔ ارزا کی وارڈروب میں لٹکے ہوئے کپڑے خون سے سرخ اور پھٹے ہوئے لگ رہے تھے، قیمتی نفیس فراک کو قینچی سے کاٹا گیا تھا، اس پر سرخ خون بھی لگا تھا۔

ایک خوف کا سماں اس پورے کمرے میں بندھ گیا۔ سب کی سانسیں رک گئیں۔ ایسی حرکت، وہ بھی اس گھر میں بھلا کون کر سکتا ہے؟

انوشے پریشانی کے عالم میں روتی ہوئی ارزا کو چپ کروا رہی تھی۔ وہ بے تحاشا ڈری ہوئی تھی۔

"کس کی حرکت ہے یہ؟" شاہ زیب کو غصہ آ گیا۔ الماری کھول کر چیزیں الٹ پلٹ کیں تو ارزا کے استعمال کی بیشتر اشیاء کا یہی حال تھا۔

"کل رات جب میں بچوں کو سلا کر گئی تھی تب تو سب ٹھیک تھا۔" انوشے بے حد پریشان ہو رہی تھی۔

ذرا سی جانچ پڑتال سے اندازہ ہو گیا سرخ خون اصل میں سرخ رنگ ہے۔

"کس نے کیا ہے یہ؟" ارزا کو تکلیف میں دیکھ کر شاہ زیب بے چین ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا مجرم سامنے ہو اور وہ گولی مار دے۔ عصمت بیگم نے بڑی مشکل سے اسے ٹھنڈا کیا۔ سارا دن پریشانی میں گزرا۔ ارزا نے رو رو کر طبیعت خراب کر لی، بخار چڑھا لیا۔ شام میں جب ملازمہ اسے چائے دینے آئی تو وہ صوفے پر بیٹھا کچھ بے قراری سے پیشانی مسل رہا تھا۔

"صاحب ایک بات بتاؤں آپ کو؟" شمو نے کپ میز پر رکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہونہہ۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ مگ بھی اٹھا لیا۔

"صاب، مجھے معلوم ہے چھوٹی بی بی کے ساتھ جو ہوا۔"

شاہ زیب نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

"کیا معلوم ہے؟"

"کل رات مجھے ثمرہ باجی نے کام کے لیے بلایا تھا، تھکی ہوئی تھیں، بولیں ٹانگیں دبا دو۔ جب میں جانے لگی نا تو میں نے ہالہ کو ارزا کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔"

شاہ زیب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "ہالہ؟ ہالہ آئی تھی؟"

"جی صاب! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

"پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔" وہ بھڑک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"صاب میں ڈر گئی تھی، کوشش کی بتانے کی پر۔ وہ میں نے سوچا ہالہ بچی ہے، بس اسے بچانے کے چکر میں چپ رہی۔ پر اب مزید نہیں رہ سکتی! صاب پلیز میرا نام مت لینا!"

"تم جاؤ یہاں سے۔" شمو ادب سے سر خم کرتی چلی گئی۔

اپنی پیشانی کو مسلتے وہ کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ اسی وقت نیچے آ گیا تھا۔ ابتہال عصمت بیگم کے ساتھ بدتمیزی کر جاتی تھی وہ برداشت کر گیا تھا، انوشے کے ساتھ برا پیش آئی وہ یہ بھی سہہ گیا تھا مگر ارزا کے ساتھ جو ابتہال نے کیا تھا، وہ کسی طور بھی اب اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

پہلے اس نے میراں سے بات کرنے کی ٹھانی مگر وہ نیچے نہیں تھی۔ عصمت بیگم اس سے ارزا کا وارڈروب

سیٹ کروارہی تھیں۔ ملازمہ سے یہ بات پتا چلی تو وہ بھڑکتا ہوا سید ھا ارزا کے کمرے میں گیا، اور کپڑے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کھینچ لیے۔

عصمت بیگم بیڈ پر ارزا کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھیں، چونک گئیں۔

''میری بیٹی کے کمرے سے دفع ہو جاؤ۔''

میرال پریشانی سے دیکھ کر رہ گئی۔

''اماں! آج سے آپ میرال سے میرے بچوں کا کوئی کام نہیں کروائیں گی۔''

''کیا۔ کیا ہوا؟'' وہ سمجھ نہ پائیں۔ غالباً پریشانی کے عالم میں انہیں ذمہ دار کو پکڑنا، سمجھنا یاد ہی نہ رہا۔

''پوچھیے اس سے۔ اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر یہ کیا گل کھلا رہی ہے۔''

میرال کا سر بے اختیار میں نفی ہلا۔

''تمہاری بیٹی میری اولاد سے کیا دشمنی نکال رہی ہے؟''

آنکھوں میں صدمہ بے یقینی لیے وہ شاہ زیب کو دیکھتی رہ گئی۔ ''ہالہ ایسا نہیں کر سکتی۔''

''وہ بدتمیزی کر سکتی ہے، گھر والوں سے لڑ سکتی ہے، سکون برباد کر سکتی ہے، لیکن نقصان نہیں پہنچا سکتی۔'' وہ چیخ پڑا۔ بلند آواز کا وہ جملہ میرال اسفند کو دہلا گیا۔

''کل رات وہ اس کمرے میں آئی تھی، اس نے کیا ہے یہ سب......''

''اللہ کی مار پڑے تم دونوں پر، ایسے ہتھکنڈوں پر آ گئی ہو تم، بچی سے کیا دشمنی؟ ہاں؟ ہم بڑے مر گئے ہیں؟ جو وار کرنا ہے سامنے سے کرونا۔''

میرال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اب دفع ہو جاؤ میری بیٹی کے کمرے سے۔ آج کے بعد میں تمہیں اپنی بیوی بچوں کے آس پاس بھی نہ دیکھوں!''

کس قدر ہمت اور قوت سے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالے وہ کمرے سے باہر آ گئی۔ مگر ریلنگ تک پہنچتے پہنچتے لڑکھڑا گئی، اس نے بے اختیار دیوار کا سہارا لیا۔ اور سانس لینے کی کوشش کی۔ مگر اس پل اسے احساس ہوا، اسے سانس نہیں آ رہا۔

شگو ٹرے ہاتھ میں لیے انوشے کے کمرے سے نکل کر اس طرف آ رہی تھی رک گئی، بھاگی چلی آئی۔

''کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟''

اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ آنسو صاف کرتی نیچے آ گئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ ابتہال اسکول سے ابھی نہیں آئی تھی۔

''میرال! تجھے ثمرہ باجی بلا رہی ہیں۔'' ایک نیا حکم صادر ہوا تھا۔ وہ تھکے ہارے وجود اور جھکے کندھوں کے ساتھ واپس مڑ گئی۔

☆☆☆

''شاہ زیب صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔''

شام میں شگو نے آ کر کہا۔

وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ بیٹھی رہی، ذہن اس حکم کو تجزیہ کرنے میں لگ گیا کہ شاہ زیب نے اسے بلایا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی، پورے کمرے کا چکر کاٹ کر واپس بیٹھ گئی۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ شگو واپس آ گئی۔

''سنا نہیں، صاحب تمہیں بلا رہے ہیں!''

''صاحب نے کوئی خاص بات کرنی ہے تو ان سے کہو یہاں آ کر کر لیں۔''
شگو کی آنکھیں ابل آئیں۔ ''بدتمیز۔ یہ بات صاحب سے کرتے میں اچھی لگوں گی؟''
''مجھے تو لگو گی۔''
شگو نے دروازے میں کھڑے کھڑے اسے لمبی گھوری دی۔ ''دیکھ ہالہ۔ اب تو نا بہت اوور ہو رہی ہے اس گھر میں..... جب تجھے سب پتا ہے تو پھر کیوں ایسا کر رہی ہے۔''
''میں نے کیا کیا ہے؟'' اس نے لاپروائی سے پوچھا۔
''باپ ہے تیرا۔ اب بلا رہا ہے تو جانا تو بنتا ہے نا۔'' اس نے اپنے صاحب کی کسی بھی ڈانٹ سے بچنے کے لیے اسے راضی کرنا چاہا۔
''ہا۔ شگو!'' وہ ہنسی۔ ہنستے ہوئے اس کے دونوں گالوں پر گڑھے پڑ گئے۔ ''یہ وہی باپ ہے نا جس نے میرا ڈی این اے ٹیسٹ کروایا تھا؟''
''او کی ہوندا اے!؟'' شگو نے اپنی چھوٹی آنکھیں مزید چھوٹی کر کے پوچھا۔
''وہ ایک امتحان ہوتا ہے جسے پاس کرنے سے اولاد جائز یا ناجائز ثابت ہوتی ہے۔''
شگو کا ایک ہاتھ کمر پر، دوسرا ہاتھ منہ پر آ ٹھہرا۔
''ہیں؟ سچی؟ پر مجھے کیوں ٹی کسی نے بتایا؟'' وہ یوں بولی جیسے اس گھر کا کوئی اہم فرد ہو، جس کے علم میں یہ بات نہ لا کر کوئی انہونی کر دی گئی ہو۔ ''اور تجھے کیسے پتا؟'' ذرا مشکوک ہو کر گھورا۔
''بس پتا ہے، اب جاؤ یہاں سے۔''
''صاحب بہت غصے انچ لگ رہا ہے، خالی ہتھ گئی تو کٹ نہ پے جائے۔'' وہ بڑی فکر مند نظر آئی۔
''اتنی بڑی ہو شگو، کیسی بھیگی بلی بنی ہوئی ہو، سیدھی طرح سے کہہ دو صاحب میں نے بہت بولا ہے پر نہیں آ رہی۔ بس۔''
''تو نا کسی دن مار پڑوائے گی مجھے، اب مسئلے تم لوگوں کے اور پسیں ہم۔'' شگو بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ ٹانگیں لٹکائے بستر پر نیم دراز ہو کر اب تال سیلنگ پر لگے ساکت پنکھے کو دیکھنے لگی۔ گرمیوں میں یہ منظر کچھ دلچسپ لگتا تھا جب پنکھا گول گول گھومتا تھا۔ مگر اب تو نری بوریت۔ انگیٹھی بھی سرد تھی ورنہ وہ شعلوں کی لپک جھپک ہی دیکھ لیتی۔
ٹی وی تھا نہیں، موبائل رکھنے کی ممانعت۔ ممانعت نہ بھی ہوتی تو رکھنے کی اہلیت نہیں تھی۔ پیسا نہ کبھی اس کی ہتھیلی پر رکھا گیا تھا، نہ ہی میرال کی ہتھیلی پر۔ یونیفارم، کتابیں، کورس، کاپیز اور بیگ اسے اسکول سے ملتا تھا۔ گھریلو استعمال کے کپڑے درفشاں اور ثمرہ چچی کی جانب سے ہر چند ماہ بعد مل جاتے تھے، کھانا پینا وہی جو کچن میں سب کے کھانے کے بعد بچ جاتا تھا، اور بعض دفعہ بچتا بھی نہیں تھا۔
فریج سے کچھ نکالنے کی، یا کچن میں جا کر اپنی مرضی سے کچھ بھی کھانے کی اجازت نہیں تھی۔
رہائش کے لیے یہ ایک کمرہ اور چھوٹا سا واش روم تھا جو عصمت بیگم نے کوارٹر میں اپنے ملازمین کی رہائش کا بندوبست کرنے کے بعد ان کے لیے اپنے شوہر کی وفات کے بعد بنوا دیا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ باہر لان میں اور دوسرا کچن کے برابر والی راہداری میں کھلتا تھا تا کہ جب بھی اسے کام لے لیے بلایا جائے تو ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ ہو۔ اور تاخیر عصمت بیگم کو پسند نہ تھی۔
وہ ساکت پنکھے کو دیکھتے ٹانگوں کو جنبش دے رہی تھیں جب دروازہ کھل گیا تھا۔ پہلے وہ کہنی کے بل اوپر ہوئی تا کہ جھاڑ پلا سکے اس بدتمیز کو جس نے دستک دینے کی بھی زحمت نہ کی۔ مگر شاہ زیب پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھی ہو

بیٹھی۔
سفید تھری پیس سوٹ کے ساتھ سرخ ٹائی نمایاں تھی، بال جیل سے جمے ہوئے، داڑھی بھی سیٹ تھی، اس کے مہنگے نفیس کپڑوں سے مردانہ کلون کی مہک اٹھ رہی تھی۔
ابتہال نے لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ اندر تک دبالی۔
کمرے میں نگاہ دوڑاتے شاہ زیب دروازے میں ہی کھڑا رہا، اندر نہ آسکا۔
وہیں کھڑے اس نے اندر نگاہ دوڑائی۔ دو بستروں کے علاوہ ایک چھوٹی سی میز اور کرسی کے ساتھ ایک پرانی الماری جس کے پٹ ٹوٹے ہوئے تھے، فرش پر ایک انگیٹھی رکھی تھی جس میں لکڑیوں کی راکھ سرد پڑ چکی تھی۔ بالکل اس کے دل کی طرح۔
جس طرح سے شاہ زیب نے ناک سکوڑی تو اسے یوں لگا جیسے اسے کمرے سے بدبو آئی ہو۔ قدم بھی اس نے وہیں روکے۔ ہاتھ کو ناک تک رکھا۔ ابتہال یک ٹک اسے دیکھے گئی۔
اسے بدبو کس شے سے آئی تھی؟ اس کمرے سے یا ابتہال سے؟ کمرہ تو میرال روز صاف کرتی تھی، تو کیا یہ اشارہ اس کے وجود کی طرف تھا؟
یہ طے تھا شاہ زیب اس کمرے میں داخل نہیں ہوسکتا۔ وہ کمرہ اس کے شایانِ شان نہیں تھا، نہ ہی وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی قیمتی نفیس کرسی رکھی گئی تھی۔ وہ کمرہ ایک کباڑ تھا جہاں صرف ٹوٹی ہوئی، ردی ہوئی اشیاء ہی رکھی گئی تھیں۔ ایسی اشیاء شاہ زیب کے لیے نہیں ہوسکتی تھیں۔
ابتہال بھی اس لمحے ٹوٹے فرنیچر، اکھڑی ہوئی دراز، اور پھٹی ہوئی قالین جیسی تھی۔ بے سہارا، بے وقعت۔
"باہر آجاؤ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں!" لب بھینچ کر، غصہ دبا کر کہا گیا۔
"بات آپ نے کرنی ہے تو میں باہر کیوں چلی آؤں؟"
شکور ابداری کے دوسری جانب دیوار کی اوٹ میں دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کھڑی تھی۔ شاہ زیب نے اپنا سارا غصہ اس پر نکال دیا تھا، ڈانٹ پھٹکار کر اب وہ خود ابتہال کے پاس آیا تھا۔
کیا اسے میرال کو بتانا چاہیے؟
میرال اوپری منزل پر کمرے کی صفائی کررہی تھی۔
"کیا کرنا چاہیے؟" اس نے نچلا لب کاٹا۔ بھلا میں کیوں پرائے پھڈوں میں پڑوں؟
"ازرا کے کمرے میں تم گئی تھیں؟"
"آپ سوال کررہے ہیں یا بتا رہے ہیں؟"
"یہ تمہارا کارنامہ ہے نا!"
اس نے کچھ کپڑوں سے بھرا ہوا شاپر سامنے فرش پر الٹا دیا،
کپڑے کٹے ہوئے، سرخ رنگ میں رنگے ہوئے، پھٹے ہوئے۔
"یہ اس کی الماری سے ملے ہیں۔"
"تو؟"
"پہلے تم نے اماں سے بدتمیزی کی، پھر الوشے سے کی، اور اب ازرا۔ تم اور تمہاری ماں۔" شاہ زیب کے لہجے سے اب نفرت جھلک رہی تھی۔ "اب کیا کرنا چاہ رہی ہو؟"
"جب آپ کو اتنا کچھ پتا ہے تو یہ بھی بتادیں۔" وہ مسکرائی۔
"میری بیٹیوں کو کچھ ہوا تو......"

''آپ باپ ہیں؟'' وہ حیران ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ''آپ کی بیٹیاں بھی ہیں؟! آپ نے انہیں ساتھ رکھا ہوا ہے؟ کہیں پھینکا بھی نہیں؟''

شاہ زیب کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس کی پیشانی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ ابتہال کا چہرہ دیکھتے اسے اپنے والد کی آواز سنائی دی تھی، ان کا فیصلہ، ان کی نفرت دکھائی دی تھی۔

''کوڑے دان میں کچرے کو پھینکا جاتا ہے۔''

ابتہال شاہ زیب کا پورا وجود اس ایک لمحے کئی پرچوں میں بٹ گیا۔

وہ اس کا باپ تھا۔ یہ الفاظ اس کے تھے۔

''تب ہی میں کہوں آپ کو اس کمرے سے بو کیوں آئی ہے۔'' وہ ہنسی۔

''تمہیں تمہاری ماں نے پاگل کر دیا ہے۔''

''آپ کو آپ کی ماں نے نہیں کیا؟''

شاہ زیب نے پہلے صرف سن رکھا تھا ابتہال جواب کیسے دیتی تھی، آج سن رہا تھا تو وجود شعلوں میں جلنے لگا۔

''تم میں اتنی ہمت۔ اتنی جرات کہ تم اس طرح کے الفاظ ادا کرو۔'' شاہ زیب کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔

''شکر کریں، صرف لفظ ادا کر رہی ہوں، ورنہ ادا کرنے کو ابھی اور بھی بہت کچھ باقی ہے!''

شاہ زیب کو لمحے بھر کے لیے لگا، ابتہال نہیں میرال بول رہی ہے، وہ آواز، وہ چہرہ اور انتقام کی آگ۔۔

وہ اس کے قریب آ گئی۔ پھر دو قدم مزید اٹھائے، پھر ناک سکیڑ کر شاہ زیب کو ویسے ہی دیکھا جیسے اس نے اس کمرے کو دیکھا تھا۔ جیسے اسے بدبو آ رہی ہو۔

''دو بیٹیاں ہیں!! دو بیٹیاں ہیں آپ کی۔'' اس نے جیسے خود کو سنایا، کچھ سمجھایا۔ ''آپ کا قرض چکانے کے لیے آپ کی اپنی اولاد ہے۔ شکر ہے میں نہیں ہوں!''

شاہ زیب کے وجود میں بھڑکتی ہوئی آگ اس ایک لمحے میں سرد پڑی، آنکھیں پتھر، وجود ساکت ہو گیا۔ وہ جملہ تھا ہی ایسا۔۔

''اچھا ہوا آپ کمرے میں نہیں آئے! آ جاتے تو دیوار ٹوٹ جاتی، فرق ختم ہو جاتا!''

اس نے پھر دروازہ بند کر دیا۔

''تمہیں پتا بھی ہے یہ کتنا بڑا گناہ ہے، کتنی بڑی سزا ہے اس کی!'' بدرزمان صاحب کی آواز اس کے کانوں میں زور سے گونجی تھی۔ یوں لگا جیسے راہداری میں وہیں کھڑے ہو کر وہ اس پر برس پڑے ہوں۔ اقرا اور یمنی کا چہرہ آنکھوں میں آ گیا۔ گزشتہ چودہ سالوں میں اس نے ایک بار بھی وہ نہیں سوچا تھا جو آج ابتہال نے اسے سنا دیا تھا، وہ آئینہ نہیں دیکھا تھا جو ابتہال نے دکھا دیا تھا۔ تصویر ایک ہی تھی جو تھما دی گئی تھی، رخ ہزار ہو سکتے تھے۔ بےشمار ہو سکتے تھے۔

☆☆☆

شاہ زیب کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک اپنی جگہ کھڑی رہی تھی، پھر اس نے کپڑوں کو غصے سے الٹا پلٹا کر دیکھا، پھٹے ہوئے، کٹے ہوئے حصوں کو چھوا۔

اس کی آنکھوں میں امڈتا غصہ یکا یک شدید حیرت و بےیقینی میں بدل گیا۔

وہ صدمے سے اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

رات کا سارا کام ختم کر کے وہ اپنے کمرے میں آئی تو ابتہال کھڑکی کے پاس بیٹھی چوکھٹ پر موم بتیاں جلا رہی تھی۔ ایسی کئی موم بتیاں اس نے رائٹنگ ٹیبل پر بھی جلا رکھی تھیں۔

میرال اس کے سامنے والے بستر پر آبیٹھی۔ کچھ دیر تک آنکھوں میں نمی لیے وہ نچلا لب کاٹتی رہی۔ ابتہال کو علم تھا وہ کمرے میں آچکی ہے، تب بھی اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کی موم بتیاں اہم تھیں، روشنی اہم تھی۔ اور خاموشی بھی جسے وہ توڑنا نہیں چاہتی تھی۔

''تمہارے پاس بھی کوئی آیا تھا؟''

ابتہال نے لائٹر سے ایک ساتھ تین موم بتیوں کو جلا دیا۔

''ہاں۔ کوئی کوڑے دان کو دیکھنے آیا تھا۔''

میرال کی نگاہیں اس کی پشت پر جمی رہیں۔ آنسو بہتے رہے، لب لرزتے رہے۔

''پھر۔'' اس کا دل بہت بھاری ہو رہا تھا۔

''لیکن بدبو اس سے آرہی تھی۔ شکر ہے وہ کمرے میں نہیں آیا!''

''ش۔ شاہ زیب آیا تھا؟'' اس کی سانسیں اٹک گئیں۔ جانے اس نے کیا کہا ہوگا۔ ابتہال نے اس کا سامنے کیسے کیا ہوگا؟

ابتہال منتظر رہی کب میرال بھی جرم کا ذکر کرے، سزا کی بات کرے اور ناراضی دکھائے مگر اس نے ایک بار بھی یہ نہیں پوچھا ہالہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ صبح سے شام تک وہ یہ سوال عصمت بیگم، ثمرہ چچی اور عظمیٰ بھابھی سے سن چکی تھی۔ سوال کے ساتھ ایک طویل لیکچر اور ڈانٹ وہ ان تینوں سے سن چکی تھی۔

''مجھے ایک بات تو بتائیں!'' اس نے ذرا سی گردن موڑی۔ ''جب اس نے ابارشن کا کہا تو آپ نے کیوں نہیں کروایا؟''

وہ سن ہوتے وجود کے ساتھ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کیا اس نے شاہ زیب کے ساتھ ہونے والی وہ گفتگو سن لی تھی؟

''محبت، گھر سے بھاگنا، نکاح۔۔ باقی سب کچھ تو اس کی مرضی سے کیا تھا ناں آپ نے۔ پھر یہاں کیوں اپنی من مانی کرلی؟''

میرال کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''اگر میں اس دنیا میں نہ آتی تو آپ کے بہت سے مسئلے حل ہو سکتے تھے، میرا اینڈ کر کے آپ اپنی زندگی چن سکتی تھیں۔ پھر آپ نے مجھے کیوں چنا، اور چن کر یہ زندگی کیوں دی۔''

میرال کی سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ اٹھ کر الماری کی طرف چلی گئی۔ مگر کان نہ بند کر سکی۔

''شاہ زیب اور آپ میں کوئی فرق ہے؟ مجھے تو نظر نہیں آیا۔''

''ہالہ پلیز!'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔

''مجھے آپ پر ترس نہیں آتا، مجھے آپ سے بہت نفرت ہو رہی ہے۔ شاہ زیب سے بھی زیادہ!!'' سناٹے میں وہ آواز گونج کر خاموش ہوگئی۔ میرال خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ کافی دیر بعد اس نے رخ بدلا تو ابتہال چوکھٹ پر بازو پر اپنا سر رکھے موم بتیوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ سب ایک ساتھ پگھل رہی تھیں۔ وہ چار جنہیں اس نے ایک ساتھ جلایا تھا۔

☆☆☆

زلیخا پھپھو اپنے بچوں کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے گھر آئیں تو مصروفیت مزید بڑھ گئی۔ زلیخا کا بڑا بیٹا عادل اٹھارہ برس کا تھا، روحان اور سمیر سولہ برس کے۔ تینوں کی بڑی گاڑھی چھنتی تھی، دور رہتے تو موبائل پر ہر وقت رابطے اور قریب ہوتے تو پھر گاڑی کی چابی ہتھیائے پورا ایبٹ آباد گھومتے رہتے، ان چند دنوں میں دو چکر اسلام آباد کے بھی انہوں نے لگا لیے تھے۔ گھر کی خواتین جہاں شاپنگ میں مصروف تھیں وہاں لڑکے اپنی حرکتوں میں۔

ابتدائی کچھ دنوں تک تو اس کی دونوں سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی مگر چوتھے روز جب وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی تو عادل کی نظر اس پر پڑی۔ گاڑی گھر کے سامنے پارک کیے وہ تینوں باہر نکلے ہوئے تھے، اور کسی بات پر سمیر اور روحان کی ہاتھا پائی ہو رہی تھی، قہقہے گونج رہے تھے۔

عادل کی نگاہ جو اس پر ٹھہری تو پھر ہٹ نہ سکی۔

''یہ وہی ابتہال ہے؟ ماموں کی بیٹی؟'' اس نے کچھ بے یقینی سے پوچھتے سمیر سے تصدیق چاہی تھی۔ تین سال پہلے جب وہ ملا تھا تو اس وقت وہ گیارہ سال کی چھوٹی سی بچی لگی تھی مگر اب تو پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

''ہاں وہی ہے۔''

روحان بھی رک گیا۔

وہ چپ چاپ ان کے قریب سے گزر کر اندر چلے جانا چاہتی تھی مگر عادل نے راستہ روک لیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ہی جست میں اس کی پونی کھینچی تھی، بالکل ویسے جیسے وہ ہر بار یہاں آنے پر کھینچا کرتا تھا۔

سی کی آواز کے ساتھ وہ ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ داہنا ہاتھ سر تک اٹھا اور دوسرے ہی پل اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا تھا۔

عادل کا قہقہہ بلند ہوا۔

''گائیز! اس لڑکی نے مجھے چھوا ہے، مجھے ہراسمنٹ کا کیس کرنا چاہیے!''

تینوں کے قہقہے بلند ہوئے۔

اس نے نفرت بھری نگاہ ان تینوں پر ڈالی اور اندر چلی گئی۔ دل میں آگ سی جل رہی تھی، غصہ شدید ہو رہا تھا۔

اسے مزید چھیڑنے کا ارادہ کیے وہ تینوں اس کے پیچھے اندر آ گئے تھے۔

سامنے ہی لان میں عادل کی بہن مدیحہ درفشاں کے ساتھ کھڑی تھی۔

اور لان چیئرز پر عظمیٰ تائی، زلیخا پھپھو کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔

''عادل بھائی نے میرے بال کھینچے ہیں۔'' زلیخا پھپھو کے سر پر کھڑی وہ شدید غصے میں بولی تھی۔

''تو کیا ہوا؟'' زلیخا نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''بھائی ہے، مذاق کرتا رہتا ہے!'' انہیں ہرگز برا نہ لگا۔ برا لگا تو بس یہی کہ وہ ان کے پاس کیوں کھڑی ہے۔ عظمیٰ تائی نے کچھ ناگواری سے پہلو بدل کر نگاہ ہٹا لی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

راشدہ رفعت

عیدی

''ہاں بیگم صاحبہ، بتائیں عید کی تمام شاپنگ مکمل ہوگئی یا کچھ خریدنا باقی ہے؟'' رات گئے عمیر خرچے کا حساب لکھ رہا تھا تب کومل سے دریافت کیا۔

''شکر ہے، سب کچھ ہوگیا۔ بس آپ کا اور حاتم کا سوٹ درزی سے اٹھانا ہے۔ اس کی سلائی باقی ہے۔'' کومل نے جواب دیا تو عمیر سر ہلا کر لکھنے لگا۔

''بس اب عیدی کا خرچا بچا ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ بھی نمٹ ہی جائے گا۔'' عمیر نے ڈائری بند کرکے ایک طرف رکھی۔

''ویسے میں سوچ رہی ہوں ہم ہر بار سب بچوں کو سو، سو روپے عیدی دیتے ہیں۔ بچے اب بڑے ہو رہے ہیں سو روپے کی تو کوئی اوقات ہی نہیں اس سے پہلے ثاقب بھائی، سدرہ باجی یا میرے بہن بھائیوں میں سے کوئی عیدی کی رقم بڑھائے، ہم ہی پہل نہ کردیں۔ سب بچوں کو دو، دو سو روپے دے دیتے ہیں۔'' کومل نے تجویز دی۔

''دو، دو سو؟ یار سوچ لو عیدی کا خرچا دگنا ہو جائے گا۔ پہلے ہی کھینچ تان کے عید کی شاپنگ کا مرحلہ بھگتایا ہے۔''

''ہاں کہہ تو صحیح رہے ہیں۔ تین بچے ثاقب بھائی کے، چار سدرہ باجی کے اور میری تینوں بہنوں اور دو بھائیوں کے کل ملا کر سولہ بچے تو یہ ہوئے کل تئیس بچے اور اگر جو آپ کے دو، تین دوست بچوں سمیت عید ملنے آگئے تو پانچ چھ بچے مزید شامل کر لیں۔ سیدھے سیدھے تیس بچوں کا حساب لگائیں تو تین ہزار روپے، لیکن اگر فی بچہ دو، سو روپے دیں تو چھ ہزار تو صرف بچوں کی عیدی بنے گی۔'' کومل نے تفکر بھرے لہجے میں خود کلامی کی۔

''جی جناب، یہ تو ہوئے دوسروں کے بچے۔ ہمارے تینوں بچوں نے مجھ سے پہلے ہی وعدہ لیا ہے کہ اس بار انہیں پانچ، پانچ سو روپے عیدی دوں گا۔'' عمیر نے مسکرا کر بتایا۔

''اور آپ نے جھٹ وعدہ کرلیا۔ اتنی مطلبی اولاد ہے آپ کی، اگر کسی آئے گئے کو عیدی دینے کے لیے ان کی عیدی میں سے دو چار سو روپے مانگ لوں تو واپسی کے لیے اگلی صبح کا انتظار نہیں کرتے۔ رات کو جب اپنے اپنے پیسوں کا تخمینہ لگا رہے ہوتے ہیں تو مجھ سے پیسے واپس لے کر اپنی گنتی پوری کرکے ہی دم لیتے ہیں۔''

کومل کو اپنے چالاک بچوں پر غصہ آیا تھا۔ عمیر اس کی بات سن کر کھل کر ہنس پڑا۔

''تو یار! اسی لیے تو کہتے ہیں کہ عید صرف بچوں کی ہوتی ہے۔ ہم بھی تو اپنے بچپن میں یہ ہی کرتے تھے۔ آدھی سے زیادہ عیدی کھا پی کر اڑا دیتے تھے اور جو بچتی تھی۔ وہ گلے میں ڈال دیتے تھے۔ میں نے تو جب بھی اپنا کرکٹ کا بلا خریدا، عیدی کے پیسوں سے ہی خریدا۔''

''ہاں اور ہمیں اس وقت عیدی ملتی بھی کتنی تھی زیادہ سے زیادہ دس روپے۔'' کومل کو بھی بیتا زمانہ یاد آیا۔

''ہاں تو بیگم صاحبہ، یہ تو ہمارے بچوں کے ساتھ ظلم ہوا ناں۔ اس وقت کے دس روپوں کی وقعت آج کے سو روپوں سے کہیں زیادہ تھی۔ بس طے ہوا اس بار فی بچہ دو، دو سو تقسیم کیے جائیں گے۔''

عمیر نے فوراً فیصلہ کر ڈالا۔ کومل کو اس کی یہ عادت بیک وقت اچھی بھی لگتی تھی اور بری بھی۔ اس کے ہاتھ میں پیسے ہوں نہ ہوں، وہ کنجوس یا تنگ دل نہیں تھا۔ اپنی کوئی ضرورت پس پشت ڈال کر بچوں کے لیے فراخ دلی سے خرچ کرنے کا عادی تھا۔ عیدی تو خیر اپنے یا کومل کے بھائی بہنوں کے بچوں کو ہی دی جاتی تھی لیکن یہاں بھی، وہ کھلے دل سے ہی خرچ کرتا اور کبھی ادلے بدلے کا خیال دل میں نہ لاتا۔

ان کا حال دوسرے متوسط گھرانوں سے مختلف نہ تھا۔ ہر مہینے آمدنی اور اخراجات کو توازن میں رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ رمضان کے مہینے میں اخراجات کا گراف خاصا اوپر چلا جاتا۔

سحر و افطار کا اہتمام، عید کی تیاریاں، نیکے اور

سسرال والوں کو دی جانے والی دو علیحدہ افطار پارٹیاں اور جب یہ سب نمٹ جاتا تو عیدی دینے دلانے کا مرحلہ۔ کومل سارا سال گھر کے خرچے میں سے جو رقم پس انداز کرتی وہ ان ہی دو موقعوں پر کام آتی۔

عیدالفطر کے خرچے نمٹا کر جب، عمیر کی جیب خالی ہوتی تو اس کی اگلی تنخواہ آنے تک گھر کا خرچا اس بچت سے چلتا یا پھر عید قربان پر بڑے جانور میں حصہ لیتے وقت، جو کمی بیشی ہوتی وہ کومل اپنے خفیہ اکاؤنٹ سے پورا کرتی۔

اس بار کومل کے تفکر کی بڑی وجہ، یہ ہی تھی کہ اس کے خفیہ بچت اکاؤنٹ میں رقم نہ ہونے کے برابر تھی۔ حاتم اور روشین نے اس بار اکیڈمی جوائن کی تھی، ان کی ٹیوشن فیس دینے کے بعد ماہانہ اخراجات میں سے بچت ممکن ہی نہ تھی۔ اس نے عمیر کو بھی پہلے ہی باور کروادیا تھا کہ اس بار وہ عید کے بعد گھر کے اخراجات کے لیے کوئی عملی مدد نہ کر پائے گی۔

''اللہ مالک ہے یار، دیکھی جائے گی۔ کسی سے ادھار پکڑ لیں گے۔'' عمیر نے اسے حوصلہ دیا۔

''ادھار کا سوچیے بھی مت، جیسے تیسے کر کے مہینہ پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔'' کومل کی ادھار کے لفظ سے بھی جان جاتی تھی۔

''فکر مت کرو۔ اپنے بچوں سے ادھار مانگ لوں گا۔ تم پر بھروسا نہیں کرتے۔ مجھ پر پورا بھروسا ہے انہیں۔ بلا جھجک اپنی عیدی مجھے لا تھمائیں گے اور میں تنخواہ ملنے کے بعد انہیں لوٹا دوں گا۔'' عمیر کے کہنے پر وہ مسکرا دی آئیڈیا برا نہ تھا۔

☆☆☆

اور یوں ہی جوڑ توڑ کرتے کرتے عید کا دن بھی آن پہنچا، عمیر اور حاتم عید کی نماز پڑھ کر گھر لوٹے تو کومل اور دونوں بچیاں تیار تھیں۔ بچوں نے حسب معمول ماں باپ کو عید مبارک کہہ کر عیدی کا مطالبہ کیا۔

''یار! ایسا ہے کہ تم نے پانچ، پانچ سو کا مطالبہ کیا تھا۔ ہماری گنجائش نہیں بن رہی یوں کرو، تم تینوں مل کر پانچ سو لے لو۔''

عمیر نے بچوں کو چھیڑا۔ بچے یہ فاؤل ہے پاپا جی، کہہ کر چیخنے لگے۔

''لائیں بھئی بیگم صاحبہ، ہمارے بچوں کے لفافے۔'' عمیر نے مسکرا کر کومل کو مخاطب کیا۔

اس بار بچوں کو عیدی ہاتھ میں پکڑانے کے بجائے دیدہ زیب لفافوں میں پیش کی جارہی تھی۔ یہ لفافے کومل نے خود تیار کیے تھے۔ شادی سے پہلے وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں دو، تین سال آرٹ ٹیچر کے طور پر پڑھاتی رہی تھی اور اب تک یہ آرٹ ورک کسی نہ کسی طور جاری ہی تھا۔ بچوں نے لفافے کھول کر دیکھے پھر خوشی کے مارے ماں، باپ سے لپٹ گئے تھے۔

''چلو تمہاری کمائی تو شروع ہوئی۔ اب فوراً تایا کے گھر چلو وہ منتظر ہوں گے۔'' عمیر نے بچوں کو مخاطب کیا۔

''جی جناب، پھر ان کی کمائی میں تو برکت ہوتی جائے گی اور آپ کی جیبیں خالی ہوتی جائیں گی۔'' کومل مسکرائی۔

''آج کا دن صرف انجوائے کرو یار۔ یہ جوڑ توڑ تو سارا سال چلتا ہے۔'' عمیر بھی مسکرایا۔

اب معمول کے مطابق، انہوں نے ثاقب بھائی کے گھر جانا تھا عمیر کے بڑے بھائی یعنی کومل کے جیٹھ۔ دو گلی چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ دونوں بھائیوں کے گھرانوں کے مثالی تعلقات تھے۔

ثاقب اور عمیر تو چلو سگے بھائی تھے فرح بھابھی اور کومل کی بھی آپس میں بہت دوستی تھی۔ ہر سال عید پر یہ ہی معمول ہوتا کومل، عمیر اور بچے ثاقب بھائی کے گھر عید ملنے جاتے، اور پھر دونوں فیملیز مل کر عمیر کی بڑی بہن سعدیہ باجی کے گھر جاتے وہاں عید مل کر فرح بھابھی اپنے میکے تو کومل عمیر اور بچے کومل کے گھر کا رخ کرتے۔

دوپہر کی دعوت، وہاں ہوئی کومل کے سب بہن بھائی اکٹھے ہوتے۔ رات کو ایک بار پھر ثاقب بھائی کے گھر جانا ہوتا۔ یہ عید کی خاص ون ڈش پارٹی ہوتی۔ کومل کے ہاتھ کا یخنی پلاؤ، ثاقب بھائی کو بہت پسند تھا تو فرح بھابھی کی چکن ہانڈی کے کومل کے بچے دیوانے تھے، کومل یخنی پلاؤ اور شامی کباب بنا کر لے جاتی۔ فرح بھابھی کڑاہی اور فروٹ ٹرائفل بنا لیتیں اور یوں اپنوں کے سنگ یادگار سی عید پارٹی منائی جاتی۔

کومل، عمیر اور بچے ثاقب بھائی کے گھر کے لیے نکلنے ہی والے تھے کہ نوری اپنے بچوں کے ساتھ عید ملنے آ گئی۔ دو برس پہلے تک نوری یہاں کپڑے دھونے آتی تھی۔ کومل نے قسطوں پر آٹومیٹک واشنگ مشین خرید لی تو نوری نے بھی کسی اور گھر کا کام پکڑ لیا اب بھی وہ مہینے، دو مہینے بعد ملنے آتی تھی۔

اس نے یہاں کئی برس کام کیا تھا اور فریقین کو کبھی ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی ان خوش گوار تعلقات کی وجہ سے ہی وہ، کومل باجی کو سلام کرنے چکر لگا لیتی تھی۔ اس بار اس کا چکر بہت دنوں بعد لگا تھا۔

''عید مبارک ہو باجی۔'' اس نے کومل کو مخاطب کیا تو کومل بھی اسے پرتپاک انداز میں گلے لگا کر عید ملی تھی۔

''ثاقب بھائی ہور کے جا رہے ہو آپ۔'' نوری نے یہاں برسوں کام کیا تھا سو ان کی روٹین سے آگاہ تھی۔

''فرح باجی کو میرا بھی سلام کہنا۔ میں پھر آؤں گی فرصت سے ملنے۔'' چونکہ نوری نے ان سب کو پورچ میں ہی کھڑا پایا تھا سو رکنا مناسب نہ لگا۔

''بچے ٹھیک ہیں تمہارے، یہ گڈو نے تو ماشاء اللہ خاصا قد نکال لیا ہے۔''

کومل نے اس کے ساتھ کھڑے گڈو کو مسکرا کر دیکھا۔ گڈو شرما کر مسکرا دیا تھا۔ اس کے چاروں بچوں کے کپڑے بھلے سے نئے نہ تھے لیکن دھلے، دھلائے اور استری شدہ تھے۔ لڑکوں نے تیل لگا کر سلیقے سے مانگ نکالی ہوئی تھی۔

چھوٹی دونوں بیٹیاں بھی تیز گلابی لپ اسٹک لگائے ہاتھوں میں پرس لٹکائے عید کے لیے فل تیار تھیں۔ کومل نے بچوں کو عیدی دینے کے لیے پرس کھولا۔

سوچا تھا چاروں بچوں کو پچاس، پچاس روپے عیدی دے دے گی لیکن پرس میں اس وقت پچاس کا ایک نوٹ بھی موجود نہ تھا۔ شومئی قسمت عیدی کے لفافے اس وقت عمیر کے پاس تھے۔

''آؤ بھئی بچوں بہت پیارے لگ رہے ہو آپ سب یہ لو اپنی اپنی عیدی۔'' عمیر نے چار لفافے الگ کیے اور ایک ایک بچے کو لفافہ تھمایا۔

''بیٹا! اس پر نام کسی اور کا لکھا ہے گھر جا کر وہ نام کاٹ کر اپنا نام لکھ لینا۔''

اس نے شفقت بھرے انداز میں بچوں کو مخاطب کیا۔ بچوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے تھے۔ نوری کی چھوٹی بیٹی نے چپکے سے اپنے لفافے کو کھول کر اندر جھانکا پھر خوشی سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے پاس کھڑی بہن کے کان میں سرگوشی کی۔ چند لمحوں بعد نوری الوداعی سلام دعا کر کے پلٹ گئی تھی۔ بچوں کی خوشی اب بھی چھپائے

نہ چھپ رہی تھی۔
"آپ بھول تو نہیں گئے تھے عمیر! ہر لفافے میں سو نہیں دو سو روپے تھے۔" کومل نے اسے خفگی بھرے انداز میں یاد دلایا۔
"نہیں بھولا تھا یار، غریب بچے تھے کتنی آس لے کر عید ملنے آئے ہوں گے۔ بس ایک دم ہی دل میں آیا ایک ایک لفافہ انہیں بھی دے دوں۔ دیکھا نہیں کیسے خوش ہو گئے تھے۔"
"ہاں خوش تو ہوئے تھے لیکن یہ عاصم کے بچوں کو دینے والے آٹھ سو روپے تھے اب میرا پرس تو خالی ہے۔ چار لفافے اور بنانے پڑیں گے۔" کومل کی پریشانی فطری تھی۔
"ٹینشن مت لیں مما۔ ہماری عیدی میں سے لے لیجیے گا۔"
روشین نے ماں کو تسلی دی۔ باپ کی طرح وہ بھی حساس دل رکھتی تھی۔
"اچھا چلو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو نکلو۔ تایا ابو، تائی امی منتظر ہوں گے۔" کومل نے موضوع پلٹا۔ پیسے ان بچوں کے نصیب کے تھے ان تک پہنچ گئے۔ یہ ہی سوچ کر اس نے خود کو سمجھا بجھا لیا۔
عید کا سارا دن اپنوں سے ملتے ملاتے گزرا۔ میکے میں چھوٹی بھابھی کی بہن بھی عید ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس کے ماشاء اللہ پانچ بچے تھے۔ اس سے پہلے عمیر ان بچوں کو بھی لفافہ تھماتے کومل نے سو سو روپے دے کر عیدی کی رسم نمٹائی۔ بدلے میں اس کے بچوں کو بھی عیدی ملی لیکن وہ تو بچوں کی ہی جیب میں گئی۔
ہر بار عید کے خرچے اسے اتنا متفکر نہیں کرتے تھے لیکن اس بار تو جیب واقعی بالکل خالی ہو چکی تھی۔ جانے باقی کا مہینہ کیسے گزرے گا۔ یہ سوچ بار بار دماغ پر حملہ آور ہوتی پھر سر جھٹک کر وہ اس سوچ سے پیچھا چھڑاتی۔
شام ڈھلے میکے سے گھر واپسی ہوئی۔ شامی کباب فریز تھے اور یخنی تیار تھی اس نے جلدی سے پلاؤ کی تیاری شروع کی اور جس وقت وہ لوگ پلاؤ اور شامی کباب لے کر ثاقب بھائی کے ہاں پہنچے عین اسی وقت فرح بھابھی کے ماموں اور ماموں زاد بہن بھی وہاں پہنچ گئے۔
ابصار ماموں، عرصہ دراز سے بیرون ملک مقیم تھے اپنے نواسے کی شادی میں پاکستان آئے تھے اور اب وہ اپنی بھانجی کے گھر عید ملنے پہنچے تھے۔
"پہلے آپا کے گھر گئے وہاں سب سے ملاقات ہو گئی لیکن پتا چلا میری لاڈلی بھانجی تو واپس گھر چلی گئی ہے۔ میں نے نورین سے کہا فرح سے بھی ملتے چلتے ہیں بس تمہاری نورین آپی لے آئیں ہمیں یہاں۔" ماموں فرح بھابھی سے پیار بھرے لہجے میں مخاطب تھے۔
فرح بھابھی ماموں کو اچانک اپنے گھر پا کر بہت خوش تھیں۔ کتنے عرصے بعد وہ پاکستان آئے تھے، ان کی محبت کہ انہوں نے عید کے مصروف دن میں بھی بھانجی کو یاد رکھا اور اتنی دور فاصلہ طے کر کے یہاں ملنے پہنچ گئے۔
ان کی بیٹی، نورین آپی سے کومل کی بھی اچھی سلام دعا تھی وہ بہت امیر کبیر خاتون تھیں لیکن بہت منکسر المزاج اور ہنس مکھ تھیں، ان ہی کے بیٹے کی شادی میں شریک ہونے ابصار ماموں پاکستان آئے تھے۔
نورین آپی نے کومل اور عمیر کو بھی شادی میں شرکت کا پرزور بلاوا دیا۔ باتوں ہی باتوں میں فرح بھابھی نے دسترخوان پر کھانا چن دیا۔
"رات بہت ہو گئی ہے فرح! ہم نے تو اب واپس جانا ہے کھانا پھر کبھی۔"
نورین آپی نے اٹھنے کو پر تولے لیکن سب کے اصرار پر انہیں کھانے کے لیے رکنا ہی پڑا۔ کومل کو ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اس کے ہاتھ کا بنا پلاؤ ماموں کو اتنا پسند آئے گا۔
"واہ بیٹا! تم نے تو آج ہماری اماں مرحومہ کی یاد دلا دی۔ عید کی شام ہم ایسا ہی یخنی پلاؤ اور شامی

کباب کھاتے تھے، بالکل ویسا ہی ذائقہ آج جانے کتنے برسوں بعد کسی کھانے میں ملا ہے۔ لا جواب، ذائقے دار۔" ماموں کھاتے جا رہے تھے اور سراہتے جا رہے تھے۔

"ہماری کومل تو پلاؤ بنانے میں ایکسپرٹ ہے۔ میرے تو اپنے گھر میں بھی کوئی دعوت ہو۔ پلاؤ یہ ہی آ کر بناتی ہے۔" فرح بھابھی نے بھی مسکرا کر کہا۔ اتنی تعریفوں پر کومل جھینپ ہی گئی۔

جاتے وقت ماموں نے فرح بھابھی کی عیدی اور تحائف ان کے حوالے کیے تو کومل کے سر پر دست شفقت رکھتے ہوئے، پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ اسے نہ، نہ کرنے کے باوجود زبردستی تھمائے۔

"یہ پہلا نوٹ تمہاری عیدی کا ہے۔ فرح کی بہنوں جیسی دیورانی ہو تم، تو مجھو میری بھی بھانجی لگیں اور دوسرا نوٹ تمہارا انعام ہے۔ مدتوں بعد ایسا پلاؤ کھانے کو ملا۔ موقع ملا تو امریکہ جانے سے پہلے ایک بار صرف یہ پلاؤ کھانے تمہارے گھر بھی آؤں گا۔" انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"کیوں نہیں ماموں جان۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔" کومل کو ان کی شفقت کے آگے پیسے واپس کرنا بدتہذیبی لگی سو یہ ہی کہہ پائی۔ رات گئے وہ لوگ گھر واپس لوٹے تھے۔

تھکے ہارے بچے، جب اپنے کمروں میں سونے چلے گئے تو وہ عمیر کی گرین ٹی لیے بیڈروم میں آئی۔ عید کا جوڑا سلوٹ زدہ تھا، میک اپ سے مبرّا دھلا دھلایا چہرہ۔ بالوں کی چند آوارہ لٹیں چہرے پر آئی ہوئی تھیں۔

ایک مصروف دن گزارنے کی تھکن بھی چہرے پر رقم تھی لیکن دونوں میاں بیوی کو تنہائی کے پل اب ہی میسر آئے تھے۔ عمیر موبائل چارجنگ پر لگا رہا تھا بیوی کو آتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف پلٹا۔ اس کے ہاتھ سے کپ لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ہاتھ بڑھا کر ساتھ بٹھایا۔

"کتنے ظالم ہیں تمہارے بچے، ہر وقت سر پر سوار رہتے ہیں ایک عید مبارک کہنے کی نوبت نہیں آپائی۔ عید ملنا تو بہت دور کی بات ہے۔" اس نے بیوی کے کان میں پیار بھری سرگوشی کی۔

"کچھ بھول رہے ہیں جناب، عید ملنے سے پہلے عیدی بھی دینی پڑتی ہے۔" کومل نے اپنا حنائی ہاتھ اس کے آگے کیا۔ عمیر نے اس کی ہتھیلی بڑی محبت سے تھامی، حنا کی دھیمی مہک اس کے وجود میں اترتی جا رہی تھی۔

"ایک تنخواہ دار سفید پوش شوہر فقط محبت ہی عیدی میں پیش کر سکتا ہے اور ساتھ ہی دلی گہرائیوں سے یہ اعتراف کہ تمہارے ساتھ میری زندگی کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہے۔"

وہ شرارتی سے انداز میں مسکراتے ہوئے مخاطب ہوا۔ کومل مسکرا دی۔ شوہر کی جیب کی حالت اس سے پوشیدہ نہ تھی جانتی تھی گنتی کے چند نوٹ ہی بچے تھے۔

"آپ کی یہ عیدی اور یہ اظہار مجھے جی جان سے قبول ہے، میرے پاس البتہ آپ کو دینے کے لیے عیدی کا انتظام ہو چکا ہے۔ ضروری تو نہیں شوہر ہی بیوی کو عیدی دے۔ جب شوہر بے چارہ آپ سا سفید پوش ہو تو اسے بغیر شرمائے بیوی سے عیدی لے لینی چاہیے۔"

کومل نے بیڈ پر دھرا پرس اٹھایا اور ابصار ماموں کے دیے دونوں نوٹ عمیر کو تھمائے۔

"پیسے تو ظاہر ہے میں رکھ ہی لوں گا لیکن سچی بات ہے شرم واقعی آ رہی ہے۔" اس نے خجل سا ہو کر سر کھجایا۔

"آپ ہی کے ہیں جناب۔ بس وسیلہ میں بنی ہوں، صبح نوری کے بچوں کو عیدی دی تھی ناں۔ رب نے دس گنا اضافے کے ساتھ وہ ہی لوٹا دی۔" کومل نے مسکرا کر اسے یاد دلایا۔ عمیر نے ایک لمحے کو اس کی بات پر غور کیا پھر خود بھی کھلے دل سے مسکرا دیا۔

☆☆

منشا محسن علی

کانچ، بٹن اور دھاگا

پہاڑوں میں گھرے اس شان دار کاٹیج پر اُترنے والی سہ پہر شام جیسی دکھائی دیتی تھی۔ کچھ فاصلے سے بانس کے جنگل سے ایک عجیب سی مہک ساری فضا میں چھائی ہوئی تھی۔ جو اس علاقے کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی۔

گدلے سے دن کی اس سرد شام میں، دُرنایاب اپنی پانچ سالہ شادی شدہ زندگی دو سوٹ کیسوں میں پیک کر کے باپ کے گھر کی دہلیز پر پہنچ گئی تھی۔

شادی شدہ عورتیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ ان کی شادی شدہ زندگی بھی سوت کی طرح ہوتی ہے۔ جانے کب کیسے چوہے کتر کر چلے جاتے ہیں۔ اور یہ لٹی پٹی حالت میں درنایاب کی طرح اپنے میکے کی دہلیز پر چپ کے روزے کے ساتھ آ موجود ہوتی ہیں۔

جیسے وہ پچھلے تین گھنٹوں سے گھر کے آرام دہ مہمان خانے میں، کسی مہمان کی طرح آبنوسی صوفے پر براجمان تھی۔ اور گھر کے سارے مکین ان دو سوٹ کیسوں سے نظریں چرانے کی کوششوں میں تھے۔

پانچ سالہ شادی شدہ زندگی میں، کبھی باپ کے گھر رات نہ رکنے والی اور مجازی خدا کی رضا کے لیے خود کو قربان کر دینے والی دُرنایاب آخر اس گرد آلود شام میں وہاں کیوں موجود تھی۔ یہ سوال بہت عجیب اور مشکل تھا تب ہی سب ایک دوسرے سے نظریں چرانے کی کوششوں میں مصروف سے دکھائی دیتے تھے۔

ڈیڈی ہمیشہ کی طرح ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے شام کے اخبار کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ جہاں عالمی منڈی اور مہنگائی سے وہی روز روز کی بور ترین خبریں جمع تھیں۔ ممی ہمیشہ کی طرح اپنی سہیلی کی طرف سے آنے والے تحائف دیکھنے اور ان کی تعریف کرنے میں مصروف تھیں۔

وہ اپنی چار سالہ بیٹی کو گود میں لیے بس بیٹھی رہی تھی۔ خاموش...... گم شدہ الفاظ کے ساتھ......

لاؤنج کی کھلی ہوئی کھڑکیوں سے صنوبر کی خوشبوئیں اُڑ اُڑ کر اندر داخل ہو رہی تھیں۔ وہ خوشبوؤں کی دیوانی جیسی چونک سی گئی تھی۔

"ممی! یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔"

اس نے ممی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

ممی نے سامنے پڑے پھیلاوے کو سمیٹتے ہوئے جیسے جواب دیا تھا۔

"سامنے ہی ایک فرنیچر ورکشاپ بن گئی ہے۔ بہت اچھے ڈیزائن ہوتے ہیں ان کے پاس۔ تمہیں کچھ پسند ہو تو لے لینا۔"

"مگر ممی...... میں تو خوشبو کی بات کر رہی تھی۔"

"ارے ہاں...... خوشبودار لکڑی کا فرنیچر بن رہا ہے ناں۔ سنا ہے کسی رئیس نے آرڈر دیا ہے اپنی بیٹی کے لیے۔"

بیٹی کے ذکر پر وہ پہلی بار جیسے چونک کر اپنی گپ چپ اولاد کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ جو ٹکر ٹکر ڈیڈی اور ممی کو دیکھے جا رہی تھی۔ یہ گھر اور اس کے مکین کسی حد تک اس کے لیے اجنبی ضرور تھے۔

ڈیڈی نے اسے ٹافیاں عنایت کی تھیں۔ تو اس

نے سر ہلا کر منع کر دیا تھا۔

"موی...... میٹھا نہیں کھاتی ڈیڈی۔"

باہر شاید پہاڑوں میں شام اتر چکی تھی۔ کیونکہ ممی نے کھڑکیوں کے پٹ بند کرنے شروع کر دیے تھے۔ رات ہوتے ہوتے سردی شروع ہو جایا کرتی تھی۔ ممی کو بیٹھے بیٹھے یونہی کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ پرانی باتیں نئے وقت میں کرنے والی۔

"تمہیں یاد ہے ناب! میں تمہیں میٹھا کھانے سے کتنا روکا کرتی تھی کہ کنواری لڑکیوں کو سنبھل کر کھانا پینا چاہیے۔ ورنہ آگے چل کر رشتہ کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ اور تمہارا تو کوئی عجیب مسئلہ تھا کہ جیسے ہی میٹھا کھاتی تھیں۔ بلوٹنگ ہو جاتی تھی اور تمہارا وزن بڑھ جاتا تھا۔"

ممی کی کہی گئی وہ ساری باتیں اسے یاد تھیں۔ ہر بات...... ایک ایک بات۔

پورے خاندان میں اس کا حافظہ اور وہ خود مشہور تھی۔ قابل، ذہین، لائق فائق۔ ڈیڈی اور ممی ہر سرکل میں بہت فخر سے اس کا تعارف کروایا کرتے تھے۔

وہ اپنے خاندان کے لیے ایک چلتی پھرتی ٹرافی تھی۔ ہر میدان کی فاتح تعلیمی میدان میں پوزیشن ہولڈر، ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش...... وہ کالج کے اسٹیج پلے کی ڈائریکٹر اور ایکٹر بھی ہوا کرتی تھی۔

وہ کتنا حسین اور آرٹسٹک سا دور تھا۔ اپنی ذات کے ساتھ...... اپنے اعتماد کے ساتھ۔ موی نے اس کی گود میں ہی کروٹ بدلی تو وہ چونک گئی تھی۔ اس کی چار سالہ بیٹی جو ابھی تک بولنا نہیں سیکھ پائی تھی۔ وہ اشاروں سے اسے متوجہ کر رہی تھی۔ شاید اسے بھوک لگی تھی۔

سوٹ کیس بھوت بن گئے تھے ڈرا رہے تھے۔

وہ نظریں چرا رہی تھی۔

"عباد کیسا ہے بیٹا؟" ڈیڈی نے شام کا اخبار مکمل چاٹ کر بے زاری سے کنارے پر کر دیا تھا۔

"عباد...... کون عباد" وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

ڈیڈی اور ممی نے فکر مندی سے ایک دوسرے کو دیکھا

تھا۔ وہ غائب دماغ سی لگ رہی تھی۔ حواسوں پر بند کھڑکیوں کے باوجود کالیج میں درزوں سے داخل ہونے والی خوشبودار لکڑی کی مہک چھا گئی تھی۔ وہ وہاں ہو کر بھی کہیں نہیں تھی۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ کیسی ہو کر آ گئی تھی؟

تب ہی ہمیشہ کی طرح کھٹ کھٹ شور کرتی جانوروں کی ڈاکٹر نے اندر قدم رکھا تھا۔ سامنے بیٹھی بڑی بہن اور گپ چپ بھانجی کو دیکھ کر وہ حیران ہو گئی تھی۔

"یا اللہ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔ محترمہ نایاب صاحبہ نے ہمارے غریب خانے کو کیسے رونق بخشی ہے۔" عباد کی بات بیچ میں کہیں ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ جانے کون تھا یہ عباد؟

شبانہ نے بڑی بہن کو محبت اور گرم جوشی سے بھینچ لیا تھا۔ بھانجی کو بھی خوب پیار کیا تھا۔

"سرپرائز دینے میں تو تم کبھی اچھی نہیں رہیں۔ مگر آج سچ میں تم نے مجھے حیران کر دیا ہے۔"

"ہاں کبھی کبھی زندگی سرپرائز کر دیتی ہے شی۔"

شبانہ ٹھٹک گئی تھی۔ او ور آل پرے پھینکا تھا اور درنایاب کے ساتھ ہی صوفے پر ٹک گئی تھی۔ ممی، ڈیڈی اور شی کی نظریں ایک دوسرے سے ملی تھیں۔ تینوں نے ہی آنکھوں آنکھوں میں پتا لگانے کی کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہے۔

کھڑکیوں کے پار کسی درخت پر بندر کود گیا تھا۔ بندروں کو بھی چین نہیں تھا۔ کودتے پھاندتے رہتے تھے۔

صوفے سے کچھ فاصلے پر پڑے سوٹ کیس پر پہلی بار نظر گئی تھی۔ شی حیران رہ گئی تھی۔

"عباد بھائی نہیں آئے؟" شبانہ نے سنبھل سنبھل کر پوچھا تھا۔

وہ موی کے بالوں کی پونی ٹیل ٹھیک کرنے میں مصروف رہی تھی۔ وہ بار بار کچھ بھول رہی تھی۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ کہیں کچھ خراب تھا۔

مگر کیا؟

شبانہ نے پہلی بار بڑی بہن کو کندھوں سے تھاما تھا۔ اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

موی کی پونی ٹیل کھل گئی تھی۔ لمبے سنہری بال جیسے بکھر گئے تھے۔ وہ کتنا چڑتی تھی بالوں کے کھلنے سے کیونکہ وہ اپنی عمر سے کہیں لمبے اور گھنے بال رکھتی تھی، جو سمیٹنا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔ درنایاب کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"شی...... میں...... میں۔"

"ہاں بولو کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟"

"سب ٹھیک تو ہے مگر وہ میں عباد سے ڈائیورس (طلاق) لینا چاہتی ہوں۔" فرنیچر ورکشاپ سے آرے کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تیز تیز۔

ممی اپنی بلڈ پریشر کی ٹیبلٹ لینے اندر دوڑ گئیں۔ ڈیڈی پریشان صورت کے ساتھ بیٹھے تھے۔ شام کا اخبار دوبارہ چہرے کے سامنے سجا لیا تھا۔

موی ۔ ، گم صم مجسمے کی شکل میں ڈھلنے والی عورت، اپنی ماں کو اپنی بھوک کے بارے میں تیسری بار بتایا تھا۔ درنایاب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"موی کو بھوک لگی ہے۔ میں فاطمی بوا سے اس کے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔ سیریلیک ہو گا شی؟"

وہ کچن کی طرف جاتے جاتے پلٹی تھی۔ شی کی آنکھوں میں آنسو قطروں کی صورت ٹھہر گئے تھے۔ وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

درنایاب نے خوفناک سوٹ کیس دھیرے سے کھولا تھا۔ جس میں سے کپڑے اور چند چیزیں ابل کر باہر گر پڑی تھیں۔ وہ سوٹ کیس میں سے سیریلیک کا ڈبہ نکال کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

ڈیڈی چپ ـــ تھے۔ شبانہ نے موی کی پونی ٹیل بنانا شروع کر دی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

ڈیڈی کے گھر کا کچن ہمیشہ کی طرح لشک پشک رہا تھا، اس کے پیچھے فاطمی بوا کی ـــ کوششیں تھیں۔ زندگی کے کتنے ہی سال انہوں نے ڈیڈی کے گھر میں کیئر ٹیکر کے طور پر گزار دیے تھے۔ وہ ان سب کے لیے ایک فیملی کے فرد کی طرح تھیں۔ جو وہ خود کھاتے تھے انہیں بھی وہی کھلاتے تھے اور جو پہنادے خود پہنتے تھے وہی ان کو بھی پہناتے تھے۔

اتنے عرصے بعد وہ درنایاب کو دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بے تحاشا خوش بھی ہوئی تھیں۔ اور پھر سیریلیک کا ڈبہ اس سے لے کر مومی کے لیے سیریلیک بنانے لگی تھیں۔

''مومی بٹیا، اب بھی سیریلیک کھاتی ہیں۔ اب تو کافی بڑی ہوگئی ہیں۔ آپ بھی تو بچپن میں ایسی ہی تھیں۔ میٹھے کی شوقین اور پھر ممی جی سے چھپ چھپ کر چاکلیٹ اور براؤنیز کھانے والی۔''

فاطمی بوا بھی اس کی طرح غضب کی یادداشت کی مالک تھیں۔ ماضی کی ایک ایک بات انہیں ازبر ہوتی تھی۔

وہ سر ہلاتی ہوئی اٹالین طرز پر بنے ہوئے فرمائشی کچن کی کھڑکی کی طرف آئی تھی۔ کچن میں یہ شیشے کی کھڑکی اس کے لیے ہمیشہ پسندیدہ گوشہ رہی تھی۔ وہ گھنٹوں یہاں کھڑے کھڑے گزار سکتی تھی۔ شاید پوری عمر بھی۔

اس نے دھیرے دھیرے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی تھی۔ چوں چوں کی آوازوں کے ساتھ مشکل سے وہ کھڑکی کھلی تھی۔ اور کھڑکی کے کھلتے ہی سرد ہوا کا ایک خوشبودار جھونکا اندر کود گیا تھا۔

درنایاب نے مدت بعد وہ ہوائیں اور فضا محسوس کی تھی۔

''بوا لگتا ہے اب یہ کھڑکی نہیں کھلتی۔''

''ہاں بس صرف آپ ہی تھیں جو گھر کی کھڑکیاں دروازے کھول کر ہواؤں کے راستے آسان کیا کرتی تھیں۔ اب تو سب کی اپنی اپنی مصروفیت ہے۔ تمہارے ڈیڈی بھی شام کے اخبار اور دوستوں کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔ ممی نے بھی کوئی ایسوسی ایشن جوائن کر لی ہے۔ اور شبانہ بی بی تو جانوروں کے علاج میں مصروف ہوتی ہیں۔'' بوا نے مصروف انداز میں بتایا تھا۔

شام کے چہرے کو ایک نارنجی سورج کی لکیر کاٹ رہی تھی۔ بانس کے جنگلوں میں ـــ جھینگر شور مچاتے تھے۔ کھڑکی کے بالکل سامنے ہی تو چیری کے درختوں والا باغیچہ تھا۔ جو اب آہستہ آہستہ اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔

وہ پلکیں جھپک جھپک کے چیری کے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔

''بوا...... کیا چیری کے درختوں پر اب بھی پرندے آتے ہیں؟'' لہجے میں آس تھی۔

فاطمی بوا نے سیریلیک بنالیا تھا اور اب چینی کے ایک پھول دار پیالے میں منتقل کر رہی تھیں۔ سیریلیک کی خوشبو سے وہ اٹالین طرز پر بنا ہوا کچن مہک اٹھا تھا۔

''نہیں بٹیا۔ جب تک آپ تھیں تو بھول بھٹک کر چیری کے درختوں پر پرندے بھی آجایا کرتے تھے۔ آپ کی رخصتی کے بعد یہ کھڑکی بھی بند ہوگئی اور پرندوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ وہ تو آپ کے دوست تھے ناں۔ آپ کے جانے کے بعد شاید بھی آنا چھوڑ گئے۔''

فاطمی بوا کو ہمیشہ سے ہی تفصیلی بات کرنے کی عادت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی کم بولنے والی فیملی میں بوا کا ہونا بھی ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس گھر کے مکین خاموشی پسند تھے۔

درنایاب نے کچھ دیر اندھیرے کو ٹٹولا اور پھر ٹھنڈے ہوتے پیالے کے کناروں پر انگلیاں پھیرنا شروع کر دی تھیں۔ وہ صرف ایک کھڑکی نہیں کھلی تھی کوئی گزری ہوئی یادوں کا البم تھا جو ورق درورق کھلنے لگا تھا۔

"فاطمی بوا......وہ جو شرفو چچا ہوتے تھے؟ اخروٹ کا حلوہ بیچتے تھے اور اسی راستے سے گزرتے تھے۔ وہ اب بھی یہاں سے گزرتے ہیں کیا؟"
کنٹوپ پہنے شال اوڑھے ٹھٹھرتے ہوئے شرفو چچا اسے یاد آئے تھے۔

نفاست اور صفائی پسند بوا نے اپنے گرد ایپرن کی ڈوریوں کو کسنا شروع کر دیا تھا۔ درنایاب کی موجودگی نے انہیں بہت خوشی دی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ آج ڈنر کے لیے خاص اہتمام کرنے کے موڈ میں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ ابھی کچھ دیر بعد الفریڈو پاستا اور فرنی کی فرمائش کر دے گی۔ ساتھ وہ دو تین طرح کے سلاد بھی بنا لیں گی۔ کیونکہ سبزیاں فروٹ کھانے کی وہ بہت شوقین تھی۔

"ارے نہیں وہ تو آپ ہی شرفو چچا کے اخروٹ کے حلوے کی اکلوتی گاہک تھیں۔ تب ہی وہ آپ کے لیے یہاں سے گزرنے کی مشقت کر لیا کرتے تھے۔ کیونکہ آپ پر تو ممی جی کی طرف سے میٹھا کھانے کی پابندی تھی۔ اور آپ چھپ چھپ کر شرفو چچا سے اخروٹی حلوہ لے کر کچن میں بیٹھ کر کھایا کرتی تھیں۔ اور مجھے بھی آپ نے اس راز میں شریک کر لیا تھا۔ بس آپ کی شادی کے بعد شرفو چچا بھی یہاں کا رستہ بھول گئے۔"

کٹنگ بورڈ پر کھٹ کھٹ سبزیاں کٹتی رہیں۔

برنر پر پاستا ابلتا رہا۔ درنایاب نے جھٹ سے کھڑکی بند کر دی تھی۔ پیالہ اٹھا کر باہر جانے ہی لگی تھی کہ پلٹ کر آخری سوال کرنا یاد آ گیا تھا۔

"بوا......ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں بٹیا...... ضرور پوچھو۔ بھلا اجازت کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے آپ کو۔"

وہ کچھ سوچتی رہی اور پھر ہمت جمع کر کے سوال پوچھ ہی لیا تھا۔

"کیا ایک عورت بغیر مرد کے زندگی گزار سکتی ہے؟ بغیر کسی شادی کے؟"

فاطمی بوا کی ساری مصروفیات میں جیسے اچانک اسپیڈ بریکر آ گیا تھا۔

چکن کے پیسز میرینیٹ ہونے سے رہ گئے تھے۔ درنایاب کی آواز...... لہجے اور سوال میں کچھ تو خاص بات تھی۔

"ہر عورت کو آپ کے ممی ڈیڈی جیسا خاندان اور آپ کے جیسے رشتے نہیں ملتے۔ مرد کے بغیر عورت کچھ نہیں ہوتی بیٹا۔ فیملی تو مرد اور عورت دونوں مل کر بناتے ہیں ناں۔ میں نے بھی زندگی کے کئی سال صرف اس وجہ سے اس گھر میں گزارے ہیں کہ میرے پاس آپ لوگوں جیسے رشتے تھے۔ جنہوں نے مجھے خون کے رشتوں جتنی ہی اہمیت دی۔ ورنہ غیر شادی شدہ عورتیں کانچ کے باہر بانس کے جنگل جیسی دنیا میں گم ہو جاتی ہیں۔ بھیڑیے اور چیتے چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔"

بوا نے جانے شام کے اندھیرے جیسی بات اس کے حوالے کیوں کی تھی۔ وہ بس سر ہلاتی ہوئی باہر آ گئی تھی۔ جہاں سامنے ہی ممی موی کے ساتھ لگی ہمیشہ کی طرح چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے میں مصروف نظر آتی تھیں۔

"تم نے دیکھا ناب۔ موی اور میری فرینڈ شپ ہو گئی ہے۔ شی ایسے ہی کہتی تھی کہ موی مجھے پسند نہیں کرتی۔"

وہ ڈھیرے سے سیریلیک موی کو کھلانے لگی تھیں۔

"موی کسی کو بھی ناپسند نہیں کرتی ممی...... یہ بہت اچھی ہے۔"

"میں جانتی ہوں تم اپنی بیٹی کی تربیت کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں کرو گی۔ تم اپنی ذمہ داریوں کو نبھانا اچھے سے جانتی ہو۔ تمہیں پتا ہے پچھلے دنوں میں ایک گیدرنگ میں تھی تو وہاں تمہارا ذکر چل پڑا۔ اور سب نے ایک ہی بات کی کہ تم اور عباد ایک آئیڈیل کپل ہو۔"

ممی نے جذبات میں آ کر شاید کچھ زیادہ ہی بول دیا تھا۔ وہ نیپکن کے ساتھ موی کا چہرہ صاف

کرنے میں مصروف تھی۔ پتا نہیں ان کی بات سن بھی رہی تھی یا نہیں۔

"تمہارے ڈیڈی اس وقت تھوڑا باہر جاتے ہیں۔ ان کے دوست کرنل جعفری بھی پاس میں ہی شفٹ ہوگئے ہیں۔ تو ان کو بھی کمپنی مل جاتی ہے۔"

وہ خالی پیالیہ کنارے پر رکھ چکی تھی۔ ممی کی نظریں درنایاب پر تھیں۔

خاندان کی سب سے شاندار لڑکی۔ جس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ آج وہ انہیں بہت تھکی تھکی سی نظر آرہی تھی۔

"تمہارے ڈیڈی تمہاری وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں نایاب۔"

"انہیں کہیں مت ہوں۔ پلیز۔" اس نے قطعیت سے کہا تھا۔

"پریشان تو میں بھی ہوں۔ آخر ایسی کیا بات ہوگئی کہ تم سب چھوڑ چھاڑ کر آگئی ہو۔ عباد سے بھی رابطہ نہیں ہو پارہا۔ ان پانچ سالوں میں پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

وہ دھیرے دھیرے سر کو دبا رہی تھی۔ جب بھی وہ اسٹریس میں ہوتی تھی تو یونہی سر کو دباتی رہتی تھی۔ آج بھی وہ یہی کررہی تھی۔

"پانچ سال بہت ہوتے ہیں ممی، کسی ببل میں رہنے کے لیے۔ حقیقت جاننے کے لیے۔ کسی کو پرکھنے کے لیے۔ اب میری زندگی میں کچھ بھی آئیڈیل نہیں رہا ممی۔"

ممی نے اپنا کوٹ اتار کر خود کو آرام دہ کرکے نایاب کو بانہوں کے گھیرے میں بھر لیا تھا۔ موٹی ننگے پاؤں دیوار کے ساتھ لگے ایک گلدان کی طرف بڑھ گئی تھی۔ کانچ کے بڑے بڑے گلدان شاید نئے خریدے گئے تھے۔

"ناب...... میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ شادی شدہ زندگی میں مرد اور عورت کا رشتہ کاج اور بٹن کے جیسا ہوتا ہے۔ کاج کے بغیر بٹن کسی کام کا نہیں ہوتا اور بٹن کے بغیر کاج بیکار ہوتا ہے۔ دونوں ایک ساتھ جڑے اچھے لگتے ہیں۔ تب ہی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ رشتہ کسی کترن جیسا ہوجاتا ہے۔ بے ڈھب اور عجیب......"

درنایاب نے شدید حیران ہوکر اپنے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا تھا۔ جو شادی شدہ زندگی کا فلسفہ بیان کررہی تھی۔ ممی نے پچھلے کچھ سالوں سے اسے حیران کرنا شروع کردیا تھا۔ پتا نہیں ان کی ذات میں ایسا کون سا انقلاب آیا تھا جو ان کے لفظوں کی گہرائی سے جھلکتا تھا۔ ان کی خاموشی سے چھلک پڑتا تھا۔

ممی کندھے تھپتھپا کر اندر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ سامنے آتش دان میں لکڑیاں جل بجھ رہی تھیں۔ ماحول میں حرارت بڑھنے لگی تھی۔ اور وہ ابھی بھی پانچ سالوں میں اتنا کچھ بدلنے پر حیران تھی پر سمجھ نہیں پارہی تھی۔

☆☆☆

درنایاب جسے پیار سے نایاب کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے خاندان میں یکساں مقبول تھی۔

اس کی بہت ساری وجوہات تھیں سب سے بڑی وجہ اس کا خوب صورت اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ سلیقہ مند ہونا بھی تھا۔

رزلٹ ڈے کے موقع پر وہ ہمیشہ گولڈ میڈلز اور انعامات کے ساتھ لدی پھندی ہی گھر میں داخل ہوا کرتی تھی۔ ڈیڈی ہر کسی کو فخر سے بتایا کرتے تھے۔

"میری ناب چاہے تو دنیا فتح کرسکتی ہے۔"

اور وہ ڈیڈی کی بات پر خوب ہنسا کرتی تھی۔

"ڈیڈی آپ بھی ناں۔ کبھی کبھی بہت بڑی باتیں کرجاتے ہیں۔"

ممی، باپ بیٹی کی انڈرسٹینڈنگ دیکھ کر فاطمی بوا سے کہتی تھیں۔

"بوا...... ذرا دیکھیں تو۔ کسی دن اگر ناب گھر چھوڑ کر دنیا فتح کرنے چل پڑی تو؟"

شبانہ کو ایسی صورت حال میں خوب مزے آیا کرتے تھے۔ تب وہ بہت کھلنڈری اور لاپرواہ ہوا کرتی تھی۔ جسے ڈاکٹر بننا تھا اور قسمت کہ وہ اتنی لائق

فائق نہیں تھی تب ہی ڈی وی ایم میں داخلہ ہوا تھا۔

وہ گھنٹوں روتی رہی تھی اور نایاب نے ہمیشہ کی طرح سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے سمجھایا تھا۔ ناب کے مشورے بھی نایاب ہوا کرتے تھے۔

"سارے ڈاکٹر انسانوں کا علاج کرنے لگیں گے تو جانوروں کی صحت کا خیال کون رکھے گا شی...... اتنی خود غرض مت بنو کہ تم دنیا والوں کو ڈاکٹر بن کر دکھاؤ۔ چڑیا بگلے اور خچر گھوڑے کو بھی تو ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہو سکتی ہے ناں۔"

روتی ہوئی شی ہنس دی تھی۔ اس کی بڑی بہن کبھی کبھی بہت عجیب اور انقلابی مثالیں دیا کرتی تھی۔ لیکن اتنا ہوا کہ شی نے جانوروں پرندوں کے زخموں کا درد محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

درنایاب نے کالج میں ٹاپ کیا تھا اور وہ انگلش میں ماسٹرز کرنے والی تھی۔ لٹریچر اور آرٹس اس کی گھٹی میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی زیادہ تر سرگرمیاں نیویارک ٹائمز جیسے اداروں کے لیے کالم لکھنے اور کسی کتاب پر تبصرہ کرنے کے گرد گھومتی تھیں۔

تھیٹر کے ڈراموں میں بھی وہ ضرور حصہ لیتی تھی۔ کبھی رائٹر بن جاتی تھی۔ کبھی ڈائریکٹر بن جاتی تھی۔ ممی شکایت لے کر ڈیڈی کی خدمت میں پیش ہو جاتی تھیں۔

"ناب کو سمجھائیں۔ ہر چیز کرنا یا سیکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ پرفیکٹ نہ ہونا بھی ایک حسن ہوتا ہے۔ اور لڑکیوں کو اتنے سارے ہنگاموں میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔" ڈیڈی نے گلاسز کے اوپر سے ممی کی پریشان صورت دیکھ کر فلک پھاڑ قہقہہ لگایا تھا۔

"ایک ایسی ڈرامازدہ ماں مت بنو کہ جس نے اپنی زندگی میں کبھی کچھ نہیں کیا۔ اور وہ اب بیٹیوں کی زندگی اور خوابوں کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہے۔"

ڈیڈی کا مذاق مذاق میں کہا گیا وہ جملہ ممی کو بہت چبھا تھا۔

وہ کچھ کہے بغیر پلٹ گئی تھیں۔ پھر بعد میں انہوں نے کیلاش فیسٹیول میں گھڑسواری مقابلے میں حصہ لینے پر بھی درنایاب کو نہیں ٹوکا تھا۔ اور پھر مقابلہ جیتنے کے بعد اسے چیئر اپ بھی کیا تھا۔ فاطمی بوا بھی درنایاب کے صدقے واری جاتی تھیں۔

"جس گھر میں جاؤ گی بٹیا...... اجالا کر دو گی۔"

شی کو درنایاب کے حوالے سے یہ موضوع کافی حیران کن لگا کرتا تھا اور اس نے ایک شام کھانے کی میز پر چائنیز سوپ پیتے ہوئے شگوفہ چھوڑا تھا۔

"کیا ناب شادی بھی کرے گی؟"

نایاب کو ٹھسکا لگا تھا۔ ڈیڈی نے بمشکل ہنسی دبائی تھی۔ اور ممی کو تو جی بھر کر غصہ آیا تھا۔ کبھی کبھی شی چھوٹا بچہ بن جاتی تھی۔ جسے مار کی ضرورت تھی۔

"خچر گھوڑوں کے ساتھ رہ رہ کر لگتا ہے تمہاری عقل بھی گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ یقینی بات ہے کہ نایاب کی شادی ہوگی۔ وہ ایک فیملی بنائے گی۔"

"لیکن رشتہ کہاں ہوگا؟ دولہا بھائی کہاں سے آئیں گے؟" شی کو اب صحیح معنوں میں تشویش ہونا شروع ہو گئی تھی۔ جبکہ جس کی شادی اور رشتے کی تفصیلات گول میز کانفرنس پر ڈسکس ہو رہی تھیں۔ اسے چنداں بھی فکر پریشانی نہیں تھی۔

ڈیڈی نے جیسے راز اگلا تھا۔

"میرے ایک دوست کا بیٹا ابھی لندن سے اپنی انجینئرنگ کی اسٹڈیز مکمل کر کے آیا ہے۔ دوست نے بھی اشاروں کنایوں میں ذکر کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے ہمیں ایک بار اس بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔"

ممی اور ڈیڈی کچھ دنوں کے بعد ڈیڈی کے دوست سے ملے تھے اور واپسی پر ممی نے عباد کی تعریفوں میں زمین آسمان ایک کر دیے تھے۔ یہاں تک کہ عباد کے ذکر کی محفل میں شی اور درنایاب کانوں پر ہاتھ دے کر کھسک جاتی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ موضوع اب "بور" ہو چکا تھا۔

ممی نے آنے والے وقت کے پیش نظر درنایاب کو، فاطمی بوا کے سپرد کر کے کچن کے سارے

کاموں میں بھی طاق کر دیا تھا اور یہاں بھی ان کی لاڈلی نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔

وہ دیسی، انگریزی، تھائی، چائنیز سب بنانا دنوں میں سیکھ گئی تھی۔ بس ممی کو بھی بھی اس کے میٹھا بنانے سے خوف آتا تھا۔

میٹھا کھانا بھی درنایاب کے لیے منع تھا۔ بچپن سے ہی شوگر کا استعمال اس کے وزن میں اضافے کا سبب بن جاتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ شرفو چچا سے چھپ چھپ کر اخروٹ کے حلوے خرید کر مزے سے کھایا کرتی تھی۔

دوستوں کے جھرمٹ تک اس کے رشتے اور پروپوزل کی باتیں پہنچ گئی تھیں۔ وہ ساری اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔

"کون ہے۔ کیسا ہے؟"

درنایاب نے بھی ان کے ارمانوں پر پانی پھیرنے کی ٹھان لی تھی۔ "ٹام کروز جیسا ہے۔"

"اوہ مائی گڈنیس...... ہینڈسم اور ٹال ہوگا پھر تو؟"

"ہاں بہت ہمارے گھر کے سامنے بانس کے جنگل میں جو بانس ہیں ان کے قد برابر ہوگا۔"

اس بات پر تو سارے گروپ میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔

"اوف......اوف......ظالم کرتا کیا ہے؟"

فاطمی بوا کا چوری چھپے لنچ باکس میں رکھ کر دیا گیا گلقند اڑاتے ہوئے اس نے ہنس کر دوستوں کا رہا سہا اطمینان بھی غارت کیا تھا۔

"سول انجینئرنگ کی ہے۔ وہ بھی لندن کی بہت بڑی یونی ورسٹی سے۔ اسکالرشپ پر آج کل گورنمنٹ کے ایک بڑے کنسٹرکشن کے پراجیکٹس دیکھ رہے ہیں۔ وہ بھی ہیڈ کی پوزیشن پر......کافی اتھارٹی ہے ان کے پاس۔"

"تمہارے پاس فوٹو البم تو ہوگا کوئی؟"

"نہیں تو...... بہت براڈ مائنڈڈ ہیں دونوں فیملیز تو ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ ڈائریکٹ ملاقات طے پائی ہے۔"

ملاقات کی بات پر تو چراغوں سے روشنیاں ہی غائب ہو گئی تھیں۔

وہ سب کا سکون اڑا کر، ہنستی مسکراتی جب گیلی سیلی سڑکوں سے ہوتی ہوئی کالج پہنچی تھی تو سامنے ہی گھر کے پھاٹک پر موٹر کار کھڑی تھی۔ وہ بھی کیٹس کی نظم گنگناتی ہوئی اندر داخل ہو گئی تھی۔ کیونکہ اکثر و بیشتر ڈیڈی کے مہمان آئے رہتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی شاید زیادہ مصروف ہو گئی تھی۔

جیسے ہی وہ اپنا چھاتا، دیوار پر لگے کھونٹے پر لٹکاتی اندر داخل ہوئی تھی تو ڈیڈی کے ساتھ سامنے ہی ٹام کروز عباد بیٹھا ہوا تھا۔

تھری پیس سوٹ میں ملبوس اور کسی امپورٹڈ پرفیوم میں مہکا ہوا، مرد پہلی بار درنایاب کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کر گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس کے بارے میں بہت سارے جھوٹ گھڑ کر اس نے دوستوں کو سنائے تھے، وہ سارے سچ بن کر یوں سامنے آجائے گا۔ ممی بھاپ اڑاتی چائے اور لوازمات کی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر آئی تھیں اور بڑی بیٹی کو بت بنا دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں۔

"ارے تاب، شکر ہے تم آگئیں۔ دیکھو تو آج پھر بارش ہو گئی۔ ہم تمہیں ہی یاد کر رہے تھے۔ عباد بھی ابھی آیا ہے۔ پاس ہی کہیں کام سے آیا تھا تو خاص طور پر مجھ سے ملنے آیا ہے۔"

وہ ہاتھ مسلتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی تھی۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس سامنے والا اسلام کے بعد بالکل ہی لاپرواہ ہو کر، ڈیڈی سے باتوں میں مشغول ہو گیا تھا۔ بالوں پر ہلکی ہلکی بارش کے قطرے ٹھہرے تھے۔ گہرے کیمل کلر کی ٹائی پہنے وہ جب وقفے کے بعد ہنستا تھا تو ٹام کروز ہی لگتا تھا۔

خوشبوؤں کی دیوانی، درنایاب نے اس کے پرفیوم کی مہک کو چند فٹ کے فاصلے پر بیٹھے بیٹھے اندر نہیں اتارا تھا۔ موسم کے پیش نظر باہر تاریکی چھائی تو ممی نے زرد روشنیاں جلا دی تھیں۔

بلبوں کی روشنی میں عباد کی رسٹ واچ کا ڈائل چمک کر دیوار پر ایک روشنی کی لکیر بنا رہا تھا۔ وہ بھاپ اڑاتی چائے لیے یہ آنکھ مچولی دیکھتی رہی تھی۔ تعلیمی سرگرمیوں کے بعد اب کہیں جا کر درنایاب کی زندگی میں عباد کی صورت میں ایک دلچسپی آئی تھی۔

☆☆☆

برف برف سا دن تھا۔ سرد سرد سا۔ آس پاس جنگل تھا۔ دیودار اور چیڑ کے اونچے اونچے فلک بوس درختوں کے درمیان، وہ تینوں سیدھ میں چلتے ہوئے جا رہے تھے۔ پچھلے دو تین دنوں سے برفباری بھی مسلسل ہو رہی تھی۔ برف کے گولے آسمان سے ٹھا ٹھا کر کے گرتے تھے۔

عباد کریم نے آج، سیاہ شلوار قمیص کے ساتھ بھورے رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا اور گلے کے گرد نفاست سے مفلر جما رکھا تھا۔ پرفیوم کی خوشبو وہی پرانی تھی جو درنایاب کے حواس گم کرنے کے کام آتی تھی۔

وہ اور ڈاکٹر شبانہ آگے آگے چل رہے تھے شبانہ، کسی ماہر ٹور گائیڈ کی طرح عباد کو آس پاس کی معلومات سے آگاہ کر رہی تھی۔ درنایاب دونوں کے پیچھے پیچھے ان کے قدموں کے نشانوں پر پیر رکھتے ہوئے آ رہی تھی۔ اس نے بھی جینز پر لمبا سا چکن کاری کا کرتا پہن کر اوپر لمبا فر والا کوٹ پہن لیا تھا۔

کانوں میں گولڈ کے ٹاپس تھے، جو ڈیڈی نے اسے کالج میں ٹاپ کرنے پر دیے تھے اور یہ ٹاپس جیولری کے ڈبے میں پڑے رہتے تھے مگر آج ممی کی خاص ہدایات پر، اس نے کافی بحث کے بعد پہن ہی لیے تھے۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ یہ اس کی اور عباد کریم کی فیملی کی ملی بھگت تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جانچ پرکھ لیں۔ اور فاطمی بوا کی احتیاطی تدبیر کے مطابق شمی کو بھی ساتھ کر دیا گیا تھا۔ جو شاید عباد کی کمپنی کو بہت انجوائے کر رہی تھی۔

مگر یہ سلسلہ صرف تب تک جاری رہا تھا جب تک، رستے میں انہیں خشک پتوں کے ڈھیر پر ایک نیم جاں اور زخمی گلہری نظر آئی تھی۔

وہ تینوں اس کے گرد بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹر شبانہ نے الٹ پلٹ کر اس کے جسم کی حرارت کو محسوس کیا تھا۔

''سانس چل رہی ہے۔ زخمی بھی ہے اور اندرونی چوٹ آئی ہے۔ لگتا ہے ٹھنڈ میں برف کی وجہ سے سانس لینے میں دقت ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو کمپنی دیں میں اسے لے کر گھر جاتی ہوں۔ اسے فوری فرسٹ ایڈ دینا ہوگی۔''

شمی نے زخمی گلہری کو اپنے اسکارف میں لپیٹ کر، ہاتھ میں چائے کا تھاما ہوا تھرماس درنایاب کے حوالے کر دیا تھا۔ ساتھ چائے کے کپ بھی تھے۔ جو ڈیڈی کے دوست خاص طور پر جاپان سے لائے تھے اور ممی نے سنبھال کر وہ ٹی سیٹ رکھ لیا تھا۔ اور آج ثام کر وز عباد کریم کی وجہ سے وہ ٹی سیٹ استعمال میں آیا تھا۔

شمی تیزی سے اپنے زخمی مریض کے ساتھ گھر کی طرف پلٹ گئی تھی۔ اب آسمان کی اونچائیوں کی چھوتے ہوئے درختوں کی چوٹیاں تھیں اور وہ دونوں تھے۔ وہ دونوں سکون سے آگے بڑھتے گئے۔

دیودار کی چوٹیوں سے، برف کے گولے ٹوٹ کر دونوں کے سروں پر گر رہے تھے۔ ایک بہت لطیف سا احساس تھا۔ دونوں اونچا اونچا ہنس دیے تھے۔

سرد سرد ماحول میں وہ ہنسی، گھر واپسی کے سفر پر روانہ ڈاکٹر تک بھی پہنچی تھی۔ وہ اپنی گلہری سمیت ٹھنک کر رکی تھی اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی تھی۔ شاید دونوں کی کیمسٹری میچ کر گئی تھی، تب ہی سنسان بن میں دونوں چہچہا رہے تھے۔ انسان ایسی ہی مخلوق ہے۔ حیران کن اور عجیب وغریب۔

دونوں ہم قدم تھے۔ عباد نے کسی شاخ کو دھیرے سے چھیڑا تھا اور برف پھر سے پھوار کی طرح گر پڑی تھی۔

''آپ کو برف کیسی لگتی ہے؟''

''اچھی لگتی ہے۔ سفید چادر جیسی۔ روشن

روشن۔"
"مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔ بہت مسٹری ہوتی ہے برف میں۔"
"مسٹری؟"
"ہاں جب ہم چھوٹے تھے تو برف کے میدانوں میں ہائیڈ اینڈ سیک (آنکھ مچولی) کھیلتے تھے۔ درختوں کے پیچھے چھپ جاتے تھے۔ ہم نے تو بہت بار سفید ریچھ بھی دیکھے۔"
وہ حیران حیران سی نظر آتی تھی۔ کتنا دلچسپ تھا ناں یہ سفید ریچھ کا قصہ بھی...... اور نیا بھی۔
"آپ کو ڈر نہیں لگتا تھا؟" وہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔ جیسے معمولی بات ہو۔ بہت معمولی۔
"نہیں تو...... مجھے تو خود شکار کا بہت شوق رہا ہے۔"
"ڈیڈی اور ان کے دوست بھی شکار کو جاتے ہیں۔ مگر مجھے یہ چیز کبھی اچھی نہیں لگتی۔"
"مگر کیوں؟" اب وہ اسے غور سے دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔ ایک دم سے وہ عام لڑکیوں جیسی بن گئی تھی۔
درنایاب نے تھرماس کو بہت احتیاط سے تھاما ہوا تھا۔
جانے اور ان دونوں نے کتنا چلنا تھا۔ جنگل کے رستے بھی تو بہت عجیب ہوتے ہیں۔ یا ختم ہو جاتے ہیں۔ یا شروع ہو جاتے ہیں۔
"جانوروں کی بھی تو فیملی ہوتی ہے۔ ان کے بھی تو بچے ہوتے ہیں۔ شکار ظالم چیز ہے ایک فیملی کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ جیسے ہم کھانے کی میز پر اپنے کسی گھر والے کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ بھی تو ایسے ہی ایک دوسرے کے منتظر ہوتے ہوں گے ناں۔"
عباد کریم ٹھٹک گیا تھا۔ اسے تو اپنے سرکل سے پتا چلا تھا کہ درنایاب ایک پریکٹیکل مائنڈڈ لڑکی ہے جو اپنی میچوریٹی اور صلاحیتوں کی وجہ سے مشہور تھی۔ مگر اس کے سامنے کھڑی تھرماس اور کپ تھامے دیودار کے درختوں کے بیچ وہ لڑکی، جس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ کوئی جذباتی شخصیت تھی۔
"چائے ہے؟" وہ دھیرے سے اسے اس کی خیالی دنیا سے برف کی دنیا میں کھینچ لایا تھا۔
"جی جی ہے۔ آپ پئیں گے؟" وہ خوشی خوشی پوچھ رہی تھی۔ فاطمی بوا کا مشورہ کام کر گیا تھا۔
"ہاں ضرور۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔"
ایک بوڑھے درخت کے تنے پر وہ بیٹھ گئے تھے۔ دور تک خشک پتے برف میں دھنس گئے تھے۔ برف کی مخصوص مہک پھیلی ہوئی تھی۔ تھرماس کی تیز دھار سے بھاپ اڑاتی چائے کپ میں انڈیل کر اس نے عباد کی طرف بڑھائی تھی۔ اور پھر اپنے لانگ کوٹ سے الائچی نکال کر بھی ڈال دی تھی۔ وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔
"کیا ہوا......؟ آپ ہنس رہے ہیں؟" اس نے اسے ہنستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔
عباد نے کپ تھام لیا تھا۔ درخت کے تنے کے دوسرے کنارے پر وہ اپنا کپ تھامے احتیاط سے ٹک کر بیٹھ گئی تھی۔
"ہاں......؟" وہ پھر ہنسا تھا۔
"مگر کیوں؟"
"میرے آس پاس لوگ آپ کو آپ کی دوسری بہت ساری خوبیوں کی وجہ سے جانتے ہیں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ آپ کی یہ سائیڈ کسی نے آج تک نہیں دیکھی ہوگی۔" چائے کی چسکیاں لیتی اس بار ہنسنے کی باری درنایاب کی تھی۔
"کیا ہوا؟ ہنس رہی ہیں آپ؟"
"جی ہاں مجھے ہنسی آ رہی ہے۔"
"مگر کیوں؟"
"اس لیے کہ ہر کوئی یہ کیوں سوچتا ہے کہ وہ کسی بھی انسان کو مکمل جاننے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ جبکہ ہم کبھی کبھی اپنی فیملی کے لیے بھی اجنبی ہوتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر اس کی ذاتی کائنات موجود ہوتی ہے جو ہر کسی پر نہیں کھلتی۔"

وہ چائے کے ساتھ ساتھ، اپنے سے کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی اس لڑکی کی باتوں سے بھی محظوظ ہو رہا تھا۔

''آپ ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتی ہیں؟''

وہ چونک گئی تھی۔ سرد ہوا کی لہر چلی تو اس نے گرما گرم کپ کے گرد ہاتھ باندھ لیے تھے۔

''کیسی باتیں؟''

''گہری گہری باتیں......''

''انگلش لٹریچر پڑھنے والی ایسی باتیں نہیں کرے گی تو کون کرے گا؟ جیسے آپ جیسے انجینئر اینٹ گارے سیمنٹ پتھر اور عمارتوں کی بات کر سکتے ہیں۔ تو ہم بھی کائنات قدرت اور فطرت کی بات کر سکتے ہیں۔''

اچھی طرح جتا کر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ وہ چپ چاپ چائے پیتا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا بحث کرنے کے فن میں بھی وہ طاق تھی۔

''چائے اچھی ہے۔ اور یہ الائچی نے اس کا ذائقہ دوبالا کر دیا ہے۔''

''شکریہ...... میں نے بنائی ہے۔''

''تو آپ کوکنگ بھی کر لیتی ہیں کیا؟'' تھرماس والی لڑکی نے اب کی بار خوشبوؤں میں مہکتے سیاہ لباس والے شخص کو کسی قدر ناراضی سے دیکھا تھا۔

''آج شام کے کھانے پر جو فرائیڈ فش...... اسٹیم روسٹ چکن اور آئس کریم آپ کھائیں گے۔ وہ بھی میں نے ہی بنائی ہے۔''

وہ پھر سے ہنس پڑا تھا۔ بس یونہی پہلے پہل وہ کتنی بور سی لگی تھی۔ مگر وہ اس کے اندازوں کے برعکس نکلی تھی۔ واقعی دیکھنے سننے والے کسی کو کتنا ہی جان سکتے ہوں گے؟

دونوں اب واپسی کی طرف آ رہے تھے۔ یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے۔

یہاں تک کہ وہ دونوں ایک برف کے ڈھیر کے پاس رک گئے تھے۔

وہ وہیں بیٹھ گئی تھی۔ برف اکٹھی کرنے لگی تھی۔ جیسے صدیوں سے اس کا یہی مشغلہ رہا ہو۔

اب وہ ڈھیرے ڈھیرے برف کا آدمی بنا رہی تھی۔

''آپ کو اچھا لگتا ہے سنو مین بنانا؟''

''مجھے نہیں کسی کو اچھا لگتا ہے۔ وہ یہی سوچ کر ہمارے ساتھ آئی تھی کہ وہ سنو مین بنائے گی مگر اسے اپنے پیشنٹ کی وجہ سے ایمرجنسی میں واپس جانا پڑا۔''

''پیشنٹ؟ آپ کا مطلب وہ ڈاکٹر ہے؟''

عباد کریم حیران نظر آ رہا تھا۔ اور برف کے آدمی کے کان بناتی ہوئی وہ پر سکون لگتی تھی۔

''ہاں پیشنٹ جانور بھی تو مریض ہوتا ہے۔ آپ کو اتنا حیران نہیں ہونا چاہیے۔ آخر کب ہم جانوروں کے حقوق کو تسلیم کرنا ریلائز کریں گے۔''

وہ بھی وہیں پاس سر ہلاتا ہوا درنایاب کے پاس بیٹھا ہوا برف کا آدمی بنانے میں مدد کرنے لگا تھا۔ برف پرانی تھی۔ بار بار کھل رہی تھی۔

کافی کوششوں کے بعد برف کا آدمی بن گیا تھا۔ صحیح سلامت جس کے ہاتھ، کان اور آنکھیں پوری تھیں۔

درنایاب نے خشک پتوں سے اس کے سر کے بال تک بنائے تھے۔

عباد کریم نے فوٹو کھینچ کر فون گیلری میں محفوظ کر لیے تھے۔ وہ دونوں اب تھرماس تھامے واپس جا رہے تھے۔

''ویسے ایک بات کہوں؟''

''جی کہیں......''

''بہت دلچسپ گزرے گی آپ کے ساتھ زندگی۔''

وہ گڑبڑا گئی تھی۔ سرد سرد موسم میں یہ حرارت بھرے لہجے ڈگمگانے آ گئے تھے۔

''چلیں ...... آج اپنا کوئی ایسا سیکرٹ شیئر کریں جو کسی کو پتا نہ ہو؟''

عباد کریم نے چنار کے درخت سے ٹیک لگائی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"میں ممی سے چھپ چھپ کر شرفو چاچا سے اخروٹ کا حلوہ لے کر کھاتی ہوں۔ اور پتا ہے ہمارے باغیچے میں چیری کے درختوں پر پرندے آتے ہیں۔" وہ شوق سے بتا رہی تھی۔ وہ شوق اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔

تب ہی جانے کیا سوچ کر درنایاب نے پوچھ لیا تھا۔

"آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟ میرا مطلب ہے کبھی آپ کے دل میں کوئی آیا؟" عباد کریم کو اس سوال کی ہرگز بھی توقع نہیں تھی۔ وہ سنجیدہ تھی۔

اس کی دوستوں کے گروپ میں ایسے ہی سوال و جواب ڈسکس ہوتے تھے۔ لاشعور میں چھپا ہوا وہ سوال سامنے آ گیا تھا۔

"نہیں مجھے پہلے کبھی محبت نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی میرے دل میں کوئی آیا ہے۔"

یہ کہہ کر عباد آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے مطمئن سی چہرے پر مسکراہٹ لیئے آگے بڑھ رہی تھی۔ عباد کے برف پر نشان چھوڑتے قدموں پر قدم رکھتے ہوئے! پیچھے...... تھوڑا سا اور پیچھے۔ خشک پتوں کے ڈھیر کے پاس۔

درنایاب کے بنائے گئے برف کے آدمی کا دھڑ ٹوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

اور پھر ایک سوال کے جواب پر یقین کر کے درنایاب نے زندگی کے پانچ سال گزار دیے تھے۔ یہی کہ عباد کے دل میں کوئی اور نہیں ہے۔ عباد کو کسی اور سے محبت بھی نہیں ہے۔ یہ الگ بات تھی کہ عباد کو محبت تو اس سے بھی نہیں تھی۔

دنیا کے لیے وہ ایک آئیڈیل کپل تھے۔ پرفیکٹ۔

پانچ سالہ شادی شدہ زندگی میں موی کی پیدائش کے ساتھ وہ کسی پنڈولم کی طرف صرف اپنے شوہر کے گرد گھومتی تھی۔ میکے کا رخ کرنا بھول جاتی تھی۔ ممی اور شمی کے بہت اصرار کے باوجود بھی وہ رات رکنے کا اہتمام نہیں کرتی تھی۔

موی بچپن سے ہی خاص بچی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی قوت گویائی لوٹ آئے گی۔ چار سال ہونے کو آئے تھے مگر وہ اب بھی اشاروں میں بات کرتی تھی۔

درنایاب اپنی اولاد اور اپنے شوہر پر جان دیتی تھی۔ یہ دیکھنے والے کہتے تھے۔ اور عباد کریم فخر سے سر اونچا کیے یہ تعریف وصول کرتا تھا۔ کہ جیسے یہ اس کا حق ہو۔ اس جیسے مرد کا حق کہ اس کی زندگی میں آنے والی عورت اس کے لیے اپنا آپ تیاگ دے۔ جیسے درنایاب نے یہی کیا تھا۔

ڈیڈی اور ڈاکٹر شمی کو اس سے بہت شکایتیں تھیں۔

"یہ تم ہو ناب؟ کیا سے کیا ہو گئی ہو؟ تم ایسی تو نہیں تھیں؟"

"کیسی...... کیسی ہو گئی ہوں؟"

"تم نے بال ڈائی نہیں کروائے۔ مینی پیڈی کروائے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ صرف یک طرفہ محبت پر سانس لے رہی ہو تم۔ عباد بھائی کو دیکھو کیسے سوٹڈ بوٹڈ رہتے ہیں۔"

"میں خیال رکھتی ہوں عباد کا۔ اس کی ہر ہر چیز کا۔ ٹائی سے لے کر ٹائی پن تک۔ شوز سے لے کر شو پالش تک۔ شرٹ کی کریز تک۔" شمی نے اسے پاس بٹھایا تھا۔ بڑی بہن کے چہرے پر بہت ساری تھکان جمع تھی۔

"کب تک؟ آخر کب تک؟"

وہ نظریں چرا گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح یہ موضوع ہی کچھ ایسا تھا۔

"عباد نے مجھے کہا تھا اس کے دل میں کوئی نہیں ہے۔ اسے کسی سے محبت نہیں ہوئی۔"

"مگر انہیں تم سے بھی محبت نہیں ہے۔ تم بھی تو ان کے دل میں نہیں ہو۔"

"کبھی تو میں ان کا دل جیت لوں گی شمی۔ کبھی تو وہ دن ضرور آئے گا۔"

وہ جگنو جیسی جھمک کرتی آنکھیں لے کر بیٹھی ہوتی تھی۔

"پانچ سال بیت گئے ہیں۔ دل میں جگہ بنانے اور خندق کھودنے میں بھی اتنا وقت نہیں لگتا۔ تم نے ہمیشہ عباد کے لیے کوششیں کی ہیں۔ اپنی پسند نا پسند پر کمپرومائز کیے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم بالکل ہی عباد بھائی بن گئی ہو۔ ان کی کاربن کاپی۔"

وہ آئینے کے سامنے کھڑی پہروں خود کو دیکھتی رہی تھی۔

آئینے میں عباد ہی عباد نظر آتا تھا۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر کی خاموشی میں گھر کی دیواریں جیسے سانس لے رہی تھیں۔ سردیوں کی ہلکی دھند کھڑکی کے شیشوں سے چمٹ کر اندر کی پیلی روشنی کو مدھم کر رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی گھڑی کی ٹک ٹک اس گھر کی واحد باقاعدہ آواز تھی۔ وہی گھر جس میں پانچ برس سے درنایاب نے اپنی ہنسی، اپنی نیند، اپنی خواہشیں آہستہ آہستہ رکھ دی تھیں۔ صرف اس امید پر کہ کبھی تو عباد کے دل کے بند دریچے کھلیں گے۔

کچن سے ہلکی سی الائچی اور دار چینی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چولہے پر چائے دھیمی آنچ پر رکھی تھی۔ درنایاب نے چمچے سے اسے آہستہ آہستہ ہلایا جیسے چائے نہیں، اپنے دل کی بے قراری کو ہموار کر رہی ہو۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت میں مہارت تھی۔ وہی مہارت جو کبھی اس کی شناخت تھی۔ کالج کی ذہین ترین طالبہ، مباحثوں کی فاتح، گھر سنبھالنے میں ماہر، ہر کام میں سلیقہ مند، مگر شادی کے پانچ برسوں نے اس کی تمام کامیابیاں جیسے کسی صندوق میں بند کر دی تھیں۔

آج اس نے خاص اہتمام کیا تھا۔ عباد کی پسند کی سفید قمیص استری کر کے بستر پر رکھی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کے پسندیدہ برتن سجا دیے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ آج کی رات مختلف ہو۔ آج وہ عباد سے بات کرے گی۔ صاف، بے لاگ، دل کی بات۔

دروازہ کھلا۔ عباد اندر آیا۔ حسب معمول تیز قدم، سیدھی گردن، آنکھوں میں وہی خود اعتمادی جو کبھی درنایاب کو مسحور کر دیتی تھی اور اب کبھی کبھی اسے چبھنے لگتی تھی۔ اس نے کوٹ صوفے پر ڈالا اور بغیر ادھر ادھر دیکھے بولا تھا۔

"درنایاب! پانی۔"

درنایاب فوراً لپکی۔ ٹرے میں گلاس رکھا اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک تھی جیسے کوئی بچہ اپنی محنت کا نتیجہ دیکھنے کو بے تاب ہو۔

"آج آپ تھک گئے ہوں گے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

عباد نے گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے سرسری سا جواب دیا تھا۔

"میٹنگ تھی۔ تم نہیں سمجھو گی۔"

یہ جملہ درنایاب نے سینکڑوں بار سنا تھا۔ تم نہیں سمجھو گی۔

وہ جو کبھی مشکل سے مشکل دلیل کو چند منٹوں میں کھول کر رکھ دیتی تھی۔ آج اپنے ہی شوہر کی زندگی کو نہ سمجھنے والی قرار دی جاتی تھی۔ وہ مسکرائی۔

"کوشش تو کر سکتی ہوں نا عباد؟"

عباد نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ نظر میں ہلکی سی ناگواری تھی۔

"درنایاب! ہر بات میں گھسنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گھر سنبھالو، وہی کافی ہے۔"

یہ جملہ نرم لہجے میں تھا۔ مگر اس کے اندر حکم کی سختی تھی۔

درنایاب کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے کا کنارہ لرز گیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ وہ جانتی تھی، اگر اس نے اس وقت کچھ کہہ دیا تو عباد اسے، ڈرامائی قرار دے گا۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا۔ عباد نے ایک نوالہ لیا سر ہلایا۔

"نمک تھوڑا کم ہے۔"

درنایاب نے فوراً معذرت کی تھی۔

"میں ابھی ٹھیک کر دیتی ہوں۔"

"چھوڑو۔" عباد نے بے دلی سے کہا۔ "ویسے بھی تم پرفیکشنسٹ بننے کی کوشش میں اکثر گڑبڑ کر دیتی ہو۔"

درنایاب کے ذہن میں جیسے کوئی پرانا دروازہ چرچرا کر کھلا۔

پرفیکشنسٹ؟ وہ تو واقعی تھی کبھی۔ جب وہ اپنے لیے جیتی تھی۔

وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ آج وہ خاموش نہیں رہے گی۔ آج نہیں۔

"عباد میں آپ سے کچھ پوچھوں؟"

"ہمیشہ پوچھتی ہی رہتی ہو۔ پوچھ لو۔"

"کیا..... کیا میں واقعی آپ کے لیے کافی نہیں ہوں؟"

کمرے کی فضا جیسے اچانک ساکت ہو گئی۔ گھڑی کی ٹک ٹک تیز سنائی دینے لگی۔

عباد نے چونک کر اسے دیکھا، پھر ہلکی سی ہنسی ہنسا۔

"یہ پھر شروع ہو گیا؟ درنایاب تمہیں مسئلہ کیا ہے؟ میں تمہیں سب کچھ تو دیتا ہوں۔ اچھا گھر، آرام، عزت اور کیا چاہیے؟"

درنایاب کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی مگر اس نے آواز کو مضبوط رکھا۔

"مجھے آپ چاہیے تھے عباد۔ صرف آپ..... آپ کی توجہ۔ آپ کی محبت۔ آپ کا مان۔ پانچ سال ہو گئے ہیں۔ میں نے کبھی شکایت نہیں کی۔ آپ کی پسند کے کپڑے پہنے۔ آپ کے سرکل کے سامنے آپ کی پسند کے مطابق خود کو ڈھالا۔ اپنی نوکری چھوڑ دی کیونکہ آپ کو پسند نہیں تھا کہ میں باہر کام کروں۔ میں نے اپنی ہر کامیابی کو آپ کے قدموں میں رکھ دیا۔ مگر کبھی آپ نے..... کبھی آپ نے مجھے ویسے دیکھا جیسے میں آپ کو دیکھتی ہوں؟"

عباد کے چہرے پر ناگواری گہری ہو گئی۔

"یہ جذباتی تقریریں مجھے پسند نہیں۔ تم نے جو کیا اپنی مرضی سے کیا۔ میں نے زبردستی نہیں کی تھی۔"

"مگر آپ کی خوشی میری مرضی بن گئی تھی عباد!" درنایاب کی آواز پہلی بار بلند ہوئی۔ "میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ بہت زیادہ۔ شاید اتنی کہ خود کو بھول گئی۔" عباد نے کرسی پیچھے دھکیلی اور کھڑا ہو گیا۔

"محبت کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دو۔ میں جیسا ہوں ویسا ہوں۔ مجھے بدلنے کی کوشش مت کرو۔"

درنایاب بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے وجود میں پہلی بار کوئی نئی طاقت جاگ رہی تھی۔

"میں آپ کو بدلنا نہیں چاہتی۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ آپ مجھے قبول کریں۔ میری ذہانت کو، میری رائے کو، میرے وجود کو۔ میں صرف ایک سجی ہوئی بیوی نہیں ہوں عباد۔ میں درنایاب ہوں وہی لڑکی جو کبھی اپنے خوابوں پر یقین رکھتی تھی۔"

عباد نے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر تمہیں اتنا ہی مسئلہ ہے تو خود کو بدل لو۔ ڈرامے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

درنایاب وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کے کانوں میں اس کے قدموں کی آواز گونجتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔

کھڑکی کے باہر دھند گہری ہو چکی تھی۔ اس نے آہستہ سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ آنسو بہہ نکلے..... خاموش بے آواز۔ پانچ سال کی محبت، خدمت، سمجھوتے سب اس کے سامنے تصویروں کی طرح گھومنے لگے۔ ہر وہ لمحہ جب اس نے اپنی خواہش کو مارا، ہر وہ وقت جب اس نے عباد کی تعریف کے دو لفظوں کے لیے رات بھر جاگ کر اس کی فائلیں ترتیب دیں، ہر وہ دن جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھ کر سوچا۔ شاید آج وہ مجھے دیکھ لے۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی تھی۔

"کیا محبت واقعی اتنی کمزور ہوتی ہے یا میں نے

خود کو بہت ستا کر دیا؟''
کمرے کی خاموشی نے کوئی جواب نہ دیا۔
یہ معمول کی بات تھی۔ ہر روز یہی تو ہوتا تھا اور بات ختم ہو جاتی تھی۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ بات جہاں ختم ہوتی تھی، وہیں سے دوبارہ شروع بھی ہو جاتی تھی۔
عباد کریم کے سامنے درنایاب ایک ''بونا'' بن جاتی تھی اور بس......!

☆☆☆

شام کی ہلکی سنہری روشنی پردوں سے چھن کر ڈرائنگ روم میں پھیل رہی تھی۔ گھر آج کچھ زیادہ ہی سجا ہوا تھا۔ جیسے دیواروں نے بھی خوشی کا لباس پہن لیا ہو۔ میز پر سفید ریشمی کپڑا، اس پر سنہری کناروں والے برتن، بیچ میں تازہ گلاب اور ان سب کے درمیان درنایاب کی محبت جو نظر تو نہیں آتی تھی مگر ہر شے میں بسی ہوئی تھی۔ وہ کچن سے آخری ڈش نکالتے ہوئے مسکرائی۔
''عباد خوش ہوگا۔'' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ کیونکہ آج لندن سے عباد کا دوست آ رہا تھا۔ جس کا ذکر وہ کئی بار گزرے ہوئے سالوں میں عباد سے سن چکی تھی۔
دروازے کی گھنٹی بجی۔
''حسنات!'' عباد کی آواز میں بے ساختہ جوش تھا ایسا جو درنایاب نے شاید اپنے لیے کم ہی سنا تھا۔
گلے ملنے کی آوازیں، قہقہے، پرانی یادوں کی خوشبو۔ درنایاب ہلکے گلابی لباس میں کمرے میں آئی۔ چہرے پر نرم سی مسکراہٹ۔
''السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام بھابھی! عباد نے سچ کہا تھا آپ واقعی بہت نفیس ہیں۔''
وہ شرما کر مسکرادی۔ عباد نے ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا، مگر فوراً باتوں میں کھو گیا۔ وہ لمحہ مختصر تھا مگر درنایاب کو اس کی عادت تھی۔ وہ اس کی توجہ مانگتی نہیں تھی بس اس کے آس پاس رہ کر خوش رہتی تھی۔
کھانے کی میز انواع واقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔ طرح طرح کے کھانے۔ نمکین اور میٹھے کی بہت ساری اقسام۔ دیسی اور کانٹینیٹل کی ورائٹی بھی موجود تھی۔ حسنات حیران ہوا تھا۔
''یہ سب آرڈر کیا ہے کیا؟''
''ارے نہیں۔ درنایاب نے سب گھر پر بنایا ہے۔''
حسنات نے جی بھر کر کھانا کھایا تھا۔ وہ بلا کا باتونی تھا۔ وہ ان کے لیے ڈھیروں قیمتی تحائف بھی لے کر آیا تھا۔ موی سے تو وہ خاص طور پر پیار سے ملا تھا۔ دونوں شاید بہترین دوست تھے۔ تب ہی آج مدت بعد وہ عباد کو خوش اور ہنستا مسکراتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ ورنہ تو اسے یہی لگا تھا کہ اینٹ۔ گارے اور پتھر کی عمارتیں بنانے والے انسان میں وہی سختی در آئی ہے۔
وہ ڈنر کے بعد کافی بنانے کے لیے کچن میں آ گئی تھی۔ عباد اسے حسنات کی پسندیدہ کافی کے بارے میں ہدایات پہلے ہی دے چکا تھا۔
حسنات جیسے اپنے ساتھ رونق لے کر آیا تھا۔ اس کی باتوں کی آواز کچن تک سنائی دے رہی تھی۔
''یار عباد۔ یاد ہے وہ کلچرل فیسٹیول؟'' حسنات نے ہنستے ہوئے کہا۔
''جب تم پہلی بار اسے دیکھ کر بالکل ساکت ہو گئے تھے؟''
درنایاب کے ہاتھ میں پکڑا کافی سے بھرا ہوا چمچہ کپ سے ٹکرایا۔ آواز بہت مدھم تھی، مگر اس کے دل میں جیسے کوئی چیز ٹوٹ کر گری تھی۔ پتا نہیں کس کی بات ہو رہی تھی۔ شاید کسی لڑکی کی۔
عباد نے پانی کا گھونٹ لیا۔
''چھوڑو بھئی پرانی باتیں ہیں۔''
''کیوں چھوڑوں؟ بھابھی کو بھی تو پتا چلے کہ ہمارے دوست کی پہلی نظر کی محبت کتنی سچی تھی!''
پہلی نظر کی محبت؟ کیسی محبت؟ کس کی کس سے محبت؟

یہ الفاظ درنایاب کے کانوں میں گونجے۔ اس نے کبھی عباد سے اس کے ماضی کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ محبت سوال نہیں کرتی بس یقین کرتی ہے۔

مگر اگلے ہی لمحے عباد کی آواز آئی۔ گہری، سنجیدہ، اور سچی۔

''پہلی نظر کی محبت بھولتی نہیں حسنات۔ کچھ چہرے دل پر ایسے نقش ہو جاتے ہیں کہ وقت بھی انہیں مٹا نہیں پاتا۔ انسان زندگی گزار لیتا ہے۔ مگر دل کے کسی کونے میں وہ احساس سانس لیتا رہتا ہے۔''

درنایاب کا سانس رک گیا۔

''زندگی گزار لیتا ہے؟ تو کیا وہ درنایاب صرف زندگی گزارنے کا حصہ تھی؟''

''تو مطلب آج بھی یاد ہے؟'' حسنات نے چھیڑا۔

عباد ہلکا سا مسکرایا مگر اس کی آنکھوں میں ایک پرانی نمی جھلکی۔ ''یادیں کبھی مرتی نہیں ہیں۔ بس ہم جینا سیکھ لیتے ہیں۔''

یہ جملہ درنایاب کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔ اسے لگا جیسے کمرے کی فضا گھٹ گئی ہو۔ سانس لینا دشوار۔ آنکھوں کے سامنے سب دھندلا سا۔

پانچ سال کیا وہ ان پانچ سالوں میں کبھی عباد کے دل تک پہنچی ہی نہیں؟

سلیب کے پیچھے کھڑی ہو کر اس نے دونوں ہاتھ سنک کے کنارے پر رکھ دیے۔ اس کی انگلیاں سرد پڑ چکی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک منظر ابھرنے لگا۔ وہ لمحے جب اس نے عباد کی خاموشی کو بھی محبت سمجھ کر قبول کر لیا۔

اور آج اسے معلوم ہوا کہ اس کے شوہر کے دل میں ایک ایسا گوشہ ہے جہاں وہ کبھی داخل ہی نہیں ہوئی۔

ڈرائنگ روم سے حسنات کی آواز آئی تھی۔

''عباد! بھابھی بہت محبت کرنے والی لگتی ہیں۔ خوش قسمت ہو تم۔''

چند لمحے خاموشی۔ طویل خاموشی لاؤنج میں لگے وال کلاک کی سوئیوں کی آواز درنایاب کے کانوں میں چبھنے لگی تھی۔ پانی ابلنے کی آواز تیز ہوتی گئی۔ پھر عباد نے کہا تھا۔

''ہاں وہ بہت اچھی ہے۔ میرے گھر والوں کی پسند ہے۔ مگر میرا یہ فیصلہ اچھا ثابت ہوا۔ ورنہ پہلی نظر کی محبت کہاں ملتی ہے۔ وہ تو کوئی خواب تھا۔ جادو تھا۔ جس کے اثر میں آج تک زندہ ہوں۔''

درنایاب کے دل میں کچھ بکھر گیا۔

''بہت اچھی ہے۔ بس اتنا؟ کیا وہ صرف اچھی تھی؟ محبت نہیں تھی؟''

آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہہ نکلے۔ اس نے جلدی سے صاف کیے چہرے پر مصنوعی سکون سجایا اور میٹھا لے کر واپس آئی۔

''یہ لیجیے۔'' اس کی آواز معمولی حد تک ہموار تھی۔

عباد نے اسے غور سے دیکھا۔ شاید اسے آنکھوں کی سرخی دکھائی دی مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔

دعوت ختم ہوئی۔ حسنات چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گھر پر ایک بھاری خاموشی اتر آئی۔

درنایاب کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ باہر اندھیرا گہرا تھا بالکل اس کے دل کی طرح۔

عباد آہستہ سے اس کے پاس آیا۔ جیسے اس نے کچھ محسوس کر لیا تھا۔

''تم نے سن لیا تھا؟''

وہ مسکرائی۔ ایسی مسکراہٹ جو آنکھوں تک نہ پہنچی۔ ''ہاں سنا تھا۔''

''درنایاب! وہ بس پرانی بات تھی۔''

وہ مڑی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، مگر آواز میں صرف ٹوٹا ہوا یقین تھا۔

''پرانی باتیں اگر دل میں زندہ ہوں تو پرانی نہیں ہوتیں عباد۔''

وہ چند قدم اس کے قریب آئی۔

"میں نے کبھی تم سے تمہارا ماضی نہیں پوچھا۔ کبھی یہ نہیں جاننا چاہا کہ تم نے کس کو چاہا تھا۔ میں نے بس تمہیں چاہا۔ پورے یقین کے ساتھ کہ کبھی تو تمہارے دل کے دروازے میرے لیے کھلیں گے۔

ٹھیک کہتی ہے ڈاکٹر شبانہ۔ تم جیسے مرد بہت سیلف اوبسیسڈ ہوتے ہو۔ جنہیں اپنے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ تمہیں تو پہلی نظر کی محبت کے جادو نے اسیر کر لیا تھا۔ مگر میری زندگی تو تمہاری محبت کے پانچ سالوں کے جادو سے چل رہی تھی۔ افسوس وہ جادو آج ٹوٹ گیا ہے۔ اور میں حقیقت کو دیکھ پا رہی ہوں۔"

اس کی آواز لرزنے لگی۔

"مگر آج پہلی بار محسوس ہوا کہ میں تمہاری محبت نہیں..... تمہاری ضرورت ہوں۔"

عباد کے چہرے پر ندامت سی ابھری مگر الفاظ پھر بھی کم پڑ گئے۔ درنایاب کے آنسو اب رک نہیں رہے تھے۔

"میں نے تمہارے لیے اپنی خواہشیں چھوڑ دیں، اپنے خواب سمیٹ دیے۔ تمہاری ہر خاموشی کو محبت سمجھ کر قبول کیا۔ مگر آج جانا کہ تمہارے دل میں ایک ایسا کمرہ ہے جہاں میرا داخلہ منع ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "یہاں بہت درد ہو رہا ہے عباد۔ ایسے جیسے کسی نے میرا یقین توڑ کر میرے ہی ہاتھ میں رکھ دیا ہو۔"

کمرے کی روشنی مدھم تھی۔ اس کی سسکیاں خاموشی میں گونج رہی تھیں۔

"میں تم سے مقابلہ نہیں چاہتی نہ اس لڑکی سے نہ تمہارے ماضی سے۔ میں بس یہ جاننا چاہتی تھی کہ میں تمہارے دل میں کہاں ہوں۔"

چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی معلق رہی۔

"اگر میں صرف ذمہ داری ہوں تو مجھے سچ بتا دو۔ کیونکہ محبت میں بانٹا ہوا دل قبول نہیں ہوتا۔"

یہ کہہ کر وہ بستر کے کنارے بیٹھ گئی۔ کندھے لرز رہے تھے۔

آج پہلی بار نایاب کو اپنی محبت کمزور نہیں خود اپنا آپ کمزور محسوس ہوا تھا۔ جیسے اس نے پانچ سال ایک ایسے درخت کو پانی دیا ہو جس کی جڑیں کہیں اور تھیں۔ اور عباد۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا مگر شاید بہت دور۔

کچھ زخم خاموشی سے ناسور بن جاتے ہیں اور انسان کو اندر سے خالی کر دیتے ہیں۔

اس رات درنایاب کا دل واقعی زخمی ہوا تھا۔ صرف الفاظ سے نہیں اس احساس سے کہ جس محبت کو وہ مکمل سمجھتی تھی وہ دراصل ادھوری تھی۔

برف والے جنگل میں عباد نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ درنایاب جس نے دوستوں میں بیٹھ کر دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے دل پر حکومت کرے گی۔ وہ جیتنے اور حکومت کرنے کے لیے ہی تو بنی ہے۔ مگر وہ غلط تھی۔

شادی شدہ زندگی بھی واقعی بازی جیسی ہوتی ہے۔ کبھی جیت اور کبھی مات۔ اور یہاں تو بس مات ہی مات تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ آج پانچ سالہ شادی شدہ زندگی کے بعد سوٹ کیس کے ساتھ ڈیڈی کے گھر آ گئی تھی۔ اور اس نے شام کے کھانے کی میز پر سب کو بتا دیا تھا۔

ممی، فاطمی بوا، ڈاکٹر شبانہ، سب نے اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

مگر ڈیڈی نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر آنسو پونچھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"تم جو بھی فیصلہ کرو گی نایاب..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔"

وہ ڈیڈی سے لپٹ گئی تھی۔ خلع کے پیپر عباد کریم تک پہنچ گئے تھے۔

پریکٹیکل مائنڈڈ مرد چکرا کر رہ گیا تھا۔ گھر کے ہر کونے کھدرے میں نایاب تھی۔ اب صورت حال بدل گئی تھی۔

عباد کریم کو شیشے میں درنایاب نظر آتی تھی۔

اور وہ پہلی نظر کی محبت یہ وہ دل کے کسی دوسرے تیسرے کونے میں اب بھی تھی۔ مرد کا دل اور چار خانے۔

☆☆☆

عباد کریم کو پہلی نظر کی محبت ایک خوب صورت اور حسین شام میں آرٹس کونسل کے کلچرل ایونٹ میں ایک چہرے کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ اپنے سرکل میں بہت سنجیدہ اور بہت بور ہینڈسم کے طور پر مشہور تھا۔ محبت اور عشق جیسی خرافات کی جگہ اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھی۔ تب ہی ایک دن حسنات نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''آج میری ایک بات کہیں لکھ کر رکھ لو۔ تم جیسے لوگ جو محبت اور عشق کو ایک خرافات سے بڑھ کر کچھ نہیں سمجھتے اور ہم جیسے عاشقوں کا محفلوں میں کھلم کھلا مذاق اڑاتے ہو، اس کی تمہیں بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔''

حسنات کے اس بھاری قسم کے پیراگراف پر عباد دل کھول کر ہنسا تھا۔

''کون سی بھاری قیمت؟''

''تم جیسے لوگ جو محبت سے الرجک ہوتے ہو۔ محبت ایسے لوگوں سے خوب انتقام لینا جانتی ہے۔''

''اور کیا ہوتا ہے اس محبت کا انتقام؟''

''پہلی نظر کی محبت جو جادو جیسی ہوتی ہے۔ سحر طاری کر دیتی ہے۔ اور پہلی نظر کی محبت کے جادو کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔''

آرٹس کونسل کی سرخ اینٹوں والی عمارت کی سیڑھیوں پر عباد کریم نے اس حسین اپسرا کو بہت دور سے دیکھا تھا اور پہلی نظر کی محبت کا جادو چل گیا تھا۔ اور کتنی عجیب بات تھی کہ اس اپسرا کے چہرے کا کوئی بھی نقش عباد کی یادداشت میں واضح نہیں تھا۔ بس اس کا ''موجود'' ہونا پوری کائنات پر حاوی ہو گیا تھا۔ وہ شاید کسی ڈرامے میں پرفارم کر رہی تھی اور اپنے کردار کے مطابق کاسٹیوم میں بھی تھی۔ سیاہ سلک کی سفید موتیوں سے سجی ہوئی ساڑھی پہنے اور لمبے گھنے بالوں کی چوٹیوں میں سفید پھول ٹانکے وہ جادو ہی کر رہی تھی۔

یہ بہت سال پہلے کی بات تھی۔ مگر یہ بہت سالوں کے بعد بھی قائم رہی تھی۔ اپنے حسن اور اپنے جادو کے ساتھ۔

☆☆☆

عباد نے درنایاب سے رابطے کی بہت ساری کوششیں کی تھیں مگر ساری ناکام رہی تھیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ وہ ان پانچ سالوں میں درنایاب کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ دنیا دیکھنے والا انسان ایک عورت کو ابھی تک جان ہی نہیں پایا تھا۔ شادی شدہ عورت بھی عجیب پہیلی ہوتی ہے۔ ایک مدت کے بعد سمجھ میں آنا بند ہو جاتی ہے۔ بہت ساری باتیں اپنے اندر کہیں رکھنا شروع کر دیتی ہے۔ اور شادی کے کتنے سالوں بعد کسی جذباتی سی شام کے منظر نامے میں وہ ساری باتیں ابل ابل کر باہر آ جاتی ہیں۔ اپنے تعفن سمیت درنایاب کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

ساری کوششیں کر کے ہار چکا تھا۔ کاروبار میں کامیاب شخص زندگی میں ناکام کیسے ہو سکتا تھا۔

لکڑی کی اس قدیم اور پختہ الماری سے کچھ سامان گر پڑا تھا۔ یہ الماری ڈیڈی نے اپنی نگرانی میں فرنیچر ورکشاپ سے بنوائی تھی۔ اور اس کا ڈیزائن بھی ممی کی کسی فرینڈ نے انڈیا سے بھجوایا تھا۔ شادی شدہ عورت کا جہیز بھی بہت ساری کہانیوں کے ساتھ مل کر بنتا ہے۔ بہت ساری کہانیوں کے ساتھ مل کر بگڑتا ہے۔ اور اگر یہ شادیاں ٹوٹ جائیں تو؟

عباد نے الماری سے گرنے والا وہ سامان ڈھیر نے سے اٹھایا تھا۔ شاید یہ کوئی درنایاب کا پرانا فوٹو البم تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ پرانی چیزوں کو سنبھال سنبھال کر رکھنے والی۔ شاید ساری شادی شدہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ کبھی کبھار کچن کے ٹائلوں والے فرش پر اپنا پرانا البم کھولے اپنی گزری ہوئی یادوں کو یاد کر کے ہنستی رہتی ہوں گی۔

عباد نے وہ فوٹو البم کھولا تھا۔ ایک ایک کر کے بہت ساری تصویریں گرنے لگی تھیں۔

وہ کوئی اپسرا تھی۔ سیاہ سلک کی ساڑی میں بالوں میں سفید گلاب ٹانکے منہ پر ہاتھ رکھے دوستوں کے جھرمٹ میں بے تحاشا ہنستی ہوئی۔

عباد کے ہاتھ لرزنے لگے۔ کانپنے لگے۔ وہ ایک ایک کر کے ساری تصویریں دیکھ رہا تھا۔

یہ وہی آرٹس کونسل کی شام تھی۔ جگمگاتی ہوئی۔ پہلی نظر کی محبت کا جادو کرتی ہوئی۔

کہتے ہیں ناں زندگی میں کبھی کبھی سامنے کھڑے ہوئے پہاڑ بھی نظر نہیں آتے۔

ٹھیک کہتے ہوں گے۔ عباد کریم کو سامنے اپنی زندگی کا حاصل پہلی نظر کی محبت، درنایاب عرف ناب بھی نظر نہیں آئی تھی۔ یہ کس موڑ پر آ کر عباد کریم کو مات ہوئی تھی۔

کاش عباد کریم کے دل میں اتنی وسعت اور ظرف ہوتا تو شاید وہ درنایاب کو جان لیتا۔ وہ فوٹو البم تھامے گھٹنوں پر سر رکھے تڑپ تڑپ کر سسک رہا تھا۔ رو رہا تھا۔

فرنیچر لے جانے والے ملازمین نے حیرت سے اس شان دار مرد کو روتے ہوئے دیکھا تھا اور انہوں نے یہی بات کالج میں درنایاب کو بھی بتائی تھی۔

ممی نے درنایاب کو عباد کی آمد سے مطلع کیا تھا۔

عباد فوٹو البم کے ساتھ درنایاب کے سامنے موجود تھا۔ وہ بے تحاشا خوش لگ رہا تھا۔ ہنستے ہنستے رو رہا تھا۔ روتے روتے ہنس رہا تھا۔

درنایاب نے شدید حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ کیا ہو گیا تھا اسے۔ عباد نے درنایاب کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"تمہیں پتا ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جس سے مجھے پہلی نظر میں محبت ہوئی تھی۔ سچ میں۔ میرا یقین کرو۔ یہ فوٹو البم دیکھو۔ یہ تمہاری پرانی تصویریں ہیں ناں۔ آرٹس کونسل کے ایونٹ کی۔ میں بھی اس شام اس ایونٹ میں حسنات کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے پہلی بار تمہیں وہاں دیکھا تھا اور تب سے لے کر آج تک میں تمہیں نہیں بھول پایا۔ تم مجھے سن رہی ہو ناں.....؟"

وہ یقین دہانی چاہ رہا تھا۔ ناب نے سر کو اثبات میں ہلایا تھا۔

"میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ پانچ سالوں میں میں نے کبھی تمہیں ایسے نہیں دیکھا ناں۔"

"میرے ساتھ چلو ہم گھر چلتے ہیں۔ موی کہاں ہے۔ یقیناً ڈاکٹر شبانہ کے ساتھ ہو گی۔ ان کے زخمی پرندوں کے ساتھ۔"

عباد درنایاب کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہتا تھا مگر وہ گیلی مٹی کی طرح وہیں صوفے پر بیٹھی رہ گئی تھی۔ سامنے کھڑے مرد کے چہرے پر بے تابیاں تھیں۔ کائنات کے مل جانے جیسی خوشی تھی۔ اس نے دھیرے سے عباد کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"چلے جاؤ عباد! اب میرے دل میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تم میرے دل میں یہ جگہ واپس حاصل کرنے کے لیے کیا پانچ سال اپنا آپ بھلا کر دن رات کوششیں کر سکتے ہو؟ تم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تم ایک مرد ہو۔ اور میں ایک عورت۔ عورت شادی شدہ زندگی میں محبت کی بازی لگا دیتی ہے۔ مگر مرد یہ نہیں کرتا۔ وہ صرف نفع کا سودا کرتا ہے۔ ممی کہتی ہیں شادی شدہ مرد اور عورت کا رشتہ "کاج بٹن" کے جیسا ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں اور نامکمل۔ لیکن میں تمہیں ایک بات کہوں۔ مجھے ممی کی اکثر باتوں کی فلاسفی سمجھ میں نہیں آتی۔ اور جو چیز سمجھ میں نہ آئے اسے چھوڑنا بہتر ہے۔"

وہ دن عباد کریم کے لیے آکسیجن سے خالی ہو گیا تھا۔ وہ بمشکل سانس لے پا رہا تھا۔ فاطمی بوا نے درنایاب کو بے تحاشا میٹھا کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

میٹھا کھانا اس کے لیے زہر تھا۔ اس کا وزن بڑھ جاتا تھا۔ سوجن ہو جاتی تھی۔ پہلی نظر کی محبت کے موسم میں وہ میٹھے سے پرہیز کیا کرتی تھی۔ اور اب وہ

چیکے چیکے ڈھیروں میٹھا پھانک رہی تھی۔ ڈاکٹر شمی کے صحت یاب ہونے والے بہت سارے مریض گلہری۔ خرگوش اور جنگلی کتے اکثر اپنی طبیب کے پاس حال احوال کے لیے کاٹیج کی سیڑھیوں کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ آج بھی شمی اور موی ان صحت یاب جنگلی مریضوں سے ملاقات کے بعد اندر قدم رکھ رہی تھی۔

ماضی کا ثام کروز عباد خالی ہاتھ واپس جا رہا تھا۔ سیڑھیوں کے پاس شمی کے پاس رک گیا تھا۔ اداسی سے پوچھ ہی لیا۔

''تمہیں یاد ہے پانچ سال پہلے والی وہ زخمی گلہری جو برف کے طوفان میں ہمیں جنگل کے راستے میں ملی تھی؟''

شمی کی نظریں عباد کے پیچھے دور لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ہوئی بڑی بہن تک گئی تھیں۔

''نہیں مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔''

عباد سر ہلاتا ہوا شمی کی انگلی تھامے موی سے لپٹ گیا تھا۔ آج اسے اپنی اولاد عزیز ترین لگ رہی تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار اسے اپنی بیٹی کی قوت گویائی کی فکر ہوئی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ دور بیٹھی ہوئی وہ وہیں سے باپ بیٹی کو بس دیکھے جا رہی تھی۔ تب ہی کاٹیج کے پھاٹک سے ڈیڈی اپنے دوست کے ساتھ مرغابیاں شکار کر کے واپس آ رہے تھے۔ چہرے پر فتح تھی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے۔

ہر طرف عجیب خاموشی تھی۔ دور کہیں بانس کے جنگل سے پرندوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور ہاں تب ہی ایک اور نامانوس آواز فضا میں پہلی بار گونجی تھی۔

پاپا...... پاپا...... ماما...... ماما۔

یہ موی کی آواز تھی۔ چار سال بعد۔

لفظوں کو رہائی مل گئی تھی۔ وہ خوشی سے بار بار چیخ رہی تھی۔ در نایاب جیسے کسی خواب میں تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی ننگے پاؤں باہر آئی تھی۔

گھر کے سارے افراد سیڑھیوں کے پاس جمع تھے۔ نایاب کی آنکھوں میں موتی تھے۔ وہ اور عباد اپنی بیٹی کو پیار کر رہے تھے۔ چوم رہے تھے۔

دھیرے سے نایاب نے خود کو سنبھالا تھا اور ڈیڈی کے پاس آئی تھی جو شکار کی ہوئی مرغابیاں تھامے سامنے کھڑے تھے۔

''آپ وعدہ کریں مجھ سے۔ آج کے بعد آپ شکار پر نہیں جائیں گے۔ جانوروں کی بھی فیملی ہوتی ہے ڈیڈی۔ جو رات کے کھانے پر ان کا انتظار کرتی ہے۔'' ڈیڈی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پھر وہ چلتی ہوئی فاطمی بوا کی طرف آئی تھی۔

''کچن کی کھڑکی کھول دیا کریں۔ اب چیری کے درختوں پر پرندے آئیں گے اور شرفو چچا کو پیغام بھجوا دیں کہ اب ان کے اخروٹ کے حلوے کے لیے دو گاہک موجود ہوں گے۔ میں اور موی۔''

سب سے آخر میں اپنے گرد شال لپیٹتے ہوئے وہ ممی کے پاس آئی تھی، جو گم صم سی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔

''آپ نے ٹھیک کہا تھا ممی۔ شادی شدہ زندگی میں مرد اور عورت ''کاج بٹن'' کے جیسے ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ضروری۔ لیکن آپ کو ایک بات بتاؤں کاج بٹن کے اس رشتے میں اولاد دھاگہ ہوتی ہے۔ جو دونوں کو جوڑ کر رکھتی ہے۔ مجھے دیکھ لیں اپنی بیٹی کو جو آپ کے سامنے ''کاج'' بن کر کھڑی ہے۔ وہ دیکھیں آپ کا داماد جو میرے لیے ''بٹن'' بن چکا ہے اور میری اولاد میری موی ایک ''دھاگا'' جس نے مجھے دوبارہ اس رشتے سے جوڑ دیا ہے۔''

کاٹیج کے مکینوں نے اسے بڑی شان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔

آخر پانچ سالوں کے بعد در نایاب کو اپنا تاج اور اپنی کلغی واپس مل گئی تھی۔

☆☆

آمنہ عائش

خوشیوں بھری عید

یہ کیسی سیاہ آندھی چلی تھی جو سب کو بہا لے گئی تھی۔

رحمان منزل، رحمان اور زمان دو بھائیوں کا مسکن تھی۔ دونوں کا پیار و محبت مثالی تھا۔ شادی ہوئی، بچے ہوئے، بڑے ہو گئے مگر یگانگت نہ گئی۔ یہی نہیں دونوں کی بیگمات اور بچوں کے درمیان بھی قابلِ رشک دوستانہ تھا۔

رحمان صاحب کے چار بچے تھے، جن میں سب سے بڑی بیٹی یشفا، پھر طاہر، ناظر اور باسط تھے جبکہ زمان صاحب کی بالترتیب چار بیٹیاں تھیں شمع، فرح، ندا اور عمارہ۔

اس مثالی گھرانے کو دیکھ کر اردگرد والے تعریف کرتے، کچھ رشک کرتے تو کچھ حسد میں مبتلا تھے۔

چند ایک نے اس اتفاق میں دراڑ ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر ناکامی مقدر رہی۔ تمام خوبیوں کے باوجود زمان صاحب قدرے جذباتی اور غصے کے تیز تھے، غصے میں فوری ردعمل دیتے —— ضدی اور ہٹ دھرم بن جاتے مگر رحمان صاحب کے بڑے پن اور تدبر نے ان کی اس خامی پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ مگر کب تک، آخر وہ وقت آ کر ہی رہا جس کا گمان تک نہ تھا۔

☆☆☆

بچوں کی دوستی دیکھ کر زمان صاحب کے من میں نہ جانے کیا سمائی، وہ رحمان صاحب کے پاس چلے آئے اور خواہش کی کہ شمع اور طاہر کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔ انہوں نے سوچنے کا وقت مانگ لیا۔ اپنی پرجوش پیشکش پر ان کا پرسوچ ردعمل زمان صاحب نے خلاف توقع جانا۔

وہ دل مسوس کر اٹھ آئے۔ اگلے چند روز بعد قدرے شرمندہ شرمندہ سے رحمان صاحب نے جواب دے دیا کیونکہ طاہر نے انکار کر دیا تھا۔ یہ سن کر زمان غصے میں بھر گئے۔

"آپ چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہ رشتہ ہو، اب آپ طاہر کے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلا رہے ہیں۔"

رحمان صاحب اس بدگمانی پر متاسف رہ گئے۔

"دیکھو زمان، بات کو غلط رخ مت دو یہ بچوں کی زندگی کا معاملہ ہے، میں یا تم ان پر زبردستی نہیں کر سکتے۔"

مگر زمان صاحب کو یہ انکار اپنی انا پر کاری ضرب کی محسوس ہوا۔ رحمان صاحب نے سمجھانے کی اپنی سی خوب کوشش کی۔ معاملہ ان کی ذات کا ہوتا تو وہ دست بردار ہو جاتے مگر اس بار مسئلہ ان کی اولاد تھی کہ طاہر کی اس رشتے کے لیے رضامندی نہیں تھی۔ بیگم رحمان اپنے بیٹے کی وجہ سے الگ شرمندہ شرمندہ سی تھیں، مگر یہ ان کی تربیت کا حصہ تھا کہ ان دونوں نے اولاد کے ساتھ حاکم کے بجائے دوست کا سا رشتہ رکھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ کسی قسم کا دباؤ یا زبردستی نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

رحمان صاحب اس ناراضی کو ختم کرنے کی

ترکیبیں کر رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی کہ شمع کا رشتہ ان کے کزن کے بیٹے سے طے ہو چکا ہے۔ وہ اس خبر پر سر پکڑ کر رہ گئے۔ انہیں اپنے کزن ذاتی طور پر پسند نہیں تھے۔ وہ ایسا نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ ایک بار پھر اپنے بھائی کے پاس موجود تھے۔

"زمان میرے بھائی ایم تھیک بن کر رہے۔ جلد بازی میں فیصلہ کرنا درست نہیں۔"

مگر آگے سے وہ شکوہ کناں تھے۔

"جو آپ نے کیا وہ درست تھا؟ آپ کو بڑا مان ہے اپنے بیٹے پر۔ اس سے اچھا ہی داماد ڈھونڈا ہے میں نے۔"

"اُفوہ پرانی باتیں چھوڑو۔ کم از کم بچی سے اس کی رضا تو پوچھ لو۔"

"میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسا ہے۔ وہ تمہارے بیٹے کی طرح نہیں کہ باپ کے فیصلے پر انکار کر دے۔"

دوسری طرف سے بیگم رحمان بیگم زمان کو سمجھانے میں لگی تھیں۔ مگر وہ ہمیشہ کی کمزور اور قدرے بزدل، شوہر کے سامنے بے بس تھیں۔

یوں جذباتی بلیک میلنگ میں شمع نے نا چاہتے ہوئے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ اور رحمان

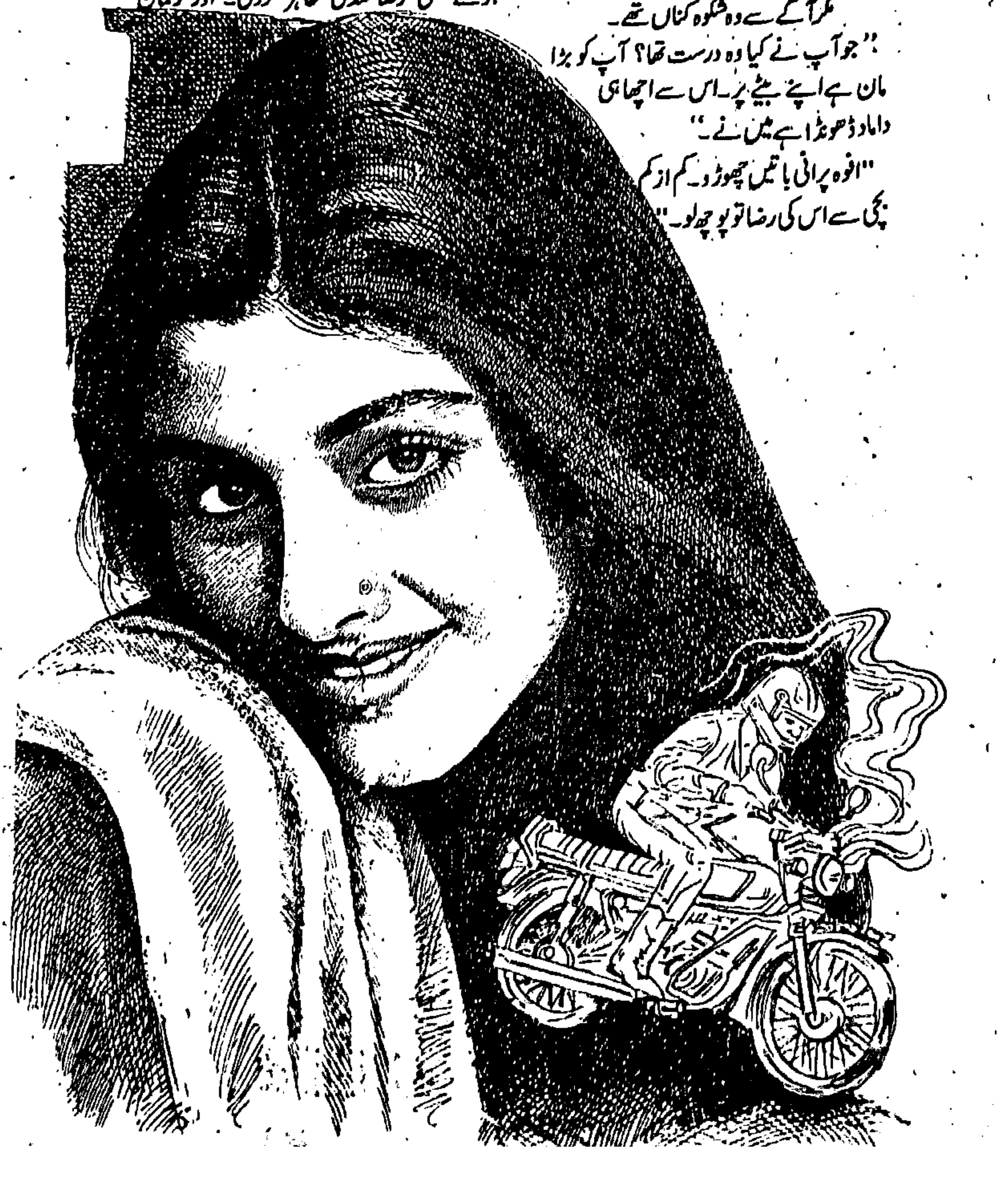

صاحب صرف ہاتھ مل کر رہ گئے۔
ان سب نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ گھر کی پہلی شادی ایسی بے کیف ہوگی۔ ایک گھر میں شادیانے بج رہے تھے تو دوسری طرف تاریکی چھائی تھی۔ سب بچوں کو ایسی ادھوری شادی کا قلق تھا۔ شمع رخصت ہو کر اپنے گھر روانہ ہوگئی۔ دن یوں ہی سست انداز میں گزرنے لگے۔ بڑوں کے درمیان تناؤ نے بچوں کو بھی محتاط کر دیا تھا۔ ملنا ملانا بہت کم ہوگیا اور پہلے جیسی آزادی بھی ختم ہوگئی۔

☆☆☆

جیسے ہی انہیں پتا چلا کہ شمع کو اللہ تعالیٰ نے پیارے سے بیٹے سے نوازا ہے، وہ سب ناراضی بھلائے مٹھائی لے کر ان کے ہاں پہنچے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شمع کے سسرالی نہایت ہی تنگ دل اور تنگ ذہن کے مالک نکلے تھے۔ آئے دن کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر شمع میکے آئی ہوئی تھی۔ معاملہ علیحدگی تک جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر سر تھام کر رہ گئے۔

" زمان، اور کتنی بے وقوفی کرو گے تم۔ ایک کے بعد ایک غلطی۔ تم نے پہلے میری بات نہیں مانی اب بھی اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہو۔ شادی کوئی گڈا گڈی کا کھیل نہیں ہوتی۔ بچے کا کیا ہوگا، کچھ سوچا بھی ہے تم نے۔"

رحمان صاحب شدید غصے میں تھے۔

" یہ نصیحتیں آپ مجھے نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ نہ آپ انکار کرتے نہ آج یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا۔ اور اسے (داماد) کیا لگتا ہے کہ لاوارث ہے میری بیٹی۔ ابھی اس کا باپ زندہ ہے۔"

زمان صاحب اپنی ازلی جذباتیت پر ڈٹے تھے۔ بیگم زمان بھی شکوہ کناں اور خفا خفا سی تھیں کہ کیا ہوتا اگر شمع اور طاہر کی شادی ہو جاتی تو ان کی بچی کو یوں زیادتی نہ سہنی پڑتی۔ مگر بیگم رحمان کی برین واشنگ نے ان کی آنکھوں سے بدگمانی کی پٹی کو ہٹایا تو ان کی سمجھ میں آنے لگا۔ اسی کشمکش میں ایک دن تایا ابو نے شمع کو بلایا اور کہا۔

" شمع تم میرے لیے یشفا جیسی ہو، پہلے بھی تم نے باپ کے دباؤ میں آ کر فیصلہ کیا، اب بھی اس کے تناؤ میں ہو مگر اب بچے کا ساتھ ہے۔ تمہیں جو درست لگتا ہے وہ کرو۔"

شمع جو کب سے ہچکچا رہی تھی، تایا ابو کا محبت بھرا انداز دیکھ کر پرسکون ہوگئی اور ان کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی گئی۔ اس نے سوچا سسرالی تنگ نظر ہیں مگر شوہر تو بہتر ہے کم از کم۔

زمان صاحب گھر واپس آئے تو اس اطلاع نے انہیں غضب ناک کر دیا۔ وہ غصے میں بھرے رحمان صاحب کی طرف چلے آئے اور خوب سنائیں۔ دل میں جمع بدگمانیاں، گلے شکوے۔

رحمان صاحب یہ سب سن کر ششدرہ گئے۔

پہلی بار اس گھر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آئی تھیں۔ سارے محلے نے تماشا دیکھا۔ دونوں طرف کے بچے خاموش تماشائی تھے۔ طاہر کو اپنے باپ کی تذلیل پر ابال اٹھ رہے تھے مگر وہ ان ہی کے کہنے پر ضبط کر رہا تھا۔ وہ رات ان دونوں خاندانوں پر بہت بھاری گزری۔ اگلے چند روز میں رحمان صاحب نے اپنا سامان باندھا اور خاموشی سے قریبی شہر منتقل ہوگئے۔

☆☆☆

ندا اپنے ٹیرس پر کھڑی سامنے والے پورشن کو تک رہی تھی۔ ایک ایک کر کے پرانے منظر اسے سامنے چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گوشے خود بخود نم ہوتے چلے گئے۔ شمع اور عاشر بھائی نے زمان صاحب سے معافی مانگ لی تھی۔ اب وہ اپنے گھر میں خوش تھی اور جن کی وجہ سے خوش تھی وہ تایا گھر سے دربدر ہوگئے تھے۔

ندا اور عمارہ اسکول، اکیڈمی اور پڑھائی میں مصروف ہوگئی تھیں۔ اس کی یونیورسٹی شروع ہونے والی تھی۔ ایسے میں بیگم زمان بوکھلائی رہتیں۔ سارا دن اکیلے گھر میں دن کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ فرح

کی یونی ورسٹی کا سن کر وہ مزید مغموم ہوگئی تھیں۔ وہ صبح صبح ڈھیر سارا دلاسہ، تسلی دے کر یونی ورسٹی چلی آئی۔ دن معقول گزر گیا۔ آخری لیکچر لے کر باہر نکلتے ہوئے اس کی نگاہ آشنا چہرے پر پڑی تو وہ چونک کر رہ گئی۔

"ناظر تم! کیسے ہو؟ تائی امی اور تایا ابا کیسے ہیں اور یشفا کا کیا حال ہے؟"

اس نے ایک ہی سانس میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"ارے لڑکی سانس تو لے لو سب کچھ ابھی پوچھ لوگی۔ امی، ابو یشفا سب ٹھیک ہیں۔"

پھر وہ دونوں کینٹین ایریا کی طرف آ گئے۔ وہاں بیٹھ کر تفصیلی ایک دوسرے کا حال سنا۔ اس نے بتایا کہ طاہر بھائی پڑھائی کے لیے باہر چلے گئے ہیں۔ اور یشفا کی پڑھائی مکمل ہو چکی ہے۔ باسط اسکول میں پڑھتا تھا جبکہ ناظر خود اس کا کلاس فیلو نکلا۔

دونوں دیر تک پرانی یادیں تازہ کرتے رہے پھر وہ اس سے یشفا کا نمبر لے کر واپس چلی آئی۔ شام کو سب کے اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد وہ ٹیرس پر چلی آئی اور دھڑکتے دل کے ساتھ یشفا کو کال ملائی۔ آگے سے یشفا کی خوشی کا عالم بھی اس کے جیسا ہی تھا۔

دونوں رات گئے تک پرانی یادیں تازہ کرتی رہیں۔ اگلے روز یشفا اس سے ملنے چلی آئی۔ اب دونوں اکثر ہی ملنے لگی تھیں۔

"یشفا، کیا سب پہلے جیسا نہیں ہو سکتا کیا؟" ایک دن فرح حسرت سے بولی۔

"ہوں ہو سکتا ہے شاید اگر ہم چاہیں تو۔" یشفا پرسوچ انداز میں بولی۔

"واقعی؟ یہ کیسے ممکن ہے، مجھے بتاؤ۔"

اور یشفا اسے اپنا منصوبہ بتاتی چلی گئی۔

☆☆☆

اب فرح اکثر اپنی امی اور بہنوں کے سامنے ارادتاً پرانی باتیں دہرانے لگی تھی۔ ادھر یشفا بھی یہی کام کر رہی تھی۔ رحمان فیملی کے دل تو پہلے ہی صاف تھے۔ پرانی باتیں سن کر سب آبدیدہ ہو جاتے۔ مگر فرح کو ذرا محنت کرنا پڑ رہی تھی۔

"امی یشفا آپی ملی تھیں مجھے یونی ورسٹی میں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ تائی اماں بلڈ پریشر کی مریضہ بن گئی ہیں۔ ان کی طبیعت اکثر خراب ہو جاتی ہے۔"

اس نے مبالغے سے کام لیا تو بیگم زمان تڑپ ہی اٹھیں۔

"باجی ایسی ہی ہیں شروع سے۔ سب کا خیال رکھتی ہیں مگر اپنا آپ بھول جاتی ہیں، پہلے تو میرے ساتھ چلی جاتی تھیں۔ اب نہ جانے ڈاکٹر کے پاس بھی جاتی ہیں کہ نہیں۔"

ادھر بیگم رحمان سوچ کر مغموم تھیں۔ "پہلے تو سارے کام مجھ سے پوچھ پوچھ کر کرتی تھی، ہر کام میں مشورہ، اس کی تو عادت ہے بات بات پر ٹینشن لینا، تھوڑی سی مشکل میں ہاتھ پیر چھوڑ دیتی تھی اب اکیلی اپنی فکر، بچیوں کی ٹینشن نہ جانے کس حال میں ہوگی۔"

یشفا نے بتایا کہ "چچا کمزور ہو گئے۔" اور واقعی میں پہلے کی نسبت ان کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ اور گرتی بھی کیوں نہ، کہاں تو ہر کام میں بڑے بھائی کی مشاورت اور رہنمائی شامل رہتی تھی کہاں ساری ذمہ داری اکیلے ان کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ رحمان صاحب کے دل سے ہوک سی اٹھی۔

"بہت نالائق ہے، ضد کا پکا۔ ایک بار بھی خیال نہ آیا کہ میرے پاس چلا آئے۔"

☆☆☆

دن یوں ہی گزر رہے تھے کہ رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ آ پہنچا۔

فرح سحر و افطار میں رو رو کر اپنے خاندان کی بھلائی کے لیے دعائیں کرتی۔ رمضان میں اس نے

معمول بنالیا تھا کہ ہر روز پانچ دس منٹ کے لیے درس دیتی، جس میں رمضان المبارک کے متعلق آیات واحادیث سنائی جاتیں۔ اب اس کے ابو بھی شامل ہوجاتے تھے۔ وہ ان کی موجودگی سے باخبر حقوق العباد، ترک تعلق سے متعلق وعیدیں سنا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ان کو پگھلتا ہوا پا رہی تھی مگر انا کی بھاری بھرکم دیوار درمیان میں حائل تھی۔

یہ سن کر زمان صاحب بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلے آئے۔ نہ جانے کیوں ان کو فضا میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ عجب بے چینی انہیں اپنے گھیرے میں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ندا ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی انہیں اپنی طرف آتی دکھائی دی۔

"پاپا...... پاپا وہ...... تایا ابو......" اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ "تایا ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے وہ سول ہاسپٹل میں ہیں۔"

"کیا......" انہیں اپنے پیروں تلے زمین نکلتی ہوئی دکھائی دی۔

☆☆☆

وہ اطلاع پاتے ہی ہاسپٹل کی طرف دوڑے تھے۔ ان کا رواں رواں بھائی کی سلامتی کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر نے انہیں خطرے سے باہر قرار دے دیا تھا۔ جتنے دن وہ ہاسپٹل میں رہے ان کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ بھائی کا سامنا کر پائیں۔ جب وہ گھر روانہ ہوئے تو پہلی فرصت میں اپنے بھائی کے پاس پہنچے اور معافی مانگی۔ رحمان صاحب نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ دونوں بھائی دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگے روتے رہے۔ وہاں پر موجود ہر آنکھ اشک بار تھی۔ اندر خواتین تو کب کی یہ مرحلہ طے کر کے اپنے دکھ سکھ سنا چکی تھیں۔

معافی تلافی کے بعد، تھوڑی ہی دیر میں مطلع صاف ہوا تو زمان صاحب نے بتایا کہ شمع کے سسرالی اس کے دیور کے لیے فرح کا رشتہ مانگنے پر بضد ہیں۔ یہ سن کر تایا ابا کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی۔ انہوں نے ناظر کو بلا بھیجا۔ مدعا جان کر شفا نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"ناظر! پلیز میرے بھائی تم بھی طاہر والا کام مت کرنا، بڑی مشکلوں سے جا کر سب ٹھیک ہوا ہے۔"

یہ سن کر وہ مسکرا دیا۔ بھلا وہ کیوں انکار کرتا اس کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ دونوں بچوں اور بڑوں کی رضامندی سے فرح اور ناظر کا رشتہ طے کر دیا گیا۔ اور شمع کے سسرال والوں تک انکار پہنچا دیا گیا۔

بڑوں کے درمیان طے پایا کہ اس رشتے کو مضبوط کرنے کی خاطر عید والے دن نکاح کر دیا جائے اور رخصتی کو بچوں کی پڑھائی تک موقوف کر دیا جائے۔

☆☆☆

بالآخر وہ دن آپہنچا جس کے لیے فرح نے اتنی دعائیں مانگی تھیں اور اس کی دعائیں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ گھر کے لان میں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل نکاح کے بعد فرح کو ناظر کے پہلو میں لا کر بٹھایا گیا تھا۔ ہلکے فیروزی لباس میں ملبوس فرح چاند کا ٹکڑا لگ رہی تھی تو ناظر بھی نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص مسرور تھا۔ دونوں طرف کے بچوں نے جلدی جلدی میں نکاح کے لیے ملبوسات اور دیگر تیاریاں کی تھیں۔ ان کے جوش اور خوشی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ ان کے لیے آج کے روز دو دو عیدیں تھیں۔ شمع ساری ناراضی بھلائے اپنے بچوں کے سنگ موجود تھی۔ طاہر کو بھی ویڈیو کال کے ذریعے شریک کرلیا گیا۔ ناظر کی محبت بھری سرگوشی پر فرح کے چہرے پر شرمیلی مسکان پھیلتی چلی گئی۔ اس منظر کو دیکھتے قریب کھڑے رحمان صاحب کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملا گئے۔

☆☆

حمیرا علی

ستارے کھلکھلاتے ہیں

بارش بھی بے موسم برسی تھی۔ کچھ دیر پہلے آسمان بالکل صاف تھا اچانک مغرب کی سمت سے گھٹائیں اٹھیں اور سمندر سے قریب علاقوں پر چھا گئیں۔ سیاہ بادلوں کے چھاتے ہی بارش نے رنگ جما لیا۔

وہ لمحوں میں سر سے پاؤں تک شرابور ہو گیا۔ یہ بارش بھی اس کے ارادوں میں دراڑ نہ ڈال سکی۔ بے سرو سامانی کا احساس ضرور ہوا مگر وہ پلٹا نہیں۔ اس کے پاس اپنی اب تک کی اسناد اور چند جوڑے تھے۔ زادِ سفر کے طور پر اس کی ہمت، حوصلہ اور بہت سی تلخیاں اس کے ساتھ تھیں۔ غلطی اس کی تھی یا سامنے سے آتی گاڑی کی۔ بہرحال ایک لمحہ لگا تھا اور زمین و آسمان اس کے سامنے گھوم گئے وہ گاڑی سے ٹکرا کر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ آخری خیال اس کے ذہن میں موت کا آیا تھا۔ اس نے ہارے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

صبح تھکی ماندی روٹھی روٹھی دھوپ لیے نمودار ہوئی تھی۔ وسط فروری کے دن تھے۔ سردی پھر بھی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ شہر کراچی میں سردی یوں بھی بس چند دنوں کی مہمان ہوتی۔ تفریم سالف اس دھند میں لپٹے موسم کی دیوانی تھی۔ مگر چند دنوں سے اسے یہ موسم بھی گراں گزر رہا تھا۔ اداسی تھی کہ رگوں میں سیلن کی طرح رچ بس گئی تھی۔ دراصل تو اس پر فکریں سوار تھیں۔ وجاہا سے اسے کوئی امید نہیں تھی۔ وہ کل بھی آرام سے اس کے جوڑے پیک کر رہی تھی۔ ظاہر ہے شادی کی تیاریاں اسے ہی بڑھ چڑھ کر کرنی تھیں۔ تفریم کا دل جل رہا تھا۔ دماغ سلگ رہا تھا۔ وہ گھر میں بیٹھ کر مزید اپنا خون نہیں جلانا چاہتی تھی لہٰذا یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

"تم آج بھی جا رہی ہو؟ آج شادی کی تاریخ طے ہونی ہے۔ دو چار دن میں سالف دبئی سے آ رہے ہیں اپنی کاروباری مصروفیات ختم کر کے۔ عید کے بعد تمہاری شادی ہے۔ نکاح شاید پہلے ہی کر دیں۔ تیاری تو میں نے بھی شروع کر دی ہے۔ ادھر ثمینہ بھابھی بھی بازاروں کے چکر لگا رہی ہیں۔ ان سے رمضان میں نہیں جایا جاتا بازار۔"

نصرہ سب طے کیے بیٹھی تھیں۔

"مجھے نہیں کرنی شادی۔"

وہ جھنجھلا رہی تھی۔ وجاہا خاموشی سے پراٹھے بناتی رہی۔ اسے کوئی سروکار نہ تھا کسی سے۔ وہ اس سے چھوٹی ہو کر بھی اس سے زیادہ سمجھدار اور بردبار تھی۔

"بکواس مت کرو۔ سالف کے سامنے تم یہ اول فول بولنا بھی مت۔ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ یہ پڑھائی لکھائی چھوڑ کر اب گھر بیٹھو۔ ایم اے کا بھوت پتا نہیں کیوں تمہارے سر پر سوار ہو گیا ہے؟ ویسے ہی تمہارا دماغ عرش پر رہتا ہے۔ کیا کرو گی اتنا پڑھ کر۔"

وہ اس کی پڑھائی کو بھی اس کی ضد ہٹ دھرمی کا سبب بتاتے ہوئے نہیں چوکتی تھیں۔ بلاناغہ وہ یہ ڈانٹ ڈپٹ اور اپنی زبان میں عزت افزائی برداشت کرتی تھی۔

"چلیں، میں تو پڑھ لکھ کر کچھ کر بھی لوں گی مگر آپ کا اکلوتا راج دلارا کیا کرے گا، اس کا سوچیں؟ میٹرک میں فیل ہونے کے بعد وہ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کر رہا ہے۔ آپ کب تک اس کی حرکتوں پر پردہ ڈالیں گی؟" تفریم نے کہا تو نصرہ

بھنا گئیں۔

"اسے تو وہ اسکول پسند نہیں تھا سالف نے زبردستی اس کا داخلہ وہاں کروایا۔ وہیں اس کے وہ بگڑے ہوئے لڑکے دوست بنے ہیں۔ اور اب بھی تم سے کم ہی زبان دراز ہے۔"

انہیں ساری خامیاں بیٹی میں نظر آتی تھیں۔

"چلیں، اب میں زبان دراز بھی ہوگئی مگر اسے آپ لگام نہیں ڈالیں گی۔ وہ کل رات بھی ڈھائی بجے گھر آیا تھا اور میرے پرس سے سارے پیسے بھی وہ نکال کر لے گیا تھا۔ وہ اب چوری بھی سیکھ گیا ہے۔"

وہ مزید کچھ کہہ کر ان کے عتاب کا نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ پھر بھی بھائی کی حرکتوں پر وہ کڑھتی تھی۔ کہنے سے کیسے باز آتی؟

"تم بہن ہو اس کی اگر تمہارے پیسے لے لیے تو چوری تو نہ ہوئی۔ تعزیم! تمہیں بھائی کا احساس ہی نہیں ہے۔ وہ سوتیلا نہیں تمہارا سگا بھائی ہے۔"

وہ ان کے جلال سے واقف تھی اور وہ غصے میں آچکی تھیں۔

"مما! وہ میرا سگا بھائی ہے اس لیے میں اس کا بھلا چاہتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی اپنی بری عادتوں کے سبب دربدری اس کا مقدر بن جائے۔"

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ پیچھے نصرہ بیگم اس پر چیختی چلاتی۔

"ہاں تم تو چاہتی ہی یہ ہو۔ میرا بچہ دربدر ہوجائے۔ دوسروں کی زیادہ سگی ہو۔ اپنے بھائی کا خیال نہیں۔ میری اولاد کو میرے خلاف کرنے والوں کے لیے جھولی بھر بھر بددعائیں نکلتی ہیں میرے دل سے۔ اللہ کرے کہیں مر کھپ جائیں یہ لوگ۔"

وہ دروازے تک ان کی جلی کٹی باتیں سنتی رہی۔ وجاہا کا چہرہ متغیر ہوگیا۔

"تم کیا گھور رہی ہو مجھے۔ میرے دل سے تو اپنے دشمنوں کے لیے بددعا ہی نکلتی ہے۔ تم بھی خوش نہیں رہو گی۔"

وہ اٹھتے بیٹھتے یہی بددعا دیتی تھیں۔ بددعا ہو یا آہ اپنے اصل حق دار کو ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ پھر چاہے وہ بددعا دینے والا ہی اس بددعا کا حقیقی حق دار ہو۔ وجاہا دل برداشتہ سی ہو کر بھی جانے والے کے لیے زیرلب دعا کرنا نہ بھولی۔

☆☆☆

اس نے دور سے آتے یدان کو دیکھا اور نچلا لب دانتوں تلے دبائے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی۔ آج وہ جس مقصد کے لیے آئی تھی، وہ پورا کرنے کے لیے کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔ یدان کی بائیک وہ پہچانتی تھی۔ اس کا ٹائر پہلے ہی پنکچر کر چکی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جسے گزشتہ کئی روز سے وہ مثالی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھائی بنانے کی کوشش کر رہی تھی یعنی منہ بولا بھائی ایک بگڑے ہوئے بھائی کے ہوتے اسے کسی دوسرے بھائی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وجاہا کی وجہ سے وہ مجبور ہوگئی۔ اس کی تمام تر بددماغی کے باوجود اسے اہمیت دے رہی تھی۔

وجاہا تو یدان سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کرتی بھی کیوں وہ تو اجنبی بنا ہوا تھا۔ جانتا ہی نہ تھا انہیں۔ وجاہا کے ہی سبب اس سے بات کرنے کا منصوبہ ہمیشہ کھٹائی میں پڑ جاتا تھا۔ یہ تو قسمت کی یاوری تھی، آج وجاہا نہیں آئی تھی۔ وہ ہوتی تو یدان شمیر اس کی شرپسندی سے محفوظ رہتا۔ مگر اب وہ نہیں تھی جسے اول اول یدان شمیر نے مایوس کیا تھا بلکہ وہ اس سے متنفر ہوگئی تھی۔ یدان وجاہا کو دیکھ کر رکا تھا۔ تعزیم کی کہنی نے وجاہا کی پسلیوں کی خبر لی اور وہ بیچاری کراہ کر رہ گئی تھی۔

"یہی سیدان شمیر ہیں۔ تمہیں بتایا تھا ناں میں نے۔ ہمارے نئے سر۔"

تعزیم نے دانت پیستے ہوئے تعارف کروایا تھا۔ وجاہا اکثر نصرہ آنی کی وجہ سے یونیورسٹی نہیں آپاتی تھی، ان کی پابندیاں، روک ٹوک سب کا شکار وجاہا بنتی تھی۔ اب بھی وہ کئی دن بعد آئی تھی اور ان ہی دنوں یدان شمیر انہیں پبلک فائنانس پڑھانے کے لیے آیا تھا۔ پروفیسر احسان اس مضمون کے استاد تھے مگر انہیں دل کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا۔ ان کی ہارٹ

سرجری ہوئی تھی، وہ یونی ورسٹی آنے سے قاصر تھے۔ان کی جگہ ہی عارضی طور پر یدان ثمیر کا تقرر ہوا تھا۔یدان ثمیر کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ منجمد ہوگئی تھی۔یدان نے اسے شاید ٹھیک سے دیکھا بھی نہ ہو۔مگر وہ بھی جس نے گھر جا کر وجاہا کو یدان ثمیر کے متعلق بتا کر یقین دلایا تھا کہ اب سارے مسائل چٹکیوں میں حل ہو جائیں گے۔وجاہا کی یدان ثمیر سے ملاقات ان کے ڈپارٹمنٹ کے کوریڈور میں ہوئی اور یدان کے بے تاثر چہرے نے اس کا سارا جوش و ولولہ جھاگ کی طرح بٹھا دیا۔

"یدان! یہ وجاہا ہے۔وجاہا سالف۔آپ اسے پہچانے؟اور میں تضریم۔آپ ہمیں بھول گئے۔"

وہ تضریم کے لیے ایسا معزز بھی نہ تھا کہ آپ جناب کرتی۔مگر درمیان میں سالوں کے فاصلے حائل تھے پھر بھی اجنبیت محسوس نہ ہو رہی تھی۔اگر کچھ غیریت تھی تو وہ یدان کے رویے میں تھی۔

اس نے وجاہا کے چہرے پر امید و بیم کی کیفیت دیکھی تھی۔خود اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کون وجاہا سالف؟"

وہ جتنی مشتاق تھی وہ اتنا ہی بے زار نظر آرہا تھا۔

"آپ۔۔آپ کی۔۔آپ کیسے بھول گئے؟"

وجاہا کا لٹھے کی مانند سفید پڑتا چہرہ اور تضریم کا الجھا انداز۔یدان ثمیر نے برہمی سے ان دونوں کو گھورا۔

"مجھے نہیں پتا، آپ میرا وقت کیوں برباد کر رہی ہیں میری کلاس کا وقت ہے۔"

وہ عجلت میں چلا گیا تھا۔

وجاہا کی بھیگتی پلکیں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی۔ایسے ہی کھد بد تو اسے بھی نہیں لگی تھی۔

"ناراض ہے وہ۔"

تضریم نے دلاسا دیا۔

"ناراض؟وہ ہمیں جانتے نہیں ہیں۔ہم اب اجنبی ہوگئے۔میں بھی ان سے بات نہیں کروں گی۔"

وجاہا اتنی سخت نہیں تھی مگر اب ہوگئی تھی۔تضریم نے بھی اس شخص کے اجنبیت کے خول پر ضرب لگانے کا فیصلہ کرلیا۔

پھر وہ اس کی ٹوہ میں رہنے لگی۔یدان سے عزت افزائی بھی کروائی۔وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے آفس میں بھی آگئی تھی۔اس کی چیزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی اور اس نے عین موقع پر چھاپا مار دیا۔

"مس تضریم سالف!کیا کر رہی ہیں آپ یہاں؟"

سخت کھردرا لہجہ، درشت، سرد، برہم لہجہ اور آواز تھی کہ مثلِ صورِ اسرافیل،تضریم کانپ سی گئی۔

"میں ......میں اپنی اسائمنٹ دینے آئی تھی۔"

اس نے بروقت بہانا بنایا۔

"اسائمنٹ کون سی اسائمنٹ؟ میں نے تو کوئی اسائمنٹ نہیں دی۔آپ یہاں آکر درازیں کھنگال رہی ہیں۔مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ؟"

وہ جزبز ہوگئی۔

"آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔میں۔"

وہ رو دینے کو تھی۔

"جائیں یہاں سے اور آئندہ آپ یہاں میری غیر موجودگی میں قدم بھی مت رکھیے گا ورنہ آپ کی کمپلین ڈین کے پاس جائے گی۔اور اس کے بعد آپ کے گھر تک۔"

اس دھمکی میں اثر تھا۔

وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی تھی۔ایسے سالف انکل سے ڈر نہیں لگتا تھا، وہ مما سے ڈرتی تھی۔مما اس پر برہم ہوں گی۔ان کے گھر کا سکون نہس نہس ہوگا اور یہی بات اسے خوف زدہ کرتی تھی۔اس کے بعد اس نے معذرت بھی کی مگر اس پر اثر ہی نہ ہوا۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔بالکل میرے بھائی جیسے۔"

وہ اس بار پھول لے کر اس کے آفس پہنچ گئی۔اس سے کچھ اگلوانے اسے یاد دلانے کے لیے یہ کہنا بھی ضروری تھا ورنہ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اس جیسے بددماغ کو بھائی کہتے ہوئے۔

"شٹ اپ میں کیوں ہونے لگا آپ کا بھائی؟ اور آپ کیا چاہتی ہیں، میں واقعی آپ کی کمپلین کروں؟"

وہ تلملا گئی۔

"آپ غصہ کیے بغیر بات نہیں کر سکتے؟ بھائی ہی کہا ہے۔"

وہ بھی جیسے کڑوا بادام چبا رہی تھی۔

"مجھے آپ کا بھائی بننے میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔نہ ہی میری شکل آپ کے کسی گم شدہ بھائی سے ملتی ہے۔اس لیے مجھے معاف رکھیں۔"

اس نے زہر کا گھونٹ سمجھ کر اپنا غصہ پیا تھا۔ورنہ یدان کا لہجہ اسے سلگا رہا تھا۔

"اوکے۔مجھے بھی شوق نہیں کسی ایرے غیرے سے رشتے داری کا۔جس کے بھائی ہوا سے مبارک۔میں صرف آپ سے مدد چاہتی ہوں۔"

اس نے اکھڑ لہجے میں مدعا بیان کیا تھا۔

"کیسی مدد؟"

وہ حیران ہوا تھا۔

"آپ میری بات سن لیں۔"

وہ جھٹ کرسی پر بیٹھ گئی۔اور اس نے اختصار سے کام لیتے ہوئے بھی الف تا یے سارا ماجرا اس کے گوش گزار کر دیا۔

"فوراً اٹھیں اور جائیں یہاں سے۔"

وہ غرایا تھا۔

"ارے آپ اتنے سے اکھڑ رہے ہیں۔آپ مجھے غلط مت سمجھیں۔یہ میری اور میری دوست جمع بہن کی مجبوری ہے۔وہ آپ کے پاس مدد کے لیے نہیں آئی، ناراض ہے آپ سے گھر میں آ گئی۔سمجھیں آپ اس کے لیے نجات دہندہ ہیں۔بس آپ کو ایک بار آ کر اسے اپنے ساتھ لے جا کر۔اس کی شادی کروانی ہے۔"

تضریم نے اتنی منت سماجت کسی کی نہیں کی تھی۔مگر یہ شخص اس کے ملتجی لہجے پر اکڑا جا رہا تھا۔

"آؤٹ مجھے کچھ نہیں سننا۔"

یدان ثمیر نے اسے باہر کا راستہ دکھایا۔

اور بس اس نے فیصلہ کر لیا۔وہ اس شخص کو اب گھیر گھار کر اپنی بات منوا کر رہے گی۔اپنی گاڑی کا اسٹیرنگ سنبھالے وہ اس کی آمد کی منتظر تھی۔وہ موبائل ہاتھ میں لیے قریب آیا وہ چوکنی ہو گئی۔اسے آتا دیکھ کر گاڑی بڑھائی۔گاڑی اسٹارٹ کی ٹکرائی۔

اسے ہٹ کرنے کے بعد اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی گاڑی سے برآمد ہوئی تھی۔عرق عرق ہوتی جبین اور لرزہ خیز وجود اسے نیا نیا مجرم ثابت کر رہے تھے۔

"سس۔سوری سر!"

بارِ ندامت تو نہیں تھا بس خوف تھا اس کے ردعمل کا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟ اگر گاڑی چلانی نہیں آتی تو چلاتی کیوں ہیں؟"

وہ اگرچہ زیادہ غصے میں تھا مگر تکلیف بھی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"سر! ایکسٹریملی سوری۔"

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔یہ بالکل بھی اداکاری نہیں تھی۔

"سر! میں کسی کو نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔پتا نہیں کیسے؟"

یدان ثمیر بائیں ہاتھ کو زمین پر ٹکاتا اٹھنے لگا۔وہ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھی۔

"سر! چلیں، میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔"

یدان نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ خود ہی اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔اس نے یدا[illegible]ے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے والے موبائل کو اٹھایا۔موبائل کی اسکرین غریب کی پیشانی پر پڑی تفکرات کی لکیروں کی طرح نظر آ رہی تھی۔آڑی

ترچھی، الٹی سیدھی بیشمار لائنیں مگر سب کی سب بے کار۔ اس نے موبائل یدان کی سمت بڑھایا۔ یدان نے تمام کراسکرین پر نگاہ ڈالی۔ نقصان ہو چکا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اسے چلنے میں دقت ہو رہی تھی۔

"سر! پلیز۔ مجھے گلٹ فیل ہو رہا ہے۔"

وہ حاصل شدہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے حتی المقدور لہجے میں لجاجت پیدا کی۔ حالانکہ اب وہ مطمئن تھی۔ یدان نے اسے زیادہ شرمندہ نہیں کیا تھا۔

"میں ارباز کو بلا لیتا ہوں۔"

اس نے کال ملانے کے لیے موبائل آن کرنا چاہا مگر شاید موبائل کو زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ موبائل بالکل ناکارہ ہو چکا تھا۔

اسے سامنے موجود لڑکی کی مدد ہرگز قبول نہ تھی جس کے سبب وہ مشکل میں گرفتار ہوا تھا۔ مگر وہ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولے منتظر تھی۔ یدان نے آخر اس کی پیشکش قبول کر لی۔ کلینک تک وہ وہی باتیں کرتی رہی۔

وجاہا کی مشکلات، مجبوری، بے بسی اس کے بودے دلائل اسے قائل نہ کر سکے۔ وہ لب سیئے بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر نے اسے چیک کیا۔ اس کی دائیں ٹانگ پر اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ گرنے کی وجہ سے شاید بچنے کی کوشش میں دائیں ہاتھ کی کہنی اور کلائی پر بوجھ پڑا تھا۔ ہڈی، فریکچر تو نہیں ہوئی تھی لیکن درد بے انتہا تھا۔

کلینک سے نکلے تو وہ اسے اس کے گھر تک چھوڑنے کے لیے بضد ہو گئی۔ اس بار یدان نے جلد ہی ہار مان لی۔ وہ اس کی بے تکی باتوں سے اکتا رہا تھا۔

قریب ہی اس کا بنگلہ تھا۔ وہ تو ساری معلومات حاصل کر چکی تھی۔ ادھر ادھر سے سن گن لی تھی۔

"آپ کو میرے گھر کا ایڈریس بھی معلوم ہے۔"

یدان ثمیر نے گاڑی سے نکلتے ہوئے سرد و سپاٹ لہجے میں جتایا۔ اس نے دل ہی دل میں سر پیٹا۔

"جی ہاں جی نہیں میرا مطلب ہے۔ سر طلعت سے پوچھا تھا۔ یعنی ایک بار یونہی برسبیل تذکرہ۔"

اس کی آنکھیں انسان کے اوسان خطا کرنے کی ماہر تھیں۔ ذہین، گہری، زیرک آنکھیں۔ تضریم گڑبڑا گئی۔ بری پھنسی تھی ان آنکھوں کے برفیلے سمندر میں۔

وہ سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا۔ اصولاً تو اسے اب دروازے سے واپس چلے جانا تھا۔ مگر وہ بھی ڈھیٹ بنی گاڑی سے اتر کر اس کی تقلید میں اندر بڑھنے لگی۔ وہ شاید پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں اور اپنے کمرے کی اور بڑھ جاتا وہ ہی تھی جس نے پھر مخاطب کیا۔

"ماشاء اللہ آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔"

"مس تضریم سالف! میں یہاں تنہا رہتا ہوں۔ آپ کو کس نے اجازت دی کہ آپ اندر تشریف لائیں؟"

اس کا اختیار ہوتا تو وہ یدان ثمیر کے بولنے پر پابندی عائد کر دیتی۔ وہ دھوپ چھاؤں جیسی لڑکی یدان ثمیر کے سرد لہجے سے بیزار تھی۔ (اف یہ کوہ ہمالیہ جیسا بندا اور وجاہا ہے ایک سیدھی سادی بالکل موم جیسی۔ میں بھی تو کتنی معصوم ہوں۔ کاش ہماری مجبوری نہ ہوتی تو اس کی اتنی منت سماجت نہ کرنی پڑتی۔ بھائی بھی ایسا اللہ نے وجاہا کو دیا ہے جس میں مروت، رواداری اور رشتے داری نبھانے کے جراثیم ہی نہیں۔)

"سر! مجھے آپ بہت قابل بھروسا لگتے ہیں۔ نیک طینت اور شریف۔ میں آپ کو بھائی کی طرح سمجھتی ہوں۔ میرا مطلب ہے وجاہا کا بھائی۔"

وہ اب چاپلوسانہ روش اختیار کرنے لگی۔ یدان نے رعونت سے اسے گھورا۔ اف توبہ بڑا

ہی مشکل انسان ہے یہ بھی۔

"ماں باپ، بہن بھائی کے رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں۔ کہہ دینے سے کوئی سگا نہیں بن جاتا اور نہ ہی قابلِ اعتبار۔ ایسے منہ بولے رشتے بنانے کا میں قائل ہی نہیں، میری شکل اگر آپ کے کسی بھائی سے مشابہہ ہے تو میں کیا کروں؟ پھر مجھے تو آپ ٹھیک سے جانتی بھی نہیں۔"

وہ اس کے بگڑے تیور دیکھ کر روہنکھی ہوگئی۔ عجیب انسان ہے، ہر وقت انگارے چباتا ہے۔

"ٹھیک ہے بھائی نہیں بننا چاہتے ناں۔ آپ جیسے بد مزاج سے رشتے داری کو دور سے سات سلام۔ آپ بس یہ ناراضی چھوڑ کر ہمارا مسئلہ حل کر دیں۔"

وہ تنک کر بولی تھی۔ پھر خیال آیا اس کا ابھی ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور وہ مسلسل بے آرام ہے۔

"آپ بیٹھ جائیں۔ اور کوئی ملازم ہے گھر میں تو کچھ کھانے کے لیے لانے کا کہیں، اس کے بعد ڈاکٹر کی تجویز کردہ میڈیسن کھا کر آرام کریں۔"

کچھ بھی ہو، وہ قصوروار تھی لہذا اس کے تلخ لہجے پر زیادہ دیر دل نہیں جلایا۔

"آپ میری فکر مت کریں۔ اور تشریف لے جائیں۔"

اس نے بے مروتی کی حد کر دی۔

"ایسے کیسے آپ کم از کم چائے کا تو پوچھیں۔ آپ کو ڈراپ کیا ہے میں نے، ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی اور۔"

"اور اپنی گاڑی سے جان بوجھ کر ٹکر ماری۔"

"جی نہیں یہ ایک حادثہ تھا۔" وہ تحمل سے بولی۔

"مس تضریم سالف! آپ جھوٹ نہیں بولیں گی تو کون بولے گا؟ آپ نے تو پورے ڈرامے کا اسکرپٹ رٹ رکھا ہے۔"

وہ بلبلا گئی۔

"آپ کو بھائی بننے کا ہی کہا تھا۔ آپ تو میرے دشمن بن گئے۔ ویسے کیا آپ کی کوئی بہن نہیں۔ چلیے اگر نہیں بھی ہے تو آپ مجھے اور وجاہا کو بہن بنا لیں۔"

وہ پھر اسی شد و مد سے اسے راضی کرنے لگی۔

(ایسا لگتا ہے اس کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ بے چارے کی یادداشت چلی گئی۔ وہ پڑوسی ملک کے ڈراموں کی طرح۔) مگر وہ یہی نہیں مقابل بھی یہی سوچ رہا تھا۔

"کہیں آپ کا دماغی توازن تو خراب نہیں جو زبردستی گلے پڑ رہی ہیں۔"

وہ اب اکتا چکا تھا۔

"اچھا چھوڑیں یہ سب، آپ مجھے بتائیں۔ آپ کا کچن کہاں ہے؟ میں آپ کے لیے سوپ بنا لاتی ہوں۔"

وہ اس سرپھری لڑکی کو گھور ہی سکا۔ لیکن اب حقیقتاً اسے کچھ نقاہت محسوس ہونے لگی تھی۔ لنچ کا وقت بھی نکل چکا تھا۔

"رہنے دیں، میں کچھ باہر سے آرڈر کر دوں گا۔ اب آپ جائیں۔"

وہ صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بدلحاظی کے پچھلے ریکارڈ توڑتے ہوئے بولا۔

"سر! آپ اس حادثے کا ذمہ دار مجھے ٹھہرا رہے ہیں۔ تلافی کا موقع بھی نہیں دے رہے۔ اب میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔"

اور وہ اطمینان سے یوں سامنے والے دروازے کی طرف بڑھی جیسے ان کی شناسائی برسوں کی ہو۔ یزدان نے بھی اسے نہیں روکا۔ خانساماں دو دن سے چھٹی پر تھا اور وہ اب اپنی مدد آپ کے تحت ناشتہ کھانا بنانے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔ کچن ڈھونڈنے میں اسے دقت نہیں ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد سینڈوچز اور چکن کا بہترین ذائقے دار سوپ اور اسپگیٹی اس کے سامنے تھی۔

"او کے سر اب میں چلتی ہوں، امید ہے آپ میڈیسن کھا لیں گے۔ اور میری باتوں پر غور بھی

کریں گے۔اپنی بہن کی پروا کرلیں ۔ہم اتنے آنکھوں سے اندھے نہیں۔آپ بھی کچھ عقل کے ناخن لیں۔کیافائدہ پرانی رنجشوں کا۔"

وہ سوپ اور اسپیگیٹی کے بعد مزید ار کافی لے آئی تھی مگراس نے خود کچھ نہیں کھایا نہ پیا۔ان نے حق میزبانی نبھایا۔وہ بولتی رہی وہ سر جھکائے سوپ اور اسپیگیٹی سے انصاف کرنے کے بعد کافی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ایسا لگ رہا تھا وہ دیوار سے سر پھوڑ رہی ہے۔وہ اس کے بنگلے سے نکل کر بھی کڑھتی رہی۔

(یہ شخص ہمارے کام نہیں آئے گا۔بلاوجہ اتنا وقت ضائع کیا۔)

اسے قلق ہونے لگا۔

گھر پہنچ کر مما اور وجاہا کو فکرمند دیکھ کر وہ بس وضاحتیں دیتی رہی لائبریری میں تھی۔دوست کے ساتھ مارکیٹ چلی گئی تھی اور آخر میں آپ چھٹی مت کروایا کریں وجاہا کی اگر میری اتنی ہی فکر ہوتی ہے۔کہہ کر کمرے میں بند ہوگئی۔نصرہ پیچ و تاب کھاتی رہیں۔

یہ لڑکی ان کے لیے دردسر بن گئی تھی۔دوسری طرف ان کا لاڈلا تھا جو ابھی صرف میٹرک کا طالب علم تھا مگر اس کے بگڑے ہوئے دوستوں کی صحبت نے اسے پڑھائی سے دور اور بے کار کے مشغلوں کا عادی بنا کر بہت سی خرافات کے قریب کردیا تھا۔وہ ان دنوں پریشان تھیں مگر پشیمان نہیں۔

☆☆☆

سالف نذر سے نصرہ کی شادی نصرہ احمر کی خواہشات کی تکمیل کا سبب تھی۔

وہ تو کبھی سالف نذر سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ جو کچھ سالف نذر دے سکتے تھے وہ ارسلان شاکر کے پاس نہیں تھا پھر بھی نصرہ ارسلان شاکر کی محبت میں پور پور ڈوبی تھی۔

ارسلان ان کا تایا زاد تھا۔پڑھائی سے زیادہ اسے اداکاری کا شوق تھا۔شکل وصورت اچھی تھی۔دوران تعلیم ہی اسے ایک کمرشل کرنے کا موقع مل گیا اور یہیں سے ارسلان کا دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچا۔کمرشل کے بعد جلد ہی ارسلان کو ایک ڈرامے میں کاسٹ کرلیا گیا تھا۔ارسلان کے والدین کے نزدیک اداکاری کا شعبہ ناپسندیدہ تھا۔یہی خیال نصرہ کے والدین کا تھا۔انہوں نے نصرہ کا جھکاؤ ارسلان کی طرف دیکھتے ہوئے بھی نصرہ کی نسبت سالف نذر سے طے کردی۔وہ نصرہ کی سہیلی لبنیٰ کے کزن تھے۔نصرہ کو لبنیٰ کی سالگرہ میں دیکھا اور پھر اس کے گھر رشتہ بھیجنے میں تاخیر نہیں کی۔

ان کا جما جمایا کاروبار تھا۔سالف نذر اور ان کا خاندان نصرہ کے والدین کو بہت پسند آیا تھا۔مگر نصرہ کے دل میں ارسلان شاکر گھر کر چکا تھا۔

"لبنیٰ تم جانتی ہو، مجھے ارسلان سے محبت ہے۔تمہیں روکنا چاہیے تھا اپنے چچا چچی کو میرے گھر آنے سے۔"

لبنیٰ چپ تھی۔ان کی پرنم آنکھیں نصرہ پر کئی راز آشکار کر رہی تھیں۔

"تم سن رہی ہو ناں؟ مجھے نہیں پتا تم۔کیوں چپ رہیں اگر سالف سے تمہیں محبت تھی تو کیوں مجھے بھی ڈبویا اور خود بھی ڈوب گئیں۔"

نصرہ شارٹ ٹیمپر تھی۔جلد ہی غصے میں آجاتی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں پتا تھا۔نصرہ! میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔"

وہ سسک سسک کر رونے لگی۔نصرہ نے اسے کینہ توز نظروں سے دیکھا۔

"تم کتنا بھی روتی رہو مگر تمہارے آنسو کچھ نہیں بدل سکتے۔البتہ اگر تم سالف سے میری اور ارسلان کی کمٹمنٹ کی بات کرو تو شاید وہ اپنا فیصلہ بدل دے۔دیکھو اس طرح ہم دونوں کی زندگی آسان ہوجائے گی۔ہم اپنی زندگیوں میں خوش رہ سکیں گی۔"

نصرہ کسی بھی طرح اسے قائل کرنا چاہتی

تھی۔ لبنیٰ نفی میں سر ہلاتی رہی۔ نصرہ، لبنیٰ سے مایوس ہو کر چلی گئی مگر نصرہ اپنے آپ سے مایوس نہیں ہوئی ایک بار سالف سے مل کر ان پر لبنیٰ کے دل کا حال کھول کر رکھ دیا۔ وہ حیران تھے۔ لبنیٰ اور ان سے محبت؟ ان کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا۔

"اگر اس کے دل میں ایسا کچھ ہے بھی تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے گھر رشتہ میں نے اپنی رضا سے بھیجا ہے۔ لبنیٰ میری کزن ہے اور بس۔"

سالف کی سوچ آئینے کی طرح شفاف تھی۔ نصرہ بددل سی اٹھ گئی۔ اپنی اور ارسلان کی محبت کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ بظاہر وہ خاموش ہوگئی تھی مگر کچھ ہی دنوں بعد جب شادی قریب تھی اس کے گھر والوں کو ایک انجان نمبر سے فون کال اور کچھ تصاویر موصول ہوئی تھیں۔ زیادہ کچھ تحقیق کی ضرورت بھی نہ پڑی اور رشتہ ٹوٹ گیا البتہ لبنیٰ اور سالف کا کردار مجروح ہو کر رہ گیا۔ خاص طور پر لبنیٰ کی زندگی جہنم بن گئی۔

سالف کو یقین تھا یہ حرکت لبنیٰ نے کی ہے۔ وہ ہی سے محبت کرتی تھی۔ آخر لبنیٰ کی رازدار دوست نے ہی انہیں یہ سب بتایا تھا۔ لبنیٰ یقین دلاتی رہی کہ ایسا کوئی جذبہ اگر اس کے دل میں تھا بھی تو وہ ہزار پردوں میں چھپا تھا جسے وہ دل کے نہاں خانوں میں کہیں اندر ہی دفن کر چکی تھی۔ سالف کے لیے یقین کرنا محال تھا۔ نصرہ اور سالف کا رشتہ ختم ہو چکا تھا اس کے باوجود نصرہ کے گھر والے ارسلان کے لیے رضامند نہیں تھے۔ ان کے پاس نصرہ کی بھابھی کے اکلوتے کماؤ بھائی کی صورت ارسلان سے بہتر آپشن موجود تھا۔

"مجھے نہیں کرنی ولید سے شادی۔ مجھے ارسلان سے محبت ہے۔"

نصرہ نے بھی شرم جھجک بالائے طاق رکھ دی۔ ماں اور بھابھی ششدر رہ گئیں۔

"ارسلان جیسا لڑکا تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔ اس کی زندگی میں تمہارے علاوہ بھی کئی لڑکیاں ہیں۔ جن لڑکیوں کے ساتھ وہ کام کرتا ہے، ان کے ساتھ گھومتا پھرتا بھی نظر آتا ہے۔ اس میں سنجیدگی نام کو نہیں ہے پھر بھی تم اس کے لیے اندھے کنوئیں میں کودنا چاہتی ہو؟ ولید تمہیں خوش رکھے گا۔ وہ اچھا کماتا ہے۔"

ثمینہ بھابھی بے حد مخلص تھیں۔

"اور جو اس کی پہلی بیوی مر چکی ہے۔ کیا میرے لیے وہ ہی رہ گیا ہے؟"

نصرہ تو اعتراض تھا۔ ثمینہ بھابھی آبدیدہ ہو گئیں۔

"اللہ نے اس کی اتنی ہی زندگی دی تھی۔ بچے کی پیدائش کے وقت ہی اس کی حالت بگڑی تھی۔ نہ وہ زندہ رہی اور نہ بچہ۔ بس چند گھنٹوں میں سب ختم ہو گیا۔ ولید چار سال سے تنہا ہے۔ تمہارے لیے بہت مشکلوں سے اسے راضی کیا ہے۔"

بھابھی نے لفظ بہ لفظ حقیقت بتا دی۔

"اونہہ! مجھ پر یہ احسان کرنے کی ضرورت نہیں، مجھے ارسلان سے شادی کرنی ہے۔ اگر آپ لوگوں نے بات نہ مانی تو ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔"

وہ تڑ تڑ بولی ماں نے اس دیدہ دلیری پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ تو سمجھی تھی، سالف نذر اس کی راہ کا پتھر ہیں مگر یہاں تو ظالم سماج اب بھی ان کی منزل کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ اس سے قبل کہ — اس کا — ولید بختیار سے رشتہ باقاعدہ طے ہوتا ایک گرم حبس زدہ دوپہر میں اس نے اور ارسلان نے خاموشی سے نکاح کر لیا۔

وہ سہیلی سے ملنے کا کارگر بہانا کر کے گھر سے نکلی تھی۔ ارسلان کے فلیٹ پر سارا انتظام ہو چکا تھا۔ قاضی چار گواہ اور بس یہ تھی نصرہ احمر کی بے لگام خواہش کی تکمیل۔ اپنی ہی سہیلی کی زندگی کو برزخ بنا کر انہوں نے اپنے لیے پھولوں کی سیج سجائی تھی۔ لبنیٰ کی زندگی عذاب بن گئی تھی۔

لبنیٰ اور سالف کے والدین نے ان کی سادگی

سے شادی کردی تھی۔ سالف نذر کا خواب لبنیٰ نے ضرور اپنی آنکھوں میں سجایا تھا مگر سالف کی نگاہ میں اپنی بہنی کی بدولت وہ نامعتبر ٹھہری تھی۔ سالف نذر نے لبنیٰ پر خوشیوں کے در بند کردیے۔ سکھ کا سانس لینے کے لیے کوئی روزن نہ چھوڑا۔ اپنے لیے لبنیٰ کی محبت کو طعنہ بنادیا۔ وہ کس سے شکایت کرتی؟ کوئی بھی اس کا یقین کرنے کو آمادہ نہ تھا۔ جس دن نصرہ کی امی نے نصرہ کی گھر سے غیر حاضری کے سبب ان کے گھر فون کیا ان کے لیے ایک اور جہنم کا در کھل گیا۔

"پھر کوئی نیا چاند چڑھایا ہے تم نے۔ اس لڑکی کی راہ میں پھر کوئی مصیبت کھڑی کردی ہے۔ بتادو، وہ کہاں ہے؟ کیوں اس بے چاری کو دوست ہونے کی سزا دے رہی ہو؟"

لبنیٰ کا موبائل سالف کے پاس تھا۔ نصرہ کی امی سے بات کرکے وہ اس سے باز پرس کرنے لگے تھے بلکہ لبنیٰ کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے۔

"میں کچھ نہیں جانتی، وہ کہاں ہے۔ اتنا ضرور جانتی ہوں، وہ ارسلان کی محبت میں گرفتار تھی۔ اسی محبت کے حصول کے لیے وہ میرے پاس آئی تھی۔"

وہ پھٹ پڑی تھی ابتدا وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ ان کی اور سالف کی تصاویر کس نے نصرہ کے گھر بھیج کر اس کی زندگی میں آگ لگائی ہے مگر آہستہ آہستہ اس نے کڑی سے کڑی جوڑ ہی لی تھی۔ نصرہ ہی تھی ان کی واحد رازدار جس نے یہ بھید لبنیٰ کے رونے سے پایا تھا اور پھر سالف کے لیے اس کی محبت کو استعمال کیا تھا۔ وہ یہ سچ سالف کو بتانا چاہتی تھی مگر سالف نذر کے تھپڑ نے ان کے حوصلے کو توڑ دیا۔

"چپ ہوجاؤ۔ کیوں اس لڑکی کے دامن پر کیچڑ اچھال رہی ہو؟ تمہیں کسی کی عزت کا خیال نہیں۔ اف میں بھی کس سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ جس نے خود اپنی عزت و ناموس کی پروا نہیں کی۔"

سالف نذر اندھے ہوگئے تھے اور چاہتے تھے وہ گونگی بہری بن جائے۔

☆☆☆

اس نے پوری ایک رات وجاہا سے اپنی کارکردگی کو چھپایا تھا مگر اس کے پیٹ میں کوئی بات نہیں رہتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی اس نے وجاہا کے سر پر بم پھوڑا تھا۔

"کل اس شہزادہ سلیم سے بات ہوئی میری۔"

وجاہا بالوں میں برش کررہی تھی۔ سوئی جاگی کیفیت میں کہا جملہ بھی اسے غنودگی کا شاخسانہ لگا۔

"کون سلیم؟ کس کی بات کررہی ہو؟"

اس نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا جو پاؤں میں چپل پھنسا رہی تھی۔ اور دونوں ہاتھوں سے بکھرے بال بھی سمیٹ رہی تھی۔

"ارے وہ ہی جو بھائی بننے پر آمادہ نہیں۔ یعنی میرا بھائی تمہارا تو وہ سگا بھائی ہے لاکھ انکار کرے۔"

اس نے بے دلی سے جواب دیا اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ پھر گھر سے یونیورسٹی پہنچنے اور کلاسز کے وقفے کے دوران اس نے آہستہ آہستہ ساری تفصیل اس کے گوش گزار کردی۔ وجاہا اس پر سخت برہم تھی۔

"تم اس حد تک چلی جاؤ گی مجھے قطعی امید نہیں تھی۔ یہ سب غلط ہے۔ کیا پتا ہم جو یدان شیر کو سمجھ رہے ہیں وہ واقعی وہ نہ ہو۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو تمہارا یہ اقدام سراسر آ بیل مجھے مار والا ہے۔ تمہیں کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔"

وجاہا کیفے ٹیریا تک آتے ہوئے بولتی رہی۔ اس کی آواز بلند نہیں تھی۔ لہجہ ہموار تھا۔

"اور جب خود کو یہ طفل تسلیاں دے کر مطمئن ہوجاؤ تو سوچنا تمہارا بھائی کتنا خود غرض ہے۔ کیونکہ یادداشت اس کی گئی نہیں، اس کا ثبوت اس کی آنکھوں سے نکلتی وہ چنگاریاں ہیں جو مجھے بھسم کردینے کو بے تاب رہتی ہیں۔ نہ ہی وہ یدان کا ہم شکل ہے کہ شکل کے ساتھ نام کوئی نہیں چراتا۔ اور پلاسٹک سرجری سے اتنی مشابہت کا امکان بھی کم ہی

رہتا ہے۔ ظاہر ہے شکل بدلی جاسکتی ہے مگر مزاج
کڑوے کریلے جیسا اس کے علاوہ کسی کا نہیں
ہوسکتا۔" وہ تپ کر بولی۔

"تمہیں، اب ان سے بات کرنے کی
ضرورت نہیں۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی وہ
قابل بھروسا ہیں۔"

اس نے گھر کا۔ وہ بھی ناراض تھی، شدید تر۔

"قابل بھروسا تو وہ ہیں اور کہتے ہیں وقت
پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنالیا جاتا ہے یدان تو ہے
بھی تمہارا بھائی۔۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے وہ نہایت
سیدھا سادا، نیک خصلت، شریف النفس،
منکسرالمزاج، ہمدرد فطرت اور"

تضریم ابھی اور بھی قلابے اس کی ذاتِ شریف
کی شان میں ملاتی مگر وجاہا کی غضب ناک گھوریوں
کی تاب نہ لاکر اپنی زبان دانتوں تلے دبالی۔

وجاہا کا بس نہیں چل رہا تھا اس کے خالی بھیجے
والے سر پر کوئی بھاری چیز اٹھا کر مار دے۔

"تم نے ہمدردی کی عظیم مثال قائم کرتے
ہوئے یدان شمیر کو ان کے گھر تک چھوڑا، مدر ٹریسا ہو
تم اور وہ جنہیں تم گدھا سمجھ رہی ہو وہ تمہیں کیا سمجھ
رہے ہوں گے اندازہ ہے تمہیں؟"

وجاہا کو اسی بات پر طیش آرہا تھا۔ وہ غصے سے
کانپ سی گئی تھی، پتا نہیں وہ کیوں یدان کی بنائی
اجنبیت کی دیوار کو بلند کررہی تھی؟ تضریم یہ بات
سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایسی بھی کیا ناراضی؟ تضریم کے
سر پر تو سودا سوار تھا۔

"کیا سمجھے گا وہ مجھے؟ یہی کہ میں اسے
انسانیت کے ناتے۔"

وجاہا نے ہاتھ کھڑا کردیا۔

"بس بس یہ انسانیت کے بھاشن رہنے ہی دو
تم۔ تمہارا اپنا مطلب نہ ہو تو تم سگے باپ کو بھی نہ
پہچانو۔"

وہ اس کی قریبی دوست تھی۔ واحد اور زیادہ ہی
صاف گو۔

"بکواس مت کرو۔ اور اگر مطلب میرا ہے تو
تم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والوں میں سے
ہو۔ بلکہ بھلا تو ہوگا ہی تمہارا۔"

وہ بھی ہری مرچیں چبا رہی تھی۔

"ان کی والدہ کس قبیل کی ہیں، تمہیں پتا
ہے۔ اس سے بہتر ہے تم آنی کی بات مان لو۔"

اس بار وجاہا کا انداز ناصحانہ اور چہرہ ستا ہوا سا
تھا۔ مگر تضریم کا چہرہ مزید دہک گیا۔

"بات مانو تم اور چپ رہو۔ اللہ میاں کی گائے
اور ستی ساوتری بننے کا شوق تمہیں ہے۔ مجھے اپنے حق
کے لیے آواز بلند کرنی آتی ہے۔ وہ عذرِ لنگ تمہیں
ہی مبارک۔"

اس نے دانت پیسے۔

"تضریم! ان کی وہ والدہ صاحبہ سارہ شمیر عام
عورت نہیں ہیں اور وہ بھی عجیب مشکوک لگ رہے
ہیں۔ تم گھر تک چلی گئیں۔ دس سال کم نہیں ہوتے
۔ پتا نہیں کیوں تم نہیں سمجھتیں وہ ہمیں جانتے ہی
نہیں۔ تمہیں ڈر نہیں لگا؟ پلیز اپنا نہیں تو آنی کا ہی
خیال کرلو۔"

وجاہا بیچاری اس سے ہار مان کر اب پست لہجے
میں سمجھا رہی تھی۔

"مس تضریم!"

قریب ہی یدان شمیر کی آواز سن کر وہ دونوں
یوں اچھلیں جیسے ان کے سر پر بم گرا ہو۔

"آپ۔"

بے چاری وجاہا تو یوں تھی کاٹو تو بدن میں لہو
نہیں۔

"السلام علیکم!"

تضریم جلد ہی سنبھل گئی۔ بڑی سنجیدگی سے
اسے سلام داغا۔

اس نے محض وعلیکم کہا اور انگوٹھی اس کی سمت
بڑھادی۔ وجاہا نے شرمندگی بھلا کر اسے ایسے دیکھا
جیسے آنکھوں سے نگل جائے گی۔ تضریم نے بھی اپنی
غائب دماغی کو کوسا۔ وہ وہیں اسے کچن میں بھول آئی

تھی۔

"ارے یہ میں آپ کے گھر بھول آئی تھی۔"

اس نے انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لے کر مٹھی میں دبوچی۔

"معذرت۔ میں نے انتہائی غلط موقع پر مداخلت کی اب مس وجاہا سالف! آپ شوق سے اپنی اسٹیپ سسٹر کو میرے خلاف سمجھا سکتی ہیں۔حلانکہ سارہ شمیر ایک اچھی خاتون ہیں مگر آپ دونوں کا قصور نہیں یہ سوچ تو قریبی رشتوں کے ذریعے ہی پروان چڑھتی ہے۔"

وجاہا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔مگر وہ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔وہ بھی تن گئی۔

"میں اپنی بہن کو اچھی بری بات بتا سکتی ہوں۔میں نے وہ ہی کہا جو مجھے اس کے حق میں ٹھیک لگا۔اور آپ کیا جانیں رشتوں کو۔آپ تو اس جھنجھٹ سے فرار حاصل کر چکے۔"

وجاہا کے ماتھے پر بل تھے۔لہجے کی شکنوں کا تو حساب ہی نہ تھا۔تضریم حیران تھی۔وجاہا اتنی نڈر تو کبھی نہیں تھی۔

"اوکے۔تو سمجھاؤ اسے،اچھا ہے مجھ سے دور رہے یہ۔"

وہ برہم سا پلٹ گیا۔

"تم نے دیکھا انہیں۔انہوں نے کیسے اس عورت کی طرف داری کی۔۔اب اگر تم نے ان سے بات بھی کی تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

وجاہا اب بھی مشکوک تھی۔

"تم تاں مما کی صحبت میں رہ کر ان کی طرح ہوگئی ہو۔ہر بات پر روک ٹوک،شک،طعنے تشنے۔"

وہ روکھی ہوگئی۔

"کچھ نہیں کہتی میں۔چلو اب یہ چاٹ کھاؤ پھر گھر کے لیے بھی نکلنا ہے۔آنی نہیں کی ،صرف اسائمنٹ جمع کروانے گئی تھیں لڑکیاں اور اتنی دیر لگا دی۔"

تضریم نے اس کی مصالحت ومفاہمت کی پہلے کب قدر کی تھی جواب چپ رہ جاتی۔

"دیر تو ہو ہی چکی ہے۔تم یہیں بیٹھو،میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ جھٹ پٹ اٹھی۔بیگ کندھے سے لٹکایا اور یہ جا وہ جا۔وجاہا منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔

"پتا نہیں کیا خناس اس کے دماغ میں بھر گیا ہے؟جب تک آنی سے مجھے ذلیل نہیں کروالے گی اسے چین،سکون،قرار اور میرا اعتبار نہیں آئے گا۔"

وہ ابھی مزید اپنا دل جلاتی مگر اس کا موبائل گنگنانے لگا تھا۔

"تیمور لنگ کالنگ" کے الفاظ پر اس کا دماغ کھول گیا۔

"یہ لڑکی بھی ایک بلا ہے۔"

اس بے چارے کے نام کے ساتھ ایسے ہی اسے زچ کرتی تھی۔بارہا اس کے موبائل میں تیمور کے نام سے محفوظ اس کے نمبر پر "لنگ" کا اضافہ کیا تھا۔وجاہا "لنگ" حذف کرتی،وہ پھر یہی حرکت کر کے حظ اٹھاتی۔اب تو کبھی کبھی وجاہا کی زبان بھی پھسل جاتی تھی۔تیمور کے سامنے وہ شرمندگی اٹھا چکی تھی مگر وہ بے چارہ جانتا تھا یہ کس کے سبب ہے،اس لیے برا نہیں مانتا تھا۔

اس نے کال ریسیو نہیں کی۔اچھا تھا دل دماغ اور تیمور لنگ کو پہلے مقام پر ہی لگام ڈال دی جائے۔فوراً ہی اس نے پیغام بھیج دیا۔

"تضریم بتا رہی تھی، یدان واپس آگیا ہے۔اور اب وہ ہماری شادی رکوا دے گا۔کیا یہ ممکن ہے؟"

اس نے سر پکڑا۔کیا کرتی پھر رہی ہے یہ لڑکی؟

"نہیں۔"

یک لفظی جواب دے کر اس نے چاٹ کی پلیٹ اپنی طرف کھسکا لی اور دل جمعی سے کھانے لگی۔دو تین چمچ کے بعد ہی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔یہ مسالوں کی مہربانی تھی یا کب سے دل میں اترتے دکھوں کو باہر نکالنے کا بہانا،یہ صرف وجاہا

سالف جانتی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا۔ تضریم اس کے سامنے آ گئی۔

"سنئے پلیز۔"

اس کا نچی لہجہ بناوٹی تھا، چہرے پر مسکان بھی بڑی اوپری سی تھی پھر بھی وہ رک گیا۔

"تم، میرا مطلب ہے آپ وجاہا کی باتوں سے ہرٹ ہوئے ہیں ناں۔ میں اس کی طرف سے معذرت کرتی ہوں۔"

اس نے سانس لیے بغیر اپنے سر سے بوجھ اتارا۔ یقیناً وہ انتہائی بری اداکاری کر رہی تھی۔ یدان کا بے تاثر چہرہ اسے اپنی فضول کارکردگی کا یقین دلا چکا تھا۔

"مجال ہے جو یہ شخص متاثر ہو جائے۔"

اس نے دانت کچکچائے۔

"وہ درست کہہ رہی تھی۔ آپ مجھ سے بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔"

وہ بھی ادھار رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ گزشتہ روز کی ساری محنت جمع کئی دنوں کی مشقت سب اکارت جاتے نظر آ رہے تھے۔

"میں معذرت کر تو رہی ہوں۔ آپ بلاوجہ بگڑ رہے ہیں۔ میری بہن حد سے زیادہ وہمی ہے۔"

اس نے جھنجھلا کر اپنے مخصوص بناوٹ سے پاک کھردرے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی بہن کو غلط نہیں کہہ رہا اور اب پلیز میرا سر مت کھائیں۔ سامنے سے ہٹیں۔"

وہ بھی تند و تیز لہجے میں بولا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچیں۔ اتنی باتیں تو وہ کسی کی نہیں سنتی تھی اور یہ لہجہ ناقابل برداشت تھا۔

"جاؤ، چلے جاؤ احسان فراموش۔"

وہ بھی کم ظرفی کی اعلا مثال قائم کر رہی تھی مگر بات یہیں ختم نہیں ہوئی تھی۔ یدان نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ پھر وہ گاڑی کے دروازے کو کھولنے کے بجائے رک گیا۔

"تمہیں پتا ہے تضریم سالف! تمہیں میں بہت رعایت دے رہا ہوں ورنہ۔"

تضریم اس کے کڑے تیور دیکھ کر پہلے تو گھبرائی تھی پھر اپنے ازلی اعتماد کو آواز دی۔ ظاہر ہے جسے وہ اعتماد کہتی تھی عام لوگ اسے ڈھٹائی کہتے تھے۔

"ورنہ کیا؟ تم مجھ پر کوئی پرچا کٹواؤ گے۔ کوئی دفعہ لگاؤ گے؟ بولو اب چپ کیوں ہو؟"

وہ اس پر شیر ہوتا اس سے قبل وہ غرانے لگی تھی۔ یدان نے اسے تاسف سے دیکھا۔

"تم سے کچھ بھی کہنا بے کار ہے۔"

وہ اجنبیت کا خول تڑخنے لگا۔ آپ جناب سے وہ دونوں تم پر آ گئے۔ وہ نفی میں سر ہلا کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور اس پر نگاہ ڈالے بغیر گاڑی پارکنگ سے نکال لے گیا۔

"اونہہ تم سے کچھ بھی کہنا بے کار ہے۔ بڑا آیا افلاطون کہیں کا۔"

وہ اس کے لہجے و انداز کی نقل اتارتے ہوئے واپس کیفے ٹیریا کی طرف آ گئی۔

"یہ کیا؟"

ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا۔ وجاہا ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھ رہی تھی۔

"چلو بھئی، آنی کی کال بھی آ چکی ہے اور ہمارے بھائی کے ہم شکل نے کیا کہا؟"

وجاہا کا انداز سرسری تھا۔ اس نے منہ بنایا۔

"کوئی بھائی وائی نہیں ہے وہ میرا۔ بھی نہ بتاؤں میں اس سے کوئی رشتہ۔ کہنا سننا کیا وہ تو اونچی فلم ہے۔ اسے چھوڑو یہ بتاؤ میری پلیٹ کا بھی تم نے صفایا کر دیا؟ یہ کیا طریقہ ہوا؟"

وہ سب غم بھول کر چنا چاٹ کے غم میں مبتلا نظر آنے لگی۔

"تم چلی گئی تھیں۔ میں نے سوچا واپس غصہ کھا کر آؤ گی تم اس لیے۔"

اس نے وضاحت دی۔

"جھوٹ مت بولو۔ مان لو، تم پریشان ہو اور جب تم پریشان ہوتی ہو تو یہ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں تم سے۔"

وجاہا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ یہ رنگ گھبراہٹ کا تھا وہ خود کو پوشیدہ رکھنے میں بالکل کوری تھی۔ یہ فن اسے اگر آتا بھی تھا تو کم از کم تفریم سالف کے سامنے وہ اس گر کو آزما کر بھی ناکام ہو جاتی تھی۔ تفریم سالف اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

"اچھا چلو۔ اس چاٹ کے جھگڑے کا تصفیہ کرو اور میرے لیے پارسل کرواؤ۔"

تفریم نے لمحوں میں اسے مشکل سے نکال لیا۔ اور دوست کس وقت کے لیے ہوتے ہیں ظاہر ہے ساتھ ہنسنے رونے اور مشکل میں ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنے کے لیے۔ وجاہا کو اپنی خوش نصیبی کا یقین تھا۔

☆☆☆

وہ اپنی شادی رکوانے کی پلاننگ کر رہی تھی اور رمضان آ بھی گئے۔ رمضان کا بابرکت مہینہ شروع ہوتے ہی۔ شادی کی تیاری کے رنگ ذرا پھیکے پڑے تھے۔ رمضان کی اپنی رونق کے رنگ روز و شب، قلوب و اذہان، روح و اجسام کو منور کر رہے تھے۔ تفریم دیر تک دعائیں مانگتی نظر آتی تھی۔ اسے یقین تھا، رمضان میں مانگی گئی دعاؤں کے لیے عرش تک رسائی کا اسپیشل پیکج ہوتا ہے۔ یقین تو وجاہا کو بھی تھا مگر وہ تیمور اقبال کو اللہ سے مانگتی ہی نہیں تھی۔ وہ بس صبر اور ظرف کی کشادگی مانگتی تھی۔ گھر میں افطار پر نصرہ نے اپنے بھائی بھابھی کو مدعو کیا تھا۔ سب ہی خوش تھے۔ تیمور کی بہنیں جوش و خروش سے شادی کی تیاریوں کا بتا رہی تھیں۔ وجاہا بھی ان کے ساتھ باتوں میں شامل تھی۔ تیمور مارے باندھے بیٹھا تھا۔ وجاہا مغرب کی نماز پڑھنے کمرے میں گئی تھی اور اب عشاء کی اذان کے بعد بھی مصلے پر بیٹھی تسبیحات پڑھ رہی تھی۔ تیمور کی بہن زینیا کئی بار دیکھ کر آ چکی تھی۔ اسے کسی بات میں دلچسپی ہی نہیں تھی۔

وجاہا کھانا لگانے کی غرض سے اٹھی تو تیمور بھی کچھ دیر بعد اس کے پیچھے کچن میں چلا آیا۔

"اگر تم انکار نہ کرتیں تو آج سب کتنا اچھا ہوتا۔"

وہ اسے دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالے کھڑی تھی، اس کی بات پر دل میں ٹیس اٹھی تھی مگر چہرہ سپاٹ رہا۔

"تیمور بھائی! آپ اب یہ باتیں نہ کریں۔ یہی بہتر ہے بلکہ بہترین۔" وہ مطمئن تھی۔

"تفریم اتنی اچھی ہے، اسے کوئی بھی اچھا لڑکا مل جائے گا۔ تم کیوں مجھے مجبور کر رہی ہو اس کے لیے؟"

نصرہ کے قدم باہر ہی رک گئے تھے۔ وہ انجان نہیں تھیں۔ تیمور کا وجاہا کی طرف جھکاؤ وہ بہت پہلے بھانپ گئی تھیں۔

"وہ بہت اچھی ہے اور میں نہیں چاہتی، وہ کبھی دکھ اٹھائے۔ نصرہ آنٹی بھی اسی بات سے ڈرتی ہیں۔ آپ سب جانتے۔ آپ کو نصرہ آنٹی کے ماضی کا پتا ہے۔ وہ پھوپو ہیں آپ کی لیکن کوئی اور یہ سب نہیں سمجھے گا۔ نصرہ آنٹی کی وجہ سے تفریم پر کوئی حرف آئے میں نہیں چاہتی۔ اور مجھے یقین ہے آپ بھی نہیں چاہیں گے۔ وہ شفاف ہے بہت۔ اس کی قدر کیجیے گا۔"

اس کے خیالات سچے موتیوں جیسے تھے۔ نصرہ بھی دنگ رہ گئیں۔ وہ لڑکی کتنی اجلی سوچ رکھتی تھی۔ تیمور کے دل پر بھاری سل آ گری۔

"تم کہتی ہو تو میں اس پل صراط سے گزر جاؤں گا۔ بس دعا کرنا میرا دل سنبھل جائے۔"

تیمور پلٹنے لگا تھا۔ نصرہ جلدی سے چلی گئیں۔ وجاہا نے اپنی آنکھوں کی نمی کو اندر ہی اتار لیا۔

"میری ساری دعائیں تفریم کے لیے ہیں اور مجھے یقین ہے، اسے زندگی میں وہ سب ملے گا جس

کی وہ سب سے زیادہ حق دار ہے۔محبت،توجہ،بہترین شریک سفر اور تابناک مستقبل۔

☆☆☆

آج کل وجاہا کم کم ہی یونیورسٹی جارہی تھی۔

تضریم یونی جاتی واپس آکر کمرہ بند کیے پڑی رہتی یا پھر وجاہا سے الجھتی نظر آتی۔سالف نذر نے نکاح کا دن اپنی مرضی سے طے کیا تھا۔چاندرات کی خوب صورت شب نکاح اور پھر عید کے بعد رخصتی، پڑھائی کا کیا ہے شادی کے بعد بھی ہوسکتی تھی۔

نصرہ بس اتنے اچھے رشتے کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھیں۔"لڑکا خاندان کا ہے۔سگے ماموں کا بیٹا،اپنا کاروبار ہے۔خوب صورت،تعلیم یافتہ اور سب سے بڑھ کر محبت کرتا ہے وہ تم سے۔"ان کی آخری بات پر وہ تڑپ جاتی تھی۔نصرہ نظر چرالیتیں اگر وہ وعدے کی زنجیر میں نہ جکڑی ہوتی تو ان کی یہ غلط فہمی دور کردیتی۔

وجاہا نے کہا تھا وہ اس کا نام نصرہ اور سالف کے سامنے بھی نہیں لے گی۔نصرہ تو ہر بات سے واقف تھیں۔بلکہ غلط فہمی بھی کہاں تھی یہ سراسر غلط بیانی تھی۔اپنی ہی ماں کی شکایت کس سے کرتی؟ایک بار اس نے ایسا کرنا چاہا تھا اور آج تک وہ اس مار کی تکلیف نہیں بھولی تھی۔

یہ سب کس کے لیے تھا؟یہ سوال اس کے اندر اودھم مچاتا تھا۔جبکہ ان کی اپنی بیٹی خوش نہیں تھی۔

"تضریم!تم کس بات کا سوگ منارہی ہو؟تمہارے لیے ہی یہ سب کررہی ہوں اور تم ہو کہ ماں کو دشمن سمجھتی ہو۔"

وہ آج بھی کسی سہیلی کے گھر چلی گئی تھی۔اسے سیدھا کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر نصرہ نے ٹوکا تھا۔

"مما!مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اگر میں نے کچھ کہا تو گھر کا سکون تباہ ہوجائے گا۔"

وہ حلق کے بل چیخی تھی۔ایسے کہ وجاہا کے ہاتھ سے جوس کا جگ گر گیا۔وہ افطاری کی تیاریوں میں لگی تھی۔کانچ کا جگ گرنے اور ٹوٹنے کے ساتھ جوس نے ماربل کے فرش کو غسل دے دیا نصرہ غصے سے پاگل ہوگئیں۔

"تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔کوئی چیز تمہارے ہاتھ سے محفوظ نہیں۔تمہاری ہڈیاں مجھ سے خوراک مانگ رہی ہیں۔"

وہ اس پر جھپٹی تھیں۔مگر تضریم درمیان میں آگئی۔تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا۔

"مما!بس کردیں۔آپ کی یہ فرعونیت ایک دن آپ کو بھی غرق آب کرے گی اور ہمیں بھی اور کچھ نہیں تو روزے کا خیال کرلیں۔یہ ملازمہ نہیں ہے آپ کی۔یہ سب اس کے باپ کی کمائی کا ہے۔اس سے حساب لینے کے بجائے آپ روز محشر اللہ کو حساب دینے کی تیاری کریں۔کچھ نہیں ہے آپ کے پاس اس کے حضور پیش کرنے کے لیے سوائے منہ چھپانے کے آپ کچھ نہیں کرسکیں گی اس عظیم دن۔اس کریم رب سے کیسے رحم مانگیں گی؟جب آپ نے کسی پر رحم نہیں کیا۔"

نصرہ کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔اگر سامنے ان کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ شاید اس کا گلا دبادیتیں۔

"تضریم!اب اگر ایک لفظ بھی تم نے مزید کہا تو میں تمہارا حشر بگاڑ دوں گی۔"

انہوں نے دھمکی دی۔

"سچ کڑوا ہی نہیں بہت تیز دھار بھی ہوتا ہے۔کاٹ کر رکھ دیتا ہے وجود کو۔بس انسان سمجھ نہیں پاتا۔"

وہ بولتی چلی گئی تھی۔اب وہ اتنی چھوٹی بچی نہیں تھی جسے مار پیٹ کر چپ کروایا جاتا۔

"تم میری نظروں کے سامنے سے چلی جاؤ۔"

نصرہ بھی چیخی تھیں۔

"مما!میں تو چلی جاؤں گی مگر آپ خود سے کب تک بھاگتی رہیں گی۔آج اپنے شوہر کو سچ

بتادیں ورنہ یہ سچ انہیں بتاؤں گی۔"

وہ انہیں دھمکی دے رہی تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہوکر بھول گئیں کہ وہ وجاہا نہیں۔ انہوں نے اس کے بال مٹھی میں دبوچ کر اس کے منہ پر تھپڑوں کی برسات کردی تھی۔ وجاہا کے منہ سے دبی دبی چیخیں نکل گئیں مگر تضریم تو سرخ چہرے کے ساتھ ماں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بچاؤ کی کوشش بھی نہیں کی۔ وجاہا نے ہی اسے پیچھے کھینچا تھا۔

"پلیز آنی! اسے کچھ مت کہیں۔"

وہ منت کر رہی تھی۔

"ہاں، فساد کی جڑ تو تم ہو۔ مجھے تو تمہیں سبق سکھانا چاہیے۔ میری بیٹی کو میرے خلاف بھڑکائی ہو۔"

وہ وجاہا پر پل پڑی تھیں۔ اور اب تضریم اس کی ڈھال بن رہی تھی۔ وہ ہانپنے لگی تھیں۔ اور پھر مر جانے والی کو برا بھلا کہنے لگیں۔

"لبنیٰ دشمن تھی میری۔ اس نے مجھے سمجھایا ہی نہیں۔ اور خود اس جنت کی مالک بن بیٹھی۔ آج بھی وہ ہی میری زندگی کا سکھ چین برباد کر رہی ہے۔ میرے سینے پر اس بھاری سل کو رکھ دیا۔"

وہ مٹھیاں بھینچ رہی تھیں۔

"مما مجھے مت اکسائیں۔ میں کسی کے کہنے میں نہیں ہوں۔ میں آپ کی ہی بیٹی ہوں۔ ان چاہا رشتہ کبھی قبول نہیں کروں گی۔ اس کے لیے چاہے گھر سے بھاگنا پڑے یا مرنا پڑے۔"

وہ انہیں طیش دلا رہی تھی۔

"پلیز تضریم! خاموش رہو۔"

وہ اس کی منت کرنے لگی۔

"شرم نہیں آتی تمہیں۔ کیا کہہ رہی ہو؟ یہ صلہ دیا ہے تم نے مجھے۔ مجھے طعنہ دے رہی ہو۔"

وہ غم و غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔

"اولاد عکس ہوتی ہے والدین کا جیسے میرے ماں باپ تھے میں بھی تو ویسے ہی ہوں۔ دیکھیں مجھے آپ کا آئینہ ہوں میں۔ آپ کے کارنامے میرے سینے پر تمغے کی طرح سجے ہیں۔ تو اب میں بھی آپ کی تقلید کرتے ہوئے اسی کالک سے اپنے ہاتھ بھروں گی اور۔"

وہ زہر خند ہوئی تھی۔ پھر وہ تھی اور نصرہ کا جنون۔ وجاہا نے مشکل سے ان کے چنگل سے اسے نکالا۔ وہ تو اسے مار مار کر ادھ موا کر چکی تھیں۔

"ارے اس سانپ کی اولاد ہے ناں۔ ماں کو ہی آئینہ دکھا رہی ہے۔ جا اس باپ کے پاس۔ نفرت کرتا ہے وہ تجھ سے۔"

وہ تن فن کر رہی تھیں۔ وجاہا نے بامشکل اسے سنبھالا اسے سہارا دیے کمرے میں لے آئی۔

"تضریم! تم ٹھیک تو ہو نا۔"

وجاہا کو اس کی فکر تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ کسی مجسمے کی مانند اس کا وجود بالکل بے جان لگ رہا تھا۔

"تضریم! کچھ تو کہو۔"

وجاہا نے اس کا کندھا ہلایا۔

"گئی تھی کئی سال پہلے ان کے پاس۔ پتا ہے جب یزدان نے گھر چھوڑا میں بھی یہاں سے جانا چاہتی تھی مگر کہاں جاتی؟ باپ نے مجھے اولاد بھی تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کسی گناہ کا نتیجہ ہوں میں۔ میری ماں بدکردار تھی۔ تمہیں پتا ہے وہ شخص خود کو بہت عزت دار سمجھتا ہے۔"

وہ رو رہی تھی اور پھر وہ بے جان وجود کی طرح زمین پر آ رہی۔ وجاہا بوکھلا کر اسے آوازیں دینے لگی مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ نصرہ بیگم آوازیں سن کر بھی نہیں آئیں۔ اس نے بھاگ کر پانی کا گلاس اٹھایا۔ اسے پانی پلانے کی کوشش کی، پانی اس کے چہرے پر چھڑکا نصرہ کو آواز دی مگر بے سود۔ نصرہ تو بہری بن گئی تھیں۔ اس نے تیمور کا نمبر ملایا تھا۔ چند منٹ گزرے وہ آ گیا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟"

وہ متفکر تھا۔ اس نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ وہ ہی تھا جو اسے اٹھا کر گاڑی تک لایا۔ تضریم

میں تو سہارا دینے جتنی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ پیچھے پیچھے اس کی چادر ہاتھ میں لیے آ گئی۔ نصرہ غالباً اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ غصے میں ایسے ہی پاگل ہو جاتی تھیں۔ انہیں پھر کچھ دکھائی اور سنائی نہیں دیتا تھا۔ تفریم ہسپتال پہنچنے تک آنسو بہاتی رہی۔ تیمور لب بھینچے گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تھپڑوں کے نشان تھے۔ ایسا ہی حال بے ہوش پڑی تفریم کا بھی تھا۔ ڈاکٹر شاہینہ، تیمور کی کلاس فیلو کی بھابھی تھیں لہٰذا اسے کچھ زیادہ مشکل نہ ہوئی مگر ڈاکٹر کے چہرے پر بھی سوال تھے۔ تشویش تھی۔

اس نے وجاہا کے منع کرنے کے باوجود اس کا بی پی بھی چیک کروایا جو نہایت کم تھا۔ تفریم کو ہوش آیا تو وجاہا کی حالت بھی بہتر ہوئی۔

"یہ سب کیوں ہوا یہ نہیں پوچھوں گا، مجھے پتا ہے تم نے پھر پھوپو سے بحث کی ہوگی مگر کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اب ان سے کچھ نہ کہو۔"

وہ تفریم کا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ وہ اسی ہاتھ پر چہرہ ٹکا کر رونے لگی۔

"تیمور بھائی! آپ انکار کر دیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔ میں آپ کو وجاہا کے حوالے سے دیکھتی تھی۔ اور یہ سب۔"

اس نے وہ سب کہہ دیا تھا جو کبھی تیمور اور وجاہا نہ کہتے۔

"بکواس مت کرو تفریم!"

وجاہا خفت زدہ ہو کر بولی تھی۔

"تفریم! تم جانتی ہو، میں نے مما کو بہت مشکل سے وجاہا کے لیے آمادہ کر کے بھیجا تھا مگر ان میڈم کے انکار نے کام خراب کر دیا۔ میں نے تمہارے لیے منع کیا مگر مما پاپا کے جذباتی حربے اور وجاہا کی دھمکیاں مجھے بے بس کر گئیں۔ مما تمہاری گرویدہ ہیں۔ میں کیا کروں، اب تو شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔ انکار کر کے خاندان بھر سے رسوائی مول لینے کا حوصلہ مجھ میں نہیں۔ ماضی کے داغ ہی بہت مشکل سے بھولے ہیں لوگ۔ اب یہ نیا چرکہ ہم کیوں اپنے پیاروں کو لگائیں؟"

یعنی وہ سارا حساب کتاب کیے بیٹھا تھا۔

"گھر چلیں۔" وہ سرد لہجے میں بولی تھی۔

"ٹھیک ہے گھر چلتے ہیں مگر تم مجھ سے وعدہ کرو۔ اب پھوپو سے نہیں الجھو گی۔"

اسے تفریم کی فکر تھی۔

"مجھے وہ الجھنے پر زدوکوب کرتی ہیں۔ اس کا کیا جو ہر دم ان کے عتاب کا نشانہ بنتی ہے؟"

اس نے وجاہا کی طرف دیکھا۔

وہ انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

"میری فکر چھوڑو۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ عادی ہوں آنی کے سخت رویے کی مگر تم اس سب کی عادی نہیں ہو۔ بہت اچھا ہوگا تمہاری شادی ہو جائے اور تم اپنی زندگی میں مگن ہو کر یہ سب تلخیاں بھول جاؤ۔"

اس نے ہمیشہ یہی چاہا تھا۔ تفریم ایک اچھی دوست، بہترین رازدار تھی۔ اس نے صدقِ دل سے اللہ سے تفریم کی خوشیاں مانگی تھیں۔

"سب کچھ بھولنا ناممکن ہے۔ ہاں سب کچھ ٹھیک کرنا اتنا مشکل نہیں۔ اور میں سب ٹھیک کر کے رہوں گی۔"

وہ پرعزم تھی۔ وہ دونوں چپ رہ گئے اور جس وقت وہ ہسپتال سے نکل رہے تھے وہ سامنے آ گیا۔ وجاہا تو انجان بن گئی مگر وہ تن کر اس کے سامنے آ گئی۔ یدان نے پہلے ناگواری سے پھر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کا سرخ سوجا ہوا چہرہ۔ زرد ہوتی رنگت روتے رہنے کی وجہ سے بھاری ہوتی آنکھیں اور بکھرے سے بال وہ ڈیڑھ ماہ سے اسے یونی میں دیکھ رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی سادگی مگر تمکنت سے آتی تھی۔ نفیس لباس، پروقار انداز۔ دھلا ہوا بے داغ چہرہ۔ لباس تو آج بھی قیمتی تھا مگر کیا وہ اتنی بے مول تھی جو یہ حالت بنائی ہوئی تھی۔ چہرہ تو وجاہا نے بھی آدھے سے زیادہ چھپایا ہوا تھا۔

"کیا ہوا دنگ رہ گئے ناں؟ ارے یہ تو کچھ

نہیں ہماری روحوں پر اس سے زیادہ زخم لگے ہیں۔ مگر تمہیں کیا تم تو وہ ہو ہی نہیں جس کے دھوکے میں ہم نے تمہیں مدد کے لیے پکارا تھا۔"

اسے جتاتی، تلخ مسکراہٹ لیے دیکھتی وہ تضریم تھی ہی نہیں جسے وہ جانتا تھا۔

"چلو تضریم! ان سے ہمارا کیا واسطہ؟"

یہ وجاہا تھی ناراض نہیں سرد و جامد۔ تیمور بھی رک گیا تھا۔

"یدان! کاش میں کہہ سکتا، سالوں بعد تم سے مل کر خوشی ہوئی مگر صد افسوس تم تو بہت خود غرض نکلے۔"

وہ دونوں آگے بڑھ گئیں۔ تیمور نے بھی تقلید کی البتہ وہ الجھا ہوا سا وہیں ایستادہ رہ گیا۔

☆☆☆

سالف نذیر نے افطار پر ان دونوں کی غیر موجودگی محسوس کی تھی۔ تیمور افطار سے چند منٹ پہلے انہیں گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ نصرہ انہیں بلانے خود آ گئیں۔ تضریم بیڈ پر کان لپیٹے کروٹ کے بل لیٹی رہی۔ اس نے آنے کا عندیہ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ چہرے پر کنسیلر لگائے آ گئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ انہیں یاد رہتا تھا کہ ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔ وجاہا باپ سے کیا شکایت کرتی اسے اس بے خبر شخص سے کوئی توقع نہیں تھی۔

اپنی محبت پر اتنا اندھا یقین تھا انہیں کہ سگی اولاد کی پروا نہیں تھی۔ نصرہ کے رحم و کرم پر وہ تھی اور جسے وہ گنوا چکے تھے اس کو شاید بھلا بھی چکے تھے۔ نصرہ کی بناوٹی محبت۔ انہیں مطمئن کر دیتی تھی۔

"یہ تو پڑھائی پر بھی توجہ نہیں دیتی۔ اس کی جی پی اتنی کم ہوتی ہے اور تضریم ماشاءاللہ بہت اچھی ہے پڑھائی میں۔ مگر میں اس پر سختی بھی تو نہیں کرتی۔ سگی ہوں تو سوتیلی، کہیں کوئی الزام ہی نہ لگ جائے مجھ پر۔ اور"

وہ ان سے اختلاف کرتی بھی کیسے؟ انہیں غلط اور دروغ گو کہنے کی ہمت تھی ہی نہیں اس میں۔

"وجاہا! پڑھائی پر توجہ دیا کرو تم، اور ہمارا شیر کیسا ہے؟"

وہ یکین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ جانتی تھی پاپا کی نظر میں صرف نصرہ اور یکین کی اہمیت تھی۔ وہ بھائی تھا اس کا مگر اس سے بہت فاصلے پر تھا۔ نصرہ نے اس کے ذہن میں سگے سوتیلے کا فرق بٹھانے کی کوشش کی تھی مگر اس کوشش میں وہ اسے سب سے دور کرتی چلی گئیں۔ وہ بس اپنی غرض کا مارا بن گیا تھا۔ ایک ایسا بچہ جسے لڑکپن کی حد تک آتے آتے بس ضدیں منوانے اور خواہشیں پوری کروانے کی عادت ہو گئی تھی۔ اسے باپ پیسہ چھاپنے کی مشین لگتا تھا اور ماں جادوگرنی، ایسی جادوگرنی جسے سیاہ سفید کر کے اس کی ہر ضد کو ماننا تھا۔ اس کی ہر خامی کو ڈھانپنا تھا۔

ہر ماں اپنے بچے کی خامیوں کا پردہ رکھتی ہے مگر وہ انہیں صحیح غلط کی تمیز بھی سکھاتی ہے جبکہ وہ بس اپنی جیت پر شاداں فرحاں تھیں۔

ان کا بیٹا اپنے باپ کی جائیداد کا اکلوتا وارث تھا۔ ان کی بیٹی عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ تیمور سے اس کی شادی نصرہ کے خواب کی تکمیل تھی۔ تیمور دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ نصرہ کا بھتیجا تھا اور اس کے ساتھ وہ وجاہا کی شادی کسی صورت نہ کرتیں۔ وجاہا کو تو وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ رخصت کرنا چاہتی تھیں جو اس کی زندگی جہنم بنا دے۔

لبنیٰ کی بیٹی کے لیے وہ خوشی کی طلب گار ہوتی بھی کیوں؟ وہ ان کی سگی اولاد نہیں تھی سالف نذر کی پہلی بیوی کی بیٹی۔ وہ ہی بیوی جو مرتے دم تک سالف نذر کی ایک نگاہ التفات کے لیے ترستی رہی۔

☆☆☆

سالف سے رشتہ ختم کر کے نصرہ نے جس خوشیوں بھرے راستے کا انتخاب کیا، وہ ایک سراب کے سوا کچھ نہ تھا۔ ارسلان کے ساتھ وہ فقط دو دن اس کے فلیٹ پر رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے کہہ دیا

جاؤ واپس چلی جاؤ۔ فی الحال وہ لمبے عرصے کے لیے ترکی جا رہا ہے۔ اسے ایک ڈرامے کی شوٹنگ پر جانا تھا اور فلیٹ اس کے دوست کا تھا جسے وہ اس کا فلیٹ سمجھتی رہی تھیں۔

"میں کہاں جاؤں گی، کون مجھے اپنے گھر میں جگہ دے گا؟"

نصرہ اچانک ارسلان کے نگاہ پھیر لینے سے حواس باختہ ہوگئی۔

"واپس گھر جاؤ اور کہاں جاؤ گی؟"

وہ اپنا بیگ لیے تیار تھا۔ بس اسے کوچ کرنا تھا۔ اور وہ جو اپنے تئیں سب کشتیاں جلا آئی تھی۔ اس کے پلے تو رخت سفر باندھنے کے لیے صرف پچھتاوے بچے تھے۔

"تم پاگل ہوگئے ہو ارسلان! وہ سب ہزار سوال کریں گے مجھ سے۔ میری غیر موجودگی نے گھر میں طوفان اٹھا دیا ہوگا۔ قیامت آ گئی ہوگی۔"

آج اسے خیال آیا تھا جب خود پر مصیبت آن پڑی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا، تم بہانا کر دینا۔ کہہ دینا کسی دوست کے گھر تھیں۔ جھوٹ بولنے میں تو تم ماہر ہو۔ اپنی سہیلی کے کزن کو ہمارے راستے سے ہٹانے کے لیے تم نے کیا کمال کا پلان بنایا تھا، ایسی ہی کوئی کہانی سنا دینا۔"

وہ مطمئن تھا۔

"تمہیں اندازہ بھی ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں، دو دن سے وہ سب بے خبر ہیں کہ میں کہاں ہوں اور میں وہاں چلی بھی جاؤں اگر تم میرے ساتھ چلو۔ ہم وہاں جا کر سب کو اپنی شادی کے متعلق بتا دیں گے۔ امی ابو غصے ہوں گے پھر ہمیں معاف کر دیں گے۔"

نصرہ کے ذہن میں امید کی کرن جاگی۔

"قطعی نہیں۔ وہاں جانے کا مطلب ہے اس شادی کا اعلان اور میں اپنے کریئر کے اسٹارٹ میں شادی کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔"

نصرہ کو جھٹکا لگا تھا۔

"تم شادی کر چکے ہو مجھ سے۔"

وہ ہنسا تھا پھر اس کی طرف کوئی کاغذ بڑھایا تھا۔

"وہ نکاح نہیں بس ایک ڈراما تھا۔ ویسا ہی ڈراما جیسا تم نے اپنی سہیلی اور منگیتر کے ساتھ کیا۔ جھوٹ موٹ کے اسکینڈل کا، یہ جھوٹ موٹ کی شادی تھی۔"

ایک کاغذ نصرہ کے قدموں میں گر گیا جس پر فقط نصرہ کے دستخط تھے۔ ارسلان کا تو نام تک نہ لکھا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ ایک دم ہی اس کے وجود سے روح کھینچ لی گئی تھی۔ ارسلان کوئی غیر نہیں تھا۔ اس کا سگا تایا زاد تھا۔ وہ اسی سہارے تو یہاں تک آئی تھی۔ محبت اور رشتے داری نے اسے ایک پل کے لیے بھی خدشات کا شکار نہیں ہونے دیا تھا۔ اس وقت اس کے قدم نہیں ڈگمگائے تھے مگر اب پوری ہستی زلزلوں کی زد میں تھی۔

"اب واپس جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے اور اگر یہاں رہنا چاہتی ہو تو شوق سے رہو۔"

نصرہ کو آج شیطان کا روپ نظر آیا تو وہ پاگل ہوگئی۔ اس نے ساری ہمت مجتمع کر کے خود کو سنبھالا تھا اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے ارسلان کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی میں۔ قتل کر دوں گی تمہارا۔ تم غیرت سے عاری انسان ہو۔ میں چچا زاد ہوں تمہاری۔ تمہیں تایا کی عزت کا پاس تک نہیں۔"

وہ اسے تھپڑ مارنا چاہتی تھی مگر ارسلان نے اسے دھکا دے کر خود سے دور جھٹک دیا۔

"تمہیں تھا اپنی عزت کا خیال؟ اگر اتنی ہی نیک، باکردار اور پارسا تو یہاں تک آتی ہی نہیں۔"

وہ اس طعنے کو کیونکر برداشت کرتی وہ بھی بپھر گئی تھی۔

"بدکردار تم ہو۔ تم نے مجھے خواب دکھائے

،دھوکا دیا۔تمہیں میں چھوڑوں گی نہیں۔"
اب وہ چیختی چلاتی رہتی اس نے نہیں سننا تھا۔اسے فرق ہی کیا پڑتا تھا،وہ رکا نہیں نصرہ بول بول کر تھک گئی۔تنہا ہونے کے احساس نے اسے خوف زدہ کردیا۔اگر ارسلان کا دوست آگیا؟ یہ پہلا خیال تھا جس نے اس کے اندر برق سی بھردی۔وہ سرعت سے اٹھی تھی اپنا قیمتی اثاثہ گنوا کر اس نے چادر کی بکل ماری اور اس آسیب زدہ فلیٹ سے نکلتی چلی گئی۔پیچھے خواہشیں،تمنائیں،خواب نہیں تھے،خود غرضی،مطلب پرستی،بے خوفی،خود پسندی اور فریب جیسے احساسات قہقہے لگا رہے تھے۔وہ واپس اپنے گھر ہی آئی تھی۔والدین کی باز پرس،ناراضی،بھائی کا غصہ بلکہ نفرت و حقارت،بھابھی کی کھوجتی نگاہیں،عزیز و اقارب کے طعنے تشنے،الزامات،سوالات سب نے ہی اس کا استقبال بڑا بھرپور کیا تھا۔اور اس کے پاس ہر بات کا ایک ہی جواب تھا ارسلان شاکر۔وہ ہی اس کی بربادی کا ذمہ دار تھا۔وہ پوری آمادگی سے ارسلان کے ساتھ گئی تھی مگر واپس آکر اس نے یہی کہا تھا وہ زبردستی ساتھ لے گیا تھا۔اس نے اغوا کیا تھا اور باقی کی کہانی سنانے کی ضرورت نہ تھی۔اس کی بربادی کی داستان اس کے آنسو سنا رہے تھے۔ارسلان تین ماہ بعد اپنی والدہ کی فون کال پر واپس آیا تھا۔وہ انسے اس کے والد کی ناسازی طبع کا بتا چکی تھیں۔ارسلان کو دیکھ کر اس کے والد کی حالت مزید بگڑ گئی تھی۔وہ اس سے نفرت سے منہ موڑ چکے تھے۔
"چلے جاؤ ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں۔تم نے جو کچھ نصرہ کے ساتھ کیا،قابل معافی نہیں ہے۔"
وہ حیران ہوا تھا۔
"میں نے کیا کیا ہے؟ وہ خود میرے ساتھ گئی تھی۔"
وہ ہٹ دھرمی پر قائم تھا۔
"ہوسکتا ہے تم سچ کہہ رہے ہو مگر جو کچھ تم کرچکے ہو،اس کے بعد تمہاری کسی بات کا یقین نہیں ہے ہمیں۔تم اس خاندان کا حصہ ہوکر اتنا گر گئے۔"
اس کی والدہ زینت بیگم بھی رو رہی تھیں۔
"امی! مجھے معاف کردیں۔"
اس کی ندامت غرض سے پاک نہ تھی۔
"اگر تم ہم سے معافی چاہتے ہو تو نصرہ سے شادی کرلو۔اپنے چچا سے معافی مانگو اگر انہوں نے معاف کردیا تو ہم بھی معاف کردیں گے۔تمہارے ابو شرمندہ ہیں اپنے بھائی کے سامنے۔خاندان بھر میں ہماری رسوائی ہوچکی ہے اور کچھ نہیں تو اپنی آنے والی اولاد کا سوچو۔"
وہ ساکت رہ گیا تھا۔پھر چچا جان نے چاہے معاف نہیں کیا تھا مگر نصرہ کے لاکھ انکار کے باوجود سادگی سے ان کا نکاح کردیا گیا تھا۔
ارسلان کو نصرہ برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔اپنا بویا بہرکیف کاٹنا ہی تھا۔وہ دونوں ایک جیسے تھے۔چند ماہ بھی ایک چھت تلے لڑے بغیر ان کا ساتھ رہنا ممکن نہیں تھا۔
نصرہ سے شادی کے دو ماہ بعد اس نے کاروبار کرنے کے نام پر والد سے اچھی خاصی رقم لے کر اپنا پروڈکشن ہاؤس کھول لیا تھا۔ان دنوں وہ اپنے کام میں مصروف ہوتا تھا یا گھر آکر نصرہ سے جھگڑا کرتا تھا پھر اس کی زندگی میں ابھرتی ہوئی اداکارہ فاریہ شہزاد آگئی۔فاریہ سے دوستی اور محبت کی منازل طے ہونے تک وہ اپنا کاروبار شروع کرچکا تھا۔اس نے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔
نصرہ ایک بیٹی کو جنم دے چکی تھی اور ارسلان خود کو اس کا باپ سمجھنے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔اسے نصرہ سے لگاؤ نہیں تھا۔نہ ہی نصرہ اپنی بے عزتی بھولی تھی۔وہ کہہ چکا تھا نصرہ کے لیے جو کشش وہ محسوس کرتا تھا وہ تو اس کے ساتھ دو دن گزار کر ہی ختم ہوگئی تھی۔وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔خود ارسلان اپنے آپ کو شہزادہ گلفام سمجھتا تھا۔فاریہ شہزاد کے ساتھ وہ اپنے مستقبل کی پلاننگ کررہا تھا۔اس کے اسکینڈل کی خبریں سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر تہلکہ

مچانے لگی تھیں۔ نصرہ ایسی خبریں سن کر کہاں خاموش رہ سکتی تھی؟ ارسلان کئی دن بعد گھر آیا تھا۔ نصرہ نے آسمان سر پر اٹھالیا۔

"اگر دوسری شادی کرنی ہے تو مجھے طلاق دو۔"

اس کا مطالبہ ناقابل عمل نہیں تھا۔ ارسلان نے جلد ہی اس رشتے کو ختم کر دیا۔ گھر والوں نے ایک بار پھر نصرہ کو مورد الزام ٹھہرایا۔ والدین چاہتے تھے، وہ یہ رشتہ ہر صورت نبھائے وہ آزاد منش تھا۔ مگر نصرہ تو عورت ہونے کا فرض نبھاتے ہوئے اسے اپنا بنانے کی کوشش کرتی۔ اولاد کے لیے ہی سہی۔ اس بچی کا کیا مستقبل ہوگا؟ ارسلان اسے اپنی اولاد تک نہیں مانتا۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ نصرہ تو اسے اہمیت ہی نہیں دیتی تھی۔

"میں اپنی بچی کو خود پال لوں گی۔"

نصرہ کو بچی عزیز تھی۔ ارسلان نے فاریہ شہزاد سے شادی کر لی تھی۔ اس کے ساتھ بھی اس کی شادی چند ماہ ہی ٹکی تھی۔ اور فاریہ سے طلاق ہونے کے بعد وہ کوئی اور ہی جہان فتح کرنے نکل گیا تھا۔

نصرہ نے بھی ملازمت کر لی۔ بھائی اس کی ملازمت کے خلاف تھا مگر وہ گھر میں گھٹ کر نہیں رہ سکتی تھی۔ چھوٹی سی تضریم کو نانی سنبھالتی تھیں اور نصرہ صبح کی گئی شام کو واپس آتی اس کے بعد بھی کم ہی تضریم پر توجہ دیتی تھی۔

وہ ماموں زاد تیمور اور اس کی چھوٹی بہنوں زینیا اور سکینہ کے ساتھ کھیلتی لڑتی جھگڑتی، نانی اور ماموں سے ضدیں منواتی ماں سے دور ہوتی چلی گئی۔

پڑوس کے گھر سے اگر کوئی آتا تو نصرہ اسے اٹھا کر کمرے میں لے جاتی۔

دادا، دادی اس سے محبت کرتے تھے مگر ارسلان جو اس کا سگا باپ تھا وہ شاید اس کا چہرہ بھی نہیں پہچانتا تھا۔ وہ بھی کب جانتی تھی اسے؟ اور اسے فرق بھی نہ پڑتا اگر ہوش سنبھالنے کے ساتھ اپنے اردگرد رہنے والوں کی دل شکن باتیں اس نے نہ سنی ہوتیں۔

محلے دار، رشتے دار عجیب باتیں کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ اسے وہ سب باتیں سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

تضریم ماں سے کبھی سوال کرنے کی ہمت نہ کر سکی۔ مگر ممانی نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ باقی باتیں لبنیٰ سے پتا چلیں۔ اس نے خندہ پیشانی سے جو ملا اسے قبول کر لیا۔ وہ چاہے رشتے تھے یا لوگوں کے سوالات۔ اگر وہ قبول نہیں کرنا چاہتی تھی تو وہ تیمور اور اس کا رشتہ تھا۔ تیمور جسے اس نے بڑے بھائی کی طرح سمجھا۔ جو ہمیشہ اس کے لیے شفیق اور محترم تھا۔ کیسے وہ اپنے دل میں اس کا مقام بدل دیتی۔ وہ نہ نصرہ تھی نہ ارسلان، اس کے لیے رشتے بنانا اور توڑ کر مطمئن ہو جانا ممکن نہیں تھا۔ تیمور کی دونوں بہنوں کی شادی ہوئے بھی پانچ سال ہو چکے تھے۔ تیمور نے بھی تیس کا ہندسہ عبور کر لیا تھا۔ تضریم ایم کام کرنے کے بعد دو سال گھر بیٹھ کر پھر سے وجاہا کے ساتھ یونیورسٹی جوائن کر چکی تھی۔ وجاہا ڈرلی تھی۔ وہ تضریم سے چار سال چھوٹی تھی۔ عمروں کے فرق کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے کی بے تکلف سہیلیاں تھیں راز دار اور غم گسار۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں وہ بالکل نارمل تھی۔ یدان کو حیرانی تھی۔ وہ ایسی تھی جیسے گزشتہ روز یدان نے اسے دیکھا ہی نہ ہو۔ البتہ وجاہا ہمیشہ سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں اس کی کلاس میں نہیں آئی تھیں۔ آج یدان کا ان کی یونیورسٹی میں آخری دن تھا۔

پروفیسر احسان فاروقی اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے واپس آچکے تھے۔ مگر آج کلاس یدان نے ہی لی تھی۔ وہ اس قلیل عرصے میں طلبہ و طالبات کا پسندیدہ بن چکا تھا۔ سب ہی اس کے جانے پر افسردہ تھے۔ اصولاً انہیں بھی اس کی کلاس لینی چاہیے تھی مگر وہ دونوں اس سے نالاں و بدگمان

تھیں۔ چاہے کوئی تعلق نہ ہو مگر تضریم کا خیال تھا ،انسانیت کے ناتے ہی سہی اسے ان کا احوال پوچھنا چاہیے تھا۔ وجاہا نے اپنی رائے اس سلسلے میں محفوظ رکھی تھی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

ایک نوٹس بنا رہی تھی اور دوسری بے دلی سے کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ بھاری مردانہ آواز سن کر ان دونوں نے سر اٹھایا تھا۔ استعجاب کے بعد دونوں کی نگاہوں میں دوسرا تاثر ناگواری کا تھا۔ کتاب کی ورق گردانی کرنے والی لڑکی کتاب بند کر کے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔ مجھے آپ دونوں سے بات کرنی ہے۔"

وہ بھی برداشت کا کوئی کڑوا گھونٹ پی رہا تھا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

"بہت مہربانی۔ ہمیں آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔ ہمیں کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

وہ سلگ کر بولی تھی۔

"بیٹھ جاؤ تضریم! سن لو، یہ کیا کہنے آئے ہیں؟"

وجاہا نے قلم ایک طرف رکھ دیا۔

"کہیے کیا کہنا ہے؟"

وہ اسے شرربار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"تم اور وجاہا کل ہاسپٹل میں تھیں اور۔"

اس نے بات قطع کر دی۔

"مجھے اس موضوع پر کچھ نہیں سننا۔ تمہیں اگر ہمدردی چاہیے تو شوق سے سنو۔"

وہ اکڑ کر بولی۔ آواز تیز ہوگئی تھی۔ طالب علموں کے علاوہ لائبریرین نے بھی انہیں گھور کر دیکھا۔

"سائلنس۔"

وہ اس تنبیہ پر لب بھینچ گئی۔

پھر صرف اپنا بیگ اٹھایا اور کتاب اٹھائے بغیر وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ وجاہا، یدان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

وہ تضریم کی چھوڑی ہوئی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

"کیا تھا وہ سب؟"

وہ کس کے متعلق پوچھ رہا تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

"آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟" اس نے تجاہل عارفانہ برتا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو۔" اب وہ دانت پیس کر بولا تھا۔

"نہیں، میں نہیں جانتی۔"

وجاہا کا سرد لہجہ اسے غصہ دلا رہا تھا۔

"وجاہا سالف! تم آج بھی ان کی ماتحت، ان کے زیرنگیں، ان کی دست نگر ہو۔ آج بھی تمہاری اپنی کوئی سوچ، عقل، سمجھ نہیں۔"

خول چٹخ گیا تھا مگر صرف یدان کا۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

وہ بھی گیلی لکڑی کی طرح سلگی تھی۔

"تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔ وہ آج بھی بہت محترم ہیں تمہارے لیے۔ اور تمہاری وہ ہمدرد مجھ سے کہہ رہی تھی اسے کچھ نہیں سننا۔ ظاہر ہے یہ ظلم اس کی والدہ کر رہی ہیں، اسے تو برا لگے گا ہی، انہوں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے تمہاری اور یہ کہ وہ تمہاری شادی تیمور سے نہیں کرنا چاہتیں۔"

وہ کہنیاں میز پر ٹکائے قدرے آگے کو جھکا دبی آواز میں کہہ رہا تھا۔ اس کے لفظ لفظ میں انگارے دہک رہے تھے۔

"ایسا کچھ نہیں۔ اور تیمور بھائی، تضریم کو پسند کرتے ہیں۔ ان سب باتوں سے آپ کا تعلق نہیں۔"

اس نے اپنے نوٹس اور کتابیں اٹھائیں۔

"وجاہا سالف! میں بھائی ہوں تمہارا۔ مجھ سے غلط بیانی مت کرو۔"

وہ تڑپ ہی گئی تھی۔ مگر اس کی طرف ایک کاٹ

دار نگاہ کے بعد دوبارہ اس نے بھی نہیں دیکھا۔ بیگ کندھے پر ڈالا اس کے سامنے رکھی تضریم کی بین الاقوامی معاشیات کی کتاب اٹھائی اور تیز قدموں سے وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ اس کی آنسوؤں سے لبالب بھر جانے والی آنکھیں چند قدم چل کر ہی چھلک گئی تھیں۔

یہ تھا اس کا ماں جایا جو پونے دو ماہ بعد اجنبیت کا خول اتار کر اپنی اصل پہچان کو قبول کر رہا تھا۔ دس سال بعد بھی جس نے بہن کو دیکھ کر اس کے سر پر دست شفقت نہیں رکھا۔ اسے سینے سے نہیں لگایا۔ اس کے آنسو نہیں پونچھے۔ اس کا احوال نہیں پوچھا۔ کیا اس کی ناراضی اتنی شدید تھی کہ وہ اپنی پہچان تک بدل کر آیا تھا۔ وہ یزدان سالف سے یدان شمیر بن گیا۔ اس نے تو نگاہیں ہی بدل لی تھیں۔ مگر وہ دونوں لڑکیاں دھوکا نہیں کھا سکی تھیں۔

"وجاہا! بات سنو پلیز۔"

وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ اس کا ملتجی لہجہ سن کر بھی وہ نہیں رکی۔

"وجاہا! تمہیں امی کی قسم۔ پلیز رک کر مجھے سن لو۔"

اور اس کے قدم اتنی بڑی قسم پر تھم گئے تھے۔

"جلدی کہیے، کیا کہنا ہے؟"

وہ عجلت میں تھی۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

وہ اب بھی دس سال پرانا یزدان سالف تھا۔ وہیں اس کے کمرے کی دہلیز پر ایستادہ تھا۔

"چلو وجاہا! میرے ساتھ۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گا اور نہ تمہیں رہنے دوں گا۔ یہاں ہمارا کوئی نہیں۔"

اور اس کا ہاتھ تضریم نے تھام لیا تھا۔

"یہ کہیں نہیں جائے گی۔"

آج اس کے ہاتھ میں تضریم کا ہاتھ نہیں تھا مگر اس نے ذرا رد و بدل کے ساتھ کہا وہ ہی جملہ تھا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

وہ دنگ رہ گیا۔

"وہ عورت اب بھی ذہنی مریضہ ہے۔ تم ان کا ظلم سہہ رہی ہو۔ وہ ہم سے، ہماری ماں سے نفرت کرتی ہیں۔"

وجاہا نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"یہ ان کا فعل ہے۔ وہ نفرت کرتی ہیں مگر وہ میرا گھر ہے۔ جسے میں نہیں چھوڑ سکتی۔ مما کی محبت کا احساس ہے وہاں۔ اور میں آج بھی آپ کی طرح سرکش اور بااختیار نہیں میں چاہتی ہوں میری زندگی کا ہر فیصلہ بابا کریں۔"

اس کے لبوں پر ایک تلخ تبسم اُبھرا۔

"تو یہ کہو ناں۔ آج بھی تم اس شخص کو اہمیت دے رہی ہو جسے ہماری پروا نہیں۔ میں تمہارا بھائی ہوں مگر تمہاری نظر میں میرا مقام وہی ہے جو نصرہ بیگم نے متعین کیا تھا۔"

یزدان سالف کے الفاظ برچھی کی طرح اس کے سینے میں اتر گئے۔

"برسوں پہلے چھوڑ کر چلا جانے والا میرا بھائی لوٹ کر کبھی نہیں آیا۔ میرے سامنے سر یدان شمیر موجود ہیں۔ میرا بھائی ہوتا تو مجھے دیکھ کر اجنبی نہ بنتا۔ گزرا دن اس اجنبی شخص کی قدر دل میں گھٹا تا رہا ہے۔ مجھے اپنے بھائی سے ملنے میں اب کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ وہ مجھے پہچانتا نہیں اور میں اسے جانتی نہیں۔"

وہ سنگ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دل پر قطرہ قطرہ گرم سیال گر رہا تھا۔

"وجاہا! میں ناراض تھا تم سے۔"

وجاہا نے اسے دیکھا تو آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ دکھ ہی نہیں ان آنکھوں میں بے یقینی بھی تھی۔

"دس سال کم نہیں ہوتے ناراضی ختم کرنے کے لیے، وہ بھی اس صورت میں کہ مقابل صرف ایک بارہ سال کی کم سن بچی ہو۔ جس کا فیصلہ اس کی معصوم عمر کا تقاضا ہو۔"

وہ نادم نہیں ہوا تھا، ہاں متاسف ضرور تھا۔
"میں اب کیا کہوں؟ ہم ابھی بھی اسی حاشیے کے پار ہیں جو کسی کے عناد نے ہمارے بیچ کھینچا۔ تم اب بھی ان لوگوں پر مجھ سے زیادہ اعتبار کرتی ہو۔ یہ تمہارا انتخاب تھا، اپنی خوشی کو تیاگ کر ان لوگوں کے ساتھ رہنا۔ مجھے نظر آتا ہے۔ کس طرح ان کی بیٹی تمہیں اپنے اشاروں پر چلاتی ہے۔ اپنے ناپسندیدہ شخص کو زندگی سے نکالنے کے لیے وہ تو تمہارا استعمال کرنے سے بھی نہیں چوکی۔ مجھے آکر اس نے۔"
وہ جو انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ اس نے یک دم ہی اسے ٹوک دیا۔
"آپ کچھ نہیں جانتے۔ کچھ بھی اور مت کہیے۔ آپ جہاں ہیں خوش رہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور جیسا کہ آپ کہہ چکے ہیں کہ یہ میرا انتخاب تھا تو مجھے اسی طرح ان سب کے ساتھ رہنے دیں۔ یہی میری خوشی ہے۔"
وہ بے لچک تھی۔ وہ پراعتماد اور مضبوط نظر آرہی تھی۔ اسے یقین تھا، وہ یہی سب کہے گی۔ اپنی توقع کے مطابق اس کے خیالات سن کر وہ سخت مایوس ہوا تھا۔
"تم خوش نہیں ہو۔" وہ بھی وثوق سے بولا تھا۔
"آپ کو میری خوشی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
وہ بھی اسی کی بہن تھی۔ ضدی نہ سہی مگر کچھ تو غصہ تھا اسے بڑا دن سالف پر جس نے اپنی پہچان تک بدل ڈالی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا اور اس کی بہن سیڑھیاں اتر لی اس سے دور ہوتی چلی گئی ویسے ہی جیسے کبھی وہ خود دور ہوا تھا۔
☆☆☆
نکاح کی تقریب کے لیے دعوت نامے چھپ کر آچکے تھے۔ نصرہ نے اسے کارڈ کی تصویر واٹس ایپ پر بھیجی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں۔ اور انہیں اپنی کسی زیادتی کا احساس بھی نہ تھا۔ وہ ہر تقریب بہت دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اس کے دادا دادی کے علاوہ سب کے نام مہمانوں کی فہرست میں لکھوائے تھے اور اس کے باپ کو بلانے کا تو خیال بھی کسی کو نہیں آسکتا تھا۔ وہ خود ایسا چاہتی بھی فی الحال تو وہ سب رشتے ناتوں سے منہ موڑ لینے کی خواہش مند تھی۔ وجاہا سے بھی۔
وہ یونیورسٹی سے اپنی پرانی سہیلی کے گھر آگئی پھر نگہت آنٹی کی طرف۔ وجاہا نے اسے پوری یونیورسٹی میں ڈھونڈ لیا تھا۔ کال وہ نہیں اٹھا رہی تھی اور اسے تنہا چھوڑ کر چلے جانے کی حرکت اس کا دل دہلا رہی تھی۔ وہ اب گھر جاتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ وہ گھر بھی نہیں پہنچی ہوگی تو؟ اس تو کے آگے اس کی روح کانپ رہی تھی۔ کل ہی وہ نصرہ سے کہہ رہی تھی۔
"میں آپ کی ہی بیٹی ہوں۔ ان چاہا رشتہ کبھی قبول نہیں کروں گی۔ اس کے لیے چاہے گھر سے بھاگنا پڑے یا مرنا پڑے۔"
"وہ ایسی بے وقوفی نہیں کرے گی۔"
وہ پوائنٹ نکلنے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی وہ اب مین گیٹ کی طرف تیز قدموں سے چل رہی تھی وہ اپنے بیگ کا اسٹریپ تھامے دوڑ رہی تھی۔
"وجاہا! کیا ہوا ہے؟"
وہ بھی گھر جا رہا تھا۔ اس نے رک کر دیکھنے کا تکلف بھی نہ کیا۔ وہ کھول اٹھا۔ آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔
"آواز دے رہا ہوں۔ پوچھ رہا ہوں کچھ۔"
اس نے آنسوؤں کی دھند میں لپٹی سخت برہم نگاہ اس پر ڈالی۔
"مت آواز دیں۔ کچھ مت پوچھیں۔ مت کریں غیروں جیسے احسان۔ معاف کر دیں ہمیں۔"
یہ وجاہا کا انداز تھا ہی نہیں۔ وہ ششدر رہ گیا۔
"تم بھی ان کی بیٹی کی طرح بات کرنے لگی ہو مگر میں تمہیں اس طرح ناخوش نہیں دیکھ سکتا۔ بتاؤ

مجھے کیا مسئلہ ہے؟"

حالات تو کبھی بھی نہیں بدلے تھے۔اب تو شاید بدتر ہو گئے تھے۔

اس کی دھند میں لپٹی آنکھیں ایک دم برس پڑیں۔وجاہا کو تو ہمیشہ تضریم کا کندھا درکار رہا تھا اس وقت سامنے اس کا عزیز از جان بھائی موجود تھا۔دس سال اس نے اسی کی تو راہ تکی تھی۔وہ ناراض سہی مگر اس سے بدگمان نہیں تھی۔وہ یک دم ہی اس کے سینے سے سر ٹکا کر رونے لگی تھی۔

"بھائی! تضریم کو بچالیں۔وہ خود کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔وہ اپنے والدین کو ان کے جیسا بن کر دکھانا چاہتی ہے وہ ایسی نہیں۔وہ پاگل ہے بس میرے لیے۔ہمارے لیے وہ اپنی ماں کو اور ہمارے باپ کو سبق سکھانے کے درپے ہے۔"

وہ اس کا سر تھپکتا اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس نے اردگرد گزرتے لوگوں کی پروا کیے بغیر اسے رونے دیا تھا۔پھر اسے تھام کر اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا۔وہ اب بھی سوں سوں کر رہی تھی۔

"مجھے سکون سے بتاؤ اب سارے حالات۔"

ظاہر ہے تضریم ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔اس پر ایسی بھی کیا افتاد آپڑی تھی جس کے لیے تضریم بھی اس کی منتیں کرتی رہی تھی اور آج وجاہا کی حالت اور اس کے الفاظ نے اسے چونکایا تھا۔پھر وہ بتاتی چلی گئی۔

"وہ تیمور سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔اسی بات پر روز جھگڑتی ہے۔وہ بہت پریشان ہے۔"

اس نے حتی المقدور لہجہ سرسری رکھا۔اپنا ذکر وہ حذف کر گئی تھی۔

"معاملہ وہی پسند کی شادی کا۔ظاہر ہے وہ اپنی والدہ ماجدہ کے نقش قدم پر ہی چلے گی۔مرنے دو اسے،چھوڑنے دو گھر۔تم کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو؟ماں ہے اس کی سوچے کی وہ اس کے لیے۔ہماری طرح یتیم ویسیر نہیں۔"

وجاہا کا دل دہل گیا۔

"بھائی! آپ کتنے بے حس ہو گئے ہیں۔اور خودغرض بھی۔کل کو آپ مجھ سے ناراض ہو کر مجھے بھی جیتے جی مرا ہوا تصور کر لیں گے۔تو بہتر ہے ابھی یہ سمجھ لیں۔"

وہ گاڑی سے اترنے لگی۔اس نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔

"وجاہا!تم تم مجھے آج بھی بے حس اور خودغرض سمجھتی ہو۔"

اس نے بھی حساب برابر کر دیا۔وہ آنسوؤں کا گولہ سا حلق سے اتار کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

"میں اب کچھ نہیں کہوں گی۔کیونکہ دس سال پہلے جو فیصلہ آپ نے کیا تھا،وہ اب میں بھی کر رہی ہوں۔مجھے آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ظاہر ہے جو کل چھوڑ کر جا سکتا ہے،آگے بھی۔"

اور وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔وہ چپ ہو گئی۔

"بتاؤ وہ کہاں جا سکتی ہے گھر کے علاوہ۔"

یہ بحث لاحاصل تھی۔وجاہا اس کی بہن تھی۔اس کی ماں کی آخری نشانی۔اسے جان سے زیادہ عزیز تھی اور وہ چاہنے کے باوجود اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔چاہے پھر اسے سالف نذر،نصرہ اور اس کی اولاد کو بر[illegible] کرنا پڑے۔

"اس کی [illegible] سہیلیاں ہیں۔ندا سے سب سے قریبی۔ایم کام تک وہ دونوں ساتھ تھیں مگر ان دنوں ندا اپنے سسرال نواب شاہ گئی ہوئی ہے۔پتا نہیں شاید گلزار یا کائنات کے گھر میں کال کر کے پتا کر لی ہے [illegible]۔"

[illegible] نے بھی اب کام کیا تھا۔اسے اپنے بے ہاتی [illegible] پر غصہ آنے لگا۔ایسا بھی کیا بے اوسان [illegible]۔سدھ بدھ ہی بھلا دی میں نے۔گلزار نے تو کہا تھا وہ نہیں آئی مگر وہ وہیں تھی۔دروازہ گلزار کی امی نے کھولا تھا۔

"آنٹی!وجاہا آئی ہے؟"

وہ اس کی گاڑی دیکھ چکی تھی۔ پھر بھی پوچھا تھا۔

"آئی ہے، غصے میں ہے کہہ رہی ہے۔ گھر چھوڑ دیا ہے۔"

نکہت آنٹی اس کے بچپن سے اسے جانتی تھیں۔ ان کے اسکول سے اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ شہر کا نجی تعلیمی ادارہ چلا رہی تھیں۔ وجاہا نے بھی ان کے اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ اور انہیں یدان بھی جانتا تھا۔ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی گلزار ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس سے یدان کی بھی اچھی دوستی ہوتی تھی۔

وجاہا نے سکون کا سانس لیا۔ مگر وہ مضطرب ہوگیا۔ تو وہ درست تھا۔ معاملہ وہی تھا پسندیدگی کہیں اور تھی۔ اور ماں تیمور کے پلے باندھ رہی تھی۔ تیمور اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ نصرہ کی طرح اسے نصرہ کے رشتے دار بھی پسند نہیں تھے۔

"ارے یہ تو یدان ہے۔"

نکہت آنٹی نے اسے غور سے دیکھا۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے علاوہ اس کے قد کاٹھ اور کسرتی جسم کے نمایاں فرق کے باوجود وہ اسے اسی طرح پہچان گئی تھیں جیسے تنزیم اور وجاہا نے پہچانا تھا۔ اس نے سلام کیا، وہ جواب دے کر حال احوال پوچھنے لگیں پھر انہوں نے اصرار کیا تھا وہ اندر چلے جبکہ وہ متامل تھا۔ وہ یہیں سے لوٹ جانا چاہتا تھا۔

"گلزار خوش ہوگا تم سے مل کر۔ بہت یاد کرتا ہے وہ تمہیں۔"

وہ ان نرم دل، ہمدرد فطرت خاتون سے یوں بھی مرعوب رہتا تھا [illegible] بھی اس نے ان سے معذرت کرلی۔ وہ اندر چلی گئیں۔

"وجاہا! [illegible] تمہارے پاس؟"

اس نے [illegible] نکالا تھا۔

"جی بھائی۔"

تنزیم نے [illegible] ماری تھی۔ اس کی تمام معلومات حاصل کی تھیں۔ اس نے وجاہا کا فون نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا۔

"اپنا خیال رکھنا اور تم پہنچ کر مجھے انفارم کرنا۔"

اچھا [illegible] سارے ملال ختم ہو گئے تھے۔ وہ مسکرا دی۔

"[illegible]"

[illegible] ہاتھ رکھا۔ پھر اسے اندر [illegible] گاڑی میں جا بیٹھا۔ وجاہا اندر چلی گئی تو وہ وہاں سے چلا گیا تھا اب وہ سڑک پہ بے مقصد گاڑی دوڑا رہا تھا۔

☆☆☆

[illegible]پن کا زمانہ تھا وہ سوچتا تھا کاش گلزار کی [illegible] اس کی ماں نے بھی اس کے باپ سے [illegible] لی ہوتی اور اسی طرح تن تنہا اس کی پرورش [illegible]

گلزار نے کبھی کسی محرومی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جبکہ وہ باپ کے ہوتے ہوئے ان کی محبت اور توجہ سے محرومی پر کڑھتا تھا۔ اپنی ماں کی بے وقعتی [illegible] باپ سے برگشتہ کرتی چلی گئی۔ سالف نذیر ایک تنگ دل شخص تھے انہوں نے لبنیٰ کو بھی اس ایک غلطی کے لیے معاف نہ کیا جو وہ ان سے محبت کرکے سرزد کرچکی تھیں۔ اس کے علاوہ تو لبنیٰ کا کوئی جرم نہیں تھا۔ وہ اگر لبنیٰ سے اپنی شادی کے بعد نصرہ کے جھوٹ کو بھول کر آگے بڑھ جاتے تو شاید لبنیٰ کی زندگی بے آب و گیاہ نہ گزرتی مگر وہ گناہ جو لبنیٰ نے کیا ہی نہیں تھا اس کی سزا انہیں سالف نے ہی نہیں ان کے پورے خاندان نے دی تھی۔

بظاہر یہی لگتا تھا سب ٹھیک ہوجائے گا۔ سالف انہیں الزام دے کر بھی ان سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان کی بیوی کے درجے پر فائز تھیں۔ طعنے تشنے ان کی جانب سے برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ شادی کے پہلے سال ہی وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئیں مگر سالف نذیر کے دل کی ملکہ نہ بن سکیں۔ وہ لبنیٰ کو دھوکے باز ہی سمجھتے رہے۔ چار سال

بعدان کی زندگیوں میں وجاہا کے ننھے وجود کا اضافہ ہوا اور اسی سال لبنی کی زندگی کے بدترین دنوں کا آغاز ہوا۔

نصرہ کی ملاقات سالف سے ایک بزنس میٹنگ میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں کسی بزنس مین کی پرسنل سیکٹریری کے طور پر موجود تھی۔ سالف کو دیکھتے ہی وہ ان کی سمت لپکی۔ اف وہ اتنے عرصے ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے لبنی اور سالف سے کیسے بے گانی رہ گئی؟ وہ متعجب تھی۔ زندگی میں ایسے بھی جھمیلے نہ تھے کہ وہ اُس کہانی اور اُس کے کرداروں کو بھولتی۔ جن کی جڑیں کاٹ کر اس نے اپنی زندگی کی شاہراہ پر پھول کھلانے کی خواہش کی تھی۔

سالف نے اسے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ وہ پہلے سے بھی بڑھ کر کچھ اور جامہ زیب اور دل نشین ہوگئی تھی۔ کیسی ہو؟ کے جواب میں اس نے ذرا سے ردوبدل کے بعد اپنی المناک کہانی سالف کے گوش گزار کردی۔ گزشتہ سالوں میں اسے یہ کہانی دہرانے کی عادت سی ہوگئی تھی۔

"پہلے سہیلی نے میری خوشیوں پر شب خون مارا پھر گھر والوں نے زبردستی بدکردار اور بدفطرت کزن کے پلے باندھ دیا۔ اس نے مجھے کبھی ذہنی سکون نہیں دیا۔ آپ سے رشتہ ٹوٹنے کے طعنے دیتا رہا، ان تکلیف دہ یادوں کے حوالے نے میری زندگی جہنم بنادی تھی۔ کون یقین کرتا کہ میری سہیلی ہی میرا رشتہ ٹوٹنے کی وجہ تھی سب کو مجھ میں ہی عیب نظر آتے تھے۔ ارسلان نے بیٹی کو بھی محبت نہ دی اور میرے کردار کے پرخچے اڑاتے ہوئے اسے اپنی بیٹی تسلیم کرنے سے بھی انکار کردیا۔ مجھے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ میں نے دنیا کی زہریلے تیروں جیسی نظریں سہی ہیں۔ حقارت، نفرت سہی پر اپنی بیٹی کا بوجھ خود اٹھایا۔ آپ تو خوش ہیں مگر اس لبنی نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا، پتا نہیں کس جنم کا بدلہ لیا اس نے مجھ سے۔"

وہ دونوں سب کی نگاہوں سے بے نیاز ایک کونے میں راز و نیاز کررہے تھے۔

"میں خوش نہیں ہوں۔ اس دھوکے باز عورت کے ساتھ مجھے کوئی لگاؤ نہیں ہوسکا۔"

سالف نذر کی نگاہیں، لہجہ، الفاظ نصرہ کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔

"کیا میں کبھی کبھی آپ کو کال کرسکتی ہوں۔ سچ بتاؤں تو دنیا مجھے جج ہی کرتی ہے۔ واحد آپ ہیں جس نے مجھے سنا بغیر کسی الزام یا نصیحت کے۔"

وہ بھی ایسی ہی کوئی بات کہنا چاہتے تھے۔ فون یا پھر ملاقات مگر نصرہ سبقت لے گئی۔ پہلے وقت بے وقت پیغامات موصول ہونے لگے پھر لمبی لمبی فون کالز کی مصروفیت۔

لبنی کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ مگر وہ شوہر سے کوئی سوال کرنے کی مجاز نہیں تھیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس ملاقات کو چند ہفتوں بعد ہی انہوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ نصرہ اور سالف نے کورٹ میرج کی تھی۔

یہ شادی لبنی کی خوشیوں سے خالی زندگی میں طوفان لے آئی۔ پہلے بھی زندگی مشکل تھی لیکن نصرہ نے آکر لبنی کو بالکل ہی دیوار سے لگا دیا۔ نصرہ فاتح تھی۔ آئی اور ان سے وہ گھر بھی چھین لیا جس میں کم از کم کچھ گھڑیاں وہ اپنی مرضی اور سکون سے گزار لیتی تھیں۔

سالف نصرہ کے بے دام کے غلام تھے۔ وہ ان کی نظر میں مظلوم تھی جبکہ لبنی ایک شاطر چال باز عورت۔ وہ عورت جس نے اپنے حق کے لیے صدائے احتجاج تک بلند نہ کی۔ ماں باپ بہن بھائی تو ان تصاویر والی کہانی پر اندھا اعتبار کرچکے تھے مزید وہ کس سے شکایت کرتی۔ ان کے مطابق تو انہوں نے اپنی راہ خود ہی کھوٹی کی تھی۔

لبنی کی دو بڑی بہنیں شادی شدہ تھیں اور دونوں بھائی اپنی زندگی میں مگن۔ انہیں اپنے کاروبار کی فکر تھی۔ دونوں کی نسبت ان کی مرضی اور پسند سے طے ہوئی تھی۔ بس وہ ہی تھیں جن کے سر محبت

کرنے کا گناہ تھا۔ وہ اس محبت کو بھی رو دھو کر بھول چکی تھیں۔ یاد تھی تو اپنی تذلیل، بے وقعتی اور کم مائیگی۔ وہ سالف اور نصرہ کی شادی کے بعد ایک بار ماں باپ کے گھر گئی بھی تھیں۔ مگر ماں نے کہا، بچوں کی خاطر اسی گھر میں رہو۔ سالف تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ تو تم کیوں اپنی جگہ چھوڑ رہی ہو؟ اور وہ اپنی ماں کو قائل کرنے کی کوشش کیے بغیر سالف کے آنے پر خاموشی سے واپس آگئیں۔

"میں پہلی بار نصرہ کے سمجھانے پر تمہیں لینے گیا تھا۔ آئندہ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کہ میں تمہارے پیچھے بار بار نہیں آؤں گا۔ نصرہ بھی میری بیوی ہے۔ اور اب وہ میرے گھر میں رہے گی۔ جب وہ تمہیں برداشت کرنے پر آمادہ ہے تو تمہیں بھی اس کی موجودگی گراں نہیں گزرنی چاہیے۔ بلکہ اس کا احسان مانو وہ اب بھی تمہاری خیر خواہ ہے۔ دوستی کا حق ادا کر رہی ہے۔"

سالف نے راستے میں ان پر واضح کر دیا کہ وہ کیوں کر لینے آئے تھے۔ وہ دل مسوس کر رہ گئیں۔ لبنیٰ نے سمجھ لیا تھا انہیں اپنے بچوں کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ مگر نصرہ کو تو لبنیٰ اور بچے خار کی مانند چبھتے تھے۔ سالف کے سامنے لگاوٹ کا مظاہرہ کرتی۔ "لبنیٰ سہیلی ہے میری، بچے مجھے آنی کہیں تو اچھا لگے گا۔"

مگر سالف کے پیچھے وہ ان ہی بچوں سے نفرت کا اظہار کرنے سے دریغ نہیں کرتی تھی۔ خصوصاً یدان سے وہ انتہائی برا سلوک روا رکھتی تھی۔ اس کے کھیلنے پر پابندی، اس کی فرمائشوں پر روک اس کے باپ کی طرف لپکنے پر اعتراض۔ سالف کے سامنے وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں صرف اس کی برائی کرتی تھی۔

"یہ بھی بہت ہی ضدی ہے۔ ظاہر ہے اکلوتا بیٹا ہے ناں مگر اسی کی عمر کی میری تضریم ... حال ہے جو کبھی ضد کرے۔ بڑی صابر بچی ہے۔ یہ تو ذرا سی بات پر گھر سر پر اٹھالیتا ہے۔"

اور سالف دیکھ رہے تھے، وہ دن بہ دن ہٹ دھرم ہوتا جا رہا ہے۔ نصرہ بات بے بات اسے جھڑکتی تھی تو کبھی تھپڑ لگا دیتیں۔ کبھی اس کا کوئی کھلونا اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی بیٹی کو دے دیتی یا توڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اسے تو اس کے اور تضریم کے ایک اسکول میں داخلے پر بھی اعتراض تھا مگر اس معاملے میں وہ ناکام ٹھہری تھی کچھ بھی ہو وہ سالف نذر کا اکلوتا بیٹا تھا۔

شہر کے بہترین اسکول میں اسے داخل کروا کر سالف نے باپ ہونے کا فرض ادا کر دیا تھا۔ وہ ذہین بچہ تھا مگر یہ نصرہ کی کوشش تھی جس کی وجہ سے جلد ہی اس کا رزلٹ خراب ہونے لگا۔ مسلسل ذہنی اذیت اور بے جا شکایتوں نے اس کی تعلیمی کارکردگی پر اثر ڈالا تھا۔

وہ تیسری جماعت کا طالب علم تھا جب وقت پر ہوم ورک نہ کرنے اور کلاس میں لڑائی جھگڑے کرنے کی وجہ سے اس کا اسکول بدلنا پڑا تھا۔ وہ ایک حساس بچہ تھا۔ نصرہ کا سلوک، ماں کی بے بسی اور باپ کی طرف سے نظر اندازی نے اس کے دل و دماغ پر منفی اثرات مرتب کیے تھے۔

وہ دس سال کا تھا اور وجاہا چھ سال کی جب ایک رات لبنیٰ نے بہت خاموشی سے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ وہ بیمار تھیں۔ چند ماہ پہلے انہیں جگر کا سرطان تشخیص ہوا تھا۔ شوہر کی بے التفاتی پتا نہیں کب سے انہیں اندر سے کھا رہی تھی۔ بیماری تو ایک بہانا تھی وہ تو برسوں پہلے اندر سے مر چکی تھیں۔

ان کی موت صرف ان کے بچوں کے لیے سانحہ تھی باقی دنیا میں کسی کی زندگی نہیں رکی تھی۔ ان دنوں یدان اپنی بہن کے لیے جیسے ماں بن گیا تھا۔ وہ وجاہا کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی ماں اسے بہن کا خیال رکھنے کی تلقین کر کے دنیا سے گئی تھیں۔ وجاہا بھی بھائی سے انسیت رکھتی تھی لیکن پھر تضریم اس کے قریب ہوتی چلی گئی۔ وہ لبنیٰ سے بھی محبت کرتی تھی۔ اپنی ماں کا دوغلا

سلوک اسے نظر آتا تھا۔ نانی سے شکایت کرتی تو وہ اسے یدان اور وجاہا کا خیال رکھنے کی تلقین کرتی تھیں۔ وہ بھی وجاہا کے آنسو پونچھ کراس کی دوست بن گئی تھی۔

"میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ میرے بابا نہیں ہیں اور تمہاری مما۔"

اور بس یہ ایک کامن چیز ان کے درمیان پل بن گئی۔ یہ تو وجاہا کو بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ تضریم کے والدین میں طلاق ہوئی تھی۔ اور اس کے والد مشہور ڈرامہ ایکٹر اور پروڈیوسر تھے۔

وجاہا کے لیے تضریم ایک ڈھال بن گئی تھی۔ ان دنوں نصرہ نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ایک بیٹے کی ماں بن کر نصرہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اور اس بچے کے دنیا میں آتے ہی اسے یدان سالف غیر ضروری لگنے لگا تھا۔ ہاں وہ اس گھر میں ایسے ہی اضافی حیثیت رکھتا تھا جیسے اس کی ماں تھی۔

اب سالف نذر کی جائیداد کا ایک اور وارث آچکا تھا تو پھر یدان کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی تھی؟ وہ اب اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی اور اگر ایسا ممکن نہ ہوسکا تو وہ اسے کم ازکم اس سب کے لیے نااہل ہی ثابت کر دینا چاہتی تھی جو کہ فی الحال ممکن نہیں نظر آرہا تھا۔ وہ عمر کے مدارج طے کرنے کے ساتھ اپنی ذہانت کا لوہا منوانے لگا تھا۔

وہ کم عمری میں ہی باپ سے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ وہ ان سے بدگمان تھا۔ ظاہر ہے اس نے اپنی ماں کی ناقدری ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ نصرہ ہر شے کی مالک ومختار بن بیٹھی تھی اور لبنیٰ روگ لگا کر دنیا سے چلی گئی تھیں۔

نصرہ کے لیے اگر اس کی آنکھوں میں سرد جامد تاثرات ہوتے تھے۔ تو سالف کے لیے نفرت کی چنگاریاں جلتی تھیں۔ وہ باپ کی آواز پر نہ ہی رکتا تھا نہ جواب دیتا تھا۔ نصرہ دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ اسے تو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہ تھی بیٹا خود ہی اپنی راہ میں کانٹے بچھا رہا تھا۔ وہ اس کی طرف سے سالف کے دل میں نفرت بھرتی تھی۔

"بیمین سے تو اسے پتا نہیں کیا پرخاش ہے۔ کبھی اسے تھپڑ مارتا ہے، کبھی کان مروڑتا ہے میرے بچے سے وہ پتا نہیں کس بات کا بدلہ لے رہا ہے۔ وہ تو کبھی سچ بھی نہیں بولتا، ظاہر ہے جنم دینے والی کا بھی اس پر اثر ہے۔ آپ کی طرح نیک خصلت بنتا اگر مرحومہ ماں جاتے جاتے بچے کا دل باپ کی طرف سے میلا نہ کرتی۔ خیر اللہ مغفرت فرمائے اس کی۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی۔ سالف بلا تحقیق اسے بلا کر باز پرس کرتے۔ وہ کبھی ڈرتا نہیں تھا۔ سچ کہتا تھا۔

"میں نے اسے نہیں مارا بلکہ یہ مجھے اور وجاہا کو مارتی پیٹتی ہیں۔"

وہ فوراً چہرے پر حیرانی سجالتی تھیں۔

"اف توبہ اتنا جھوٹ۔ سالف رہنے دیں یہ پوچھ گچھ، گھر کا سکون غارت ہو، مجھے نہیں پسند۔"

وہ نیک بی بی بن جاتی تھی۔

"یدان! اب میں تمہاری شکایت، نہ سنوں۔ پہلے تم تضریم کو تنگ کرتے تھے، اب بھائی کے دشمن بن گئے ہو۔ اگر تمہاری پھر کوئی شکایت ملی تو بورڈنگ میں بھیج دوں گا۔"

وہ اس دھمکی سے کیا ہی ڈرتا، یہ گھر اس کے لیے ماں کے بغیر ایک کھنڈر بن گیا تھا۔ آسیب زدہ کھنڈر۔ جہاں سے وہ چلے جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شام ڈھلنے کے قریب تھی۔ خنک ہوائیں بھلی لگ رہی تھیں۔ آسمان پر تیرتے بادل بھی اس فسوں خیز شام کو مزید دلکش بنا رہے تھے مگر وہ اس سب سے قطعی بے نیاز تھا۔ اسے تو فقط ماضی کے آسیب زدہ کھنڈر میں بھٹکنے کی عادت تھی۔ وہ گزرے وقت سے کبھی بھی چھڑا ہی نہ سکا۔ آٹھ سال امریکہ میں گزار کر بھی وہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

"تم کہاں تھے؟"
وہ جونہی گھر میں داخل ہوا۔ سارہ شمیر اس کی منتظر تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔
"السلام علیکم! آپ کب آئیں آنے سے پہلے مجھے انفارم کیوں نہیں کیا؟ میں آپ کو ائرپورٹ لینے آتا اور پاپا کہاں ہیں؟"
اس نے اپنے چہرے پر زبردستی کی بشاشت سجاتے ہوئے تابڑتوڑ سوالات کیے تھے۔
"تمہارے پاپا آرام کر رہے ہیں۔ ہمیں آنا تو تھا بس تمہیں سرپرائز دینے کے چکر میں انفارم نہیں کیا تھا۔ تم بتاؤ پریشان لگ رہے ہو۔"
وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اسے توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔
"پریشان نہیں ہوں بس تھک گیا ہوں۔"
اس نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ جو اپنے اصل سے بھاگ رہا تھا اپنے رشتوں سے قطع تعلق کر بیٹھا تھا اور اب دل ان ہی لوگوں کی جانب ہمک رہا تھا۔
"تمہیں ایک بار اپنے باپ سالف نذر سے مل لینا چاہیے۔ اس شہر میں تمہارے اپنے ہیں۔ تمہیں ان سے رابطہ کرنا چاہیے۔" وہ رسان سے کہہ رہی تھیں۔ اس نے سر جھٹکا۔
"چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں، کب تک رکنے کا ارادہ ہے؟"
وہ اب تسلی سے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر قبل کی ساری کلفت ہوا ... کر کہیں اڑ گئی۔ ان کی بے لوث پیاری شخصیت ... موجودگی ... وہ ہمیشہ ہی بہتر محسوس کرتا ... کبھی کبھی اپنوں سے ... غیر ہو جاتے ہیں۔ یہ ... کسی بچھڑے ... ہوئے انسان کا نعم البدل بن جاتے ہیں۔ سارہ شمیر اور شمیر حیات بھی وہ ہی دو نفوس تھے۔ انہوں نے اسے سہارا دیا تھا۔ سنبھالا تھا۔ ورنہ یا تو وہ مر گیا ہوتا یا در بدر بھٹک رہا ہوتا۔

☆☆☆

"تو تم اس کے ساتھ آئی تھیں۔"
تضریم کا یہ سوال اسے ناگوار گزر رہا تھا اور وہ بھی اسے زچ کرنے کے لیے بار بار پوچھ رہی تھی۔
"ہاں بھئی، اب کیا لکھ کر دوں۔"
وہ تنگ کر بولی تھی۔
"حیرت ہے، اس دن مجھے لیکچر دیے جا رہے تھے۔ بھئی وہ تو غیر بندہ ہے، کیا معلوم شکل ہی تمہارے بھائی سے ملتی ہو اور حقیقت میں تمہارا بھائی نہ ہو تم پھر بھی اس کے ساتھ آگئیں جبکہ اس کی والدہ ایک ٹی وی آرٹسٹ ہیں۔ بھئی وہ خاتون پاکستان میں نہیں ہالی ووڈ میں کام کرتی رہی ... ہیں۔ ایسی خاتون کے بیٹے کے ساتھ تم اکیلی یونی سے یہاں تک آگئیں۔"
وہ گلزار کی موجودگی میں مزید اسے چڑا رہی تھی۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ نگہت آنٹی نے اسے گھور کر دیکھا۔
"اگر وہ اپنی اصل پہچان چھپا رہا تھا تو مجھ سے کیوں جھوٹ نہیں کہا؟"
تضریم انہیں ساری کہانی سنا چکی تھی۔
"پتا نہیں۔ میں تو خیر سوتیلی ہوں۔ وہ تو سگوں کو نہیں پہچانتا۔" تضریم انگارے چبا رہی تھی۔
"اچھا اب گھر چلو۔"
وہ اسے یدان سے ہوئی ساری باتیں بتانا چاہتی تھی۔ اگرچہ وہ یدان سے اب بھی ناراض تھی۔ مگر وہ بھائی تھا اس کا، فطری طور پر وہ اس کے لیے دل میں نرمی رکھتی تھی۔ اور پھر کسی کے سامنے اس کی برائی یا خامی بیان کرنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ مگر وہ اطمینان سے بیٹھی ...
"میں یہیں ... تم جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ۔"
وجاہا نے گھور کر اسے دیکھا۔ پھر چہرے پر مسکینیت طاری کر لی۔
"پلیز چلو ناں ورنہ تمہارے حصے کا عتاب مجھے برداشت کرنا پڑے گا۔"
وہ لجاجت سے بولی۔
"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ اور

تم اب ڈرنا چھوڑ دو۔ کیوں آنٹی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟"

وہ ان کی تائید چاہ رہی تھی۔

"ہاں بھئی تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب ذرا اسے بھی سمجھاؤ کب تک اس طرح دنیا والوں کے رویوں سے ڈرتا رہے گا۔ اسے بھی کچھ عقل کا درس دو۔"

وہ گلزار کا کہہ رہی تھیں۔

ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں وہ ایک پیر سے معذور ہو چکا تھا۔ اور بس اب اپنی زندگی کو بوجھ ہی سمجھنے لگا تھا۔

"ڈونٹ وری آنٹی! اس کا بھی علاج ہو جائے گا۔ بس ذرا بھگو بھگو کے جوتے مارنے کی دیر ہے۔ اس بات پر شکر ادا نہیں کرتا یہ کہ اللہ نے زندگی دی ہے۔ اسے بے مقصد گزارنے کے بجائے مزید بہتر کرنے کی کوشش کرے۔ نہیں انہیں تو دھرتی کا بوجھ بننے کا شوق ہے۔"

وہ حسب توفیق واقعی اس کے دماغ پر لگے جالے جھاڑنے لگی تھی۔

"اب بس بھی کردو۔ دوست نہیں دشمن ہو تم۔ جب سے آئی ہو، مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اب اگر تم شرمندہ ہو ہی گئے ہو تو کل سے نارمل روٹین کی طرف آؤ۔ اور ہاں اپنی پیاری منگیتر پر غصہ مت اتارو اپنی بے بسی کا۔ کائنات سے مل کر آرہی ہوں ادھر بھی خاصی شکایتیں ہیں۔ معافی مانگ کر دور کر دو وہ شکایتیں۔"

اس نے نگہت آنٹی کی ممنون نگاہوں کی طرف نہیں دیکھا۔ یہی دوست تھے جو گلزار کو سنبھال رہے تھے۔ تعظیم ہی اسے اس کے بنائے خول سے نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ وہ بہت بولتی تھی کبھی کبھی بے جا بھی۔ مگر وہ ہی تھی جس نے گلزار کو برا نہ لگ جائے کا خیال کیے بغیر اسے مایوسی کے اندھیروں سے نکالا تھا۔ وہ کم از کم جاب پر تو جانے لگا تھا اور اب وہ اسے مزید اکسا کر بہتری کی جانب راغب کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے کرلوں گا اس سے بات۔ مگر اب یہ رشتہ۔"

وہ آگے کیا کہنے والا تھا۔ تینوں خواتین کو علم تھا۔ مگر اس کی بات تعظیم نے ہی قطع کی۔

"یہ رشتہ تم دونوں کی مرضی سے طے ہوا تھا تو تم تنہا کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے بلکہ کائنات کی رضا تم سے زیادہ مقدم ہے۔"

وہ ہرگز اس سے متفق نہیں تھا۔

"وہ ابھی جذباتی ہو رہی ہے۔ اسے خوابوں خیالوں سے باہر نکل کر زندگی کے فیصلے کرنے چاہئیں۔ میں اسے اس اندھے کنوئیں میں چھلانگ نہیں لگانے دوں گا۔"

وہ خود ترسی کا شکار تھا۔

"بڑوں کے مشورے پر چلو۔ دوسرے کیا چاہتے ہیں یہ بھی سوچو۔ خود ہی نہ باپ بنو۔"

وہ کہہ کر زبان دانتوں تلے دبا گئی۔ نگہت آنٹی کی طرف دیکھا۔ شکر ان کے موبائل پر کال آنے لگی تھی۔

"تم بھی ناں کیسے بول لیتی ہو ایسے جملے؟"

وجاہا نے اسے گھر کا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

آنٹی کال پر مصروف ہوئیں تو وہ دونوں بھی اٹھ گئیں۔ اسے شاید وجاہا پر ہی رحم آگیا تھا۔

"تھینک یو۔" گلزار ممنون تھا۔

"تم بھی بات مانو، ہماری تاکہ ہمیں بھی موقع ملے تھینک یو کہنے کا۔"

اس نے جاتے ہوئے بھی جتایا۔ وہ مسکرا دیا۔ نگہت آنٹی کو خدا حافظ کہہ کر وہ دونوں گاڑی میں آبیٹھیں۔

"یہ کون سا طریقہ تھا مجھے یونی میں چھوڑ کر تم یہاں آگئیں بلکہ پہلے کائنات سے ملنے گئیں۔ یعنی شہر کی خاک چھان رہی تھیں۔ میری فکر ہی نہیں تھی تمہیں۔"

وہ حد درجہ زود رنج ہو رہی تھی۔
"تمہاری فکر کرنے کے لیے ہے تو یدان شمیر۔سر یدان شمیر جو تمہیں یہاں پہنچا کر فرار ہو گئے۔"
اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔
"وہ بات کرنے آئے تھے۔کہہ رہے تھے کہ۔"
اس نے بات کاٹ دی۔
"کہ بھائی ہے تمہارا۔تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"
وہ حیران ہوئی تھی۔
"تم نے کیسے اندازہ لگایا؟"
"آج تم غصے میں نہیں،اس سے ناراض نہیں اور نہ ہی اداس ہو۔ظاہر ہے یہی بات ہو سکتی ہے۔"
وہ گاڑی کو ریورس کر کے سڑک پر لے آئی تھی۔
"تضریم! بھائی اب تک وہیں رکے ہیں۔ان کے دل میں میرے لیے دس سال بعد بھی ناراضی ہے۔"
اس نے اونہہ کہہ کر سر جھٹکا۔
"یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔ظاہر ہے وہ تم سے ناراض ہے۔ہم سے نفرت کرتا ہے۔تب ہی تو اپنی شناخت بلکہ ولدیت ہی بدل لی ہے۔خیر اچھی بات یہ ہے کہ تمہیں تمہارا بھائی مل گیا۔اور میں یہی چاہتی تھی۔اسی لیے بار بار اس کے پاس گئی۔اس سے مدد مانگی۔مجھے یقین تھا وہ یدان سالف ہی ہے۔دس سال میں وہ ظاہری طور پر تو پہلے سے زیادہ ہینڈسم ہو گیا ہے مگر ہے اب بھی کڑوا کریلا وہ بھی نیم چڑھا۔"
اس نے وجاہا کو چڑایا۔
"تم بھی تو نہیں بدلیں۔بھائی کے خلاف ہی بات کرتی ہو ہمیشہ۔حالانکہ انہیں تمہاری بھی فکر تھی۔اور اب وہ بھی ناراضی ختم کر چکے ہیں۔"
اس نے منہ بنایا۔
"تمہارا بھائی اور میری فکر کرے گا۔ہو ہی نہ جائے ایسا۔وہ مصائب سے گھبرا کر بھاگ جانے والا انسان ہے۔اسے بس اپنی فکر ہے اور کسی کی نہیں۔"
تضریم سخت برگشتہ تھی اس سے۔وجاہا نے اسے گھور کر دیکھا۔
"وہ تیمور لنگ کے معاملے میں ہماری مدد کرے گا؟"
چند ساعت کی خاموشی کے بعد اس نے مطلب کی بات پوچھی تھی۔
"میری اس سلسلے میں بات نہیں ہوئی۔اور مجھ سے امید بھی مت رکھنا۔"
اس نے ہری جھنڈی دکھائی۔
"تمہیں دکھ نہیں ہوگا اگر تیمور تمہارے بجائے کسی اور سے شادی کر لے؟"
وہ وجاہا کے دل کا حال جاننا چاہتی تھی۔جس کے چہرے نے بس ایک بار ہی رنگ بدلا پھر وہ مسکرا دی۔
"کسی اور سے کیوں تم سے ہو رہی ہے شادی اور میں بہت خوش ہوں۔تیمور بھائی اچھے انسان ہیں۔"
اس نے بے نیازی کی ڈھال لیے اس کی جانچ پڑتال کرتی نگاہوں کے وار سے خود کو بچایا۔
"وہ اچھا انسان تمہیں مبارک۔"
تضریم نے دانت پیسے۔
"بکواس مت کرو۔اور ویسے بھی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔خود کو ذہنی طور پر اس نئے رشتے کے لیے آمادہ کرو۔اور ہاں یہ یقین رکھو کہ مجھے اس بات سے قطعی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"
وہ پراعتماد تھی۔تضریم کو بھی اس پر ایک سو دس فیصد یقین تھا مگر وہ کیا کرتی کہ وہ خود خوش نہیں تھی۔
"تمہیں چاہے فرق نہ پڑے لیکن میں خوش نہیں ہوں۔اور میں اپنی مرضی کے خلاف اس لیے

بھی کچھ نہیں ہونے دوں گی کیوں کہ میں نصرہ احمر کی بیٹی ہوں۔"

اس کے ارادے غیر متزلزل تھے۔ وہ کیا سوچ رہی تھی وجاہا نہیں جانتی تھی لیکن یہ جانتی تھی کہ وہ ضرور کوئی نیا شوشہ چھوڑے گی۔

☆☆☆

سبک خرام ہوائیں۔ صاف آسمان، ستاروں کی جگمگاہٹ آخری تاریخ کے چاند کی چمک اور دل کی بے کلی۔ وہ لان میں نکل آئی تھی۔ کہنا آسان تھا کہ اسے فرق نہیں پڑتا مگر دل کو اس مقام تک لانے کے لیے وہ اپنے دل کی سن ہی کہاں رہی تھی۔ اپنی نفی کرنا سہل نہیں ہوتا۔ اپنی ذات کو نظر انداز کرنا اور مطمئن نظر آنا دشوار کار سہی مگر وہ خود کو حالات سے نبرد آزما کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ خود کو سمجھانا تو پھر آسان تھا مگر تضریم کو سمجھانا مشکل۔

تیمور اچھا انسان تھا۔ بہت پرانی بات نہیں تھی بس ذرا کچھ سال پہلے جب ایک رات وہ تنہا رہ گئی تھی۔ تب وہ آیا تھا۔

"میں یدان کو ڈھونڈ کر سمجھاؤں گا وہ غلط کر رہا ہے۔ اسے گھر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ تم فکر مت کرو۔ میں انکل سے بھی بات کروں گا۔ وہ یدان سے ناراضی ختم کر دیں گے۔"

وہ تضریم کے بلانے پر آیا تھا۔ وہ تضریم اور یدان سے بڑا تھا اور زیادہ سمجھ دار بھی۔ اس بارہ سال کی بچی کو یقین آنے لگا تھا۔ وہ اس کے بھائی کو منا لے گا۔

پھر یہ ممکن تو نہ ہوا مگر تیمور اکثر آنے لگا۔ وہ اسے سمجھاتا۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔ جب بھی آتا بہت سی چاکلیٹس اس کے پاس ہوتی تھیں۔ اس کی سالگرہ پر کسی بھی کامیابی پر تحائف بھی دیتا۔

وہ تضریم کے بعد دوسرا انسان تھا جس نے اسے سنبھالا۔ اس سے دوستی کی۔ اور پھر وہ تضریم کی طرح اس کی عادی ہوتی چلی گئی۔

پہلے بھی نصرہ نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا وہ وجاہا سے آٹھ سال بڑا تھا مگر جوں جوں وجاہا عمر کے ادوار طے کرتی گئی۔ نصرہ ان دونوں کی دوستی اور تیمور کے وجاہا کے لیے متفکر ہونے پر معترض ہونے لگیں۔ وہ میٹرک میں تھی جب نصرہ نے اسے بلا کر تیمور سے بات کرنے سے منع کیا۔

"تم اب بچی نہیں رہیں۔ خبردار جو تیمور سے کوئی تحفہ لیا۔ یا اس سے بیٹھ کر بات بھی کی۔"

اس نے ان کی ہدایت گرہ سے باندھ لی تھی۔ مگر تیمور کو نصرہ کیسے روکتیں۔ وہ ہر دوسرے دن چلا آتا تھا۔

"پھوپو! آپ نے وجاہا کو کن کاموں سے لگا رکھا ہے۔ اس کے امتحان ہونے والے ہیں۔"

وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ یہ خبر تضریم نے اس کے گوش گزار کی تھی۔

"کیا ہوا اگر وہ کام کرلے گی۔ میں نے تو کبھی تضریم کو خالی نہیں بیٹھنے دیا۔ ماشاء اللہ امور خانہ داری میں ماہر ہے۔"

اور بات تو سچ تھی مگر تضریم کے چہرے کے زاویے بگڑتے رہے۔

"مجھے تو کام سیکھنا ہی تھا۔ ظاہر ہے متوسط طبقے سے تعلق ہے میری والدہ کا اور یہ سب میرا نہیں وجاہا سالف کا ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے ابھی سے یہ کام سیکھنے کی؟"

تضریم ماں کو غصہ نہ دلائے، ایسا بھلا کب ہوا تھا؟

"اگر میں نے اسے کچھ نہ سکھایا تو لوگ یہی کہیں گے کہ میں سوتیلی ہوں۔ بے چاری بچی کی ماں ہوتی تو پتا نہیں کیا کچھ سکھا دیتی۔"

وہ بھتیجے کے سامنے غصہ ضبط کیے بولی تھیں۔ وجاہا چائے کے ساتھ دیگر لوازمات ٹرالی میں رکھے چلی آئی۔ اتنی کم عمری میں وہ اس کے سلیقے کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

"پھوپو! آپ اس کی فکر مت کریں۔ اگلے گھر والے اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس کی پڑھائی کی فکر

کریں اور تم بھی دل لگا کر پڑھو۔ یا کتھ کی طرح اب کوئی سپلی نہیں آنی چاہیے۔ تضریم تمہیں پڑھائے گی بھی اور تمہاری کارکردگی کے متعلق مجھے رپورٹ بھی دے گی۔"

اس کی ہدایات کے دوران نصرہ پہلو پر پہلو بدلتی رہیں۔ تضریم لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ صرف تیمور کے سامنے ہی کچھ نہیں کہتی تھیں۔ باقی کسی کی انہیں پروا نہ تھی۔ یہ لاڈلا بھتیجا انہیں بہت عزیز تھا۔ اسے وہ اپنے داماد کے روپ میں دیکھتی تھیں۔

تضریم نے وجاہا کو اشارہ کیا تھا۔

"سن لو اور اب چل کر کتابوں کی شکل دیکھو۔"

اور وہ کہہ رہا تھا۔

"پھوپو! اگر یہ پڑھے گی نہیں تو بھی لوگ آپ کو ہی الزام دیں گے۔ اسے کم از کم گریجویشن تو کرنے دیں۔ پھر گھرداری بھی سکھا دیجیے گا۔"

وہ تھا جسے اس کی پڑھائی کی فکر تھی۔ سالف نذر تو یدان کی طرح اس سے بھی کوئی امید نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ساری امیدوں کا مرکز یمین تھا۔ ان کا چھوٹا بیٹا۔ جسے وجاہا ہاتھ بھی لگا لیتی تو نصرہ گھر سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ تضریم بھی اسی ضد اور ماں کے یمین کے لیے عدم تحفظ کے سبب یمین سے دور ہوتی چلی گئی۔

وہ لان کا ایک چکر کاٹ کر پلٹنے لگی تھی۔ تب ہی اندھیرے میں کسی سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ سے کچھ گرا بھی تھا۔

وہ لمحوں میں پہچان گئی۔

"یمین!"

اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔ اس نے یمین کا بازو پکڑ لیا۔

"کہاں جا رہے ہو اس وقت۔؟ اور یہ کیا ہے تمہارے پاس؟"

یمین نیچے گرا ہوا چھوٹا سا بیگ اٹھانے لگا۔

"آپی! چھوڑو میرا ہاتھ ورنہ میں شور مچا دوں گا۔ اور کہوں گا کہ تم ہی یہ سب چرا کر بھاگ رہی تھیں اس کے بعد۔"

اس نے یمین کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ بیگ لے کر بھاگتا چلا گیا۔ اور وہ وہیں سنگی مجسمے کی طرح ایستادہ رہ گئی۔ بہت پرانی یاد کے بچھو نے ڈنک مارا تھا۔

"بھائی! کہاں جا رہے ہیں آپ؟ اور یہ کیا ہے؟"

وہ یدان سے پوچھ رہی تھی۔ وہ لڑکا جو ابھی نوعمری کے دور سے نہیں نکلا تھا۔ دراز قد اور سیاہ روشن آنکھوں والا اس کا بھائی۔ جس کے لہجے میں وقت سے پہلے بردباری تھی اور تلخی بھی۔

"اپنا حق تو لے نہیں سکتا مگر کالج کی فیس ان سے نکلوانے کی ناکام کوشش کے بعد مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔"

اس کی سرخ آنکھیں شاید نم بھی تھیں۔ وہ رونے لگی تھی۔

"اگر انہیں پتا چل گیا تو؟"

وہ ڈر گئی تھی۔ تضریم سامنے کھڑی تھی۔ یدان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"چل جائے پتا۔ یہ میرا حق ہے اور میں کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالنے والوں میں سے نہیں۔"

وہ صاف تضریم کو سنا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔

"مما! سے میں بات کروں گی تم اس طرح۔"

"شٹ اپ۔"

اس نے دھاڑ کر اس کی بات قطع کر دی۔

"تمہاری مما ہی تو مجھے اس حد تک آنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ کل لاسٹ ڈیٹ ہے۔ میری فیس جمع نہیں ہوئی تو۔"

وہ لب بھینچ گیا تھا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"کاش پاپا گھر آ جاتے۔ مگر وہ بھی کل آئیں گے۔ بھائی بہت پریشان ہیں اور نصرہ آنی نے پیسے دینے سے انکار کر دیا ہے۔ پاپا بھی تو بھائی سے ناراض ہیں۔"

کچھ دن قبل یمین سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔سوئے اتفاق اسی وقت یدان بھی گھر آیا تھا۔یمین کو گرتا دیکھ کر وہ بھی اس کی طرف لپکا۔اور اسی وقت نصرہ اور سالف بھی باہر سے آئے تھے۔یمین کے رونے کی آواز سنتے ہی نصرہ بھاگی تھیں۔اور یدان کو اسے اٹھاتا دیکھ کر چیخنے لگی تھیں۔

"میرے بچے کو تم نے گرایا ہے۔تم نے مارا ہے۔"

وہ ہذیانی انداز میں کف اڑا رہی تھیں۔یمین کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔سالف اسے لے کر باہر کی طرف بھاگے۔نصرہ بھی پیچھے لپکی تھیں۔جبکہ وہ اپنی جگہ پتھر بن گیا تھا۔

قریبی کلینک سے یمین کی بینڈیج کروا کر واپس آتے ہی سالف نے یدان سے باز پرس کرنے کے بجائے۔اسے مارنا شروع کر دیا تھا۔نصرہ کا باوثوق انداز اوران کے آنسو دیکھ کر وہ ان کی بات پر ایمان لے آئے تھے۔پھر انہوں نے خود بھی یدان کو کبھی یمین کے قریب،یا محبت جتاتے نہیں دیکھا تھا۔نصرہ نے بھی گھر آ کر یدان کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

وہ باپ سے اس جانب داری کی توقع ہی رکھتا تھا اس کے باوجود اسے دکھ ہوا تھا۔اور یہ دکھ اس وقت حد سے سوا ہو گیا جب سزا کے طور پر نصرہ نے اس کے کالج کی داخلہ فیس جمع کروانے سے انکار کر دیا۔اور سالف سے غلط بیانی کرتے ہوئے کہہ دیا کہ وہ دو بار پہلے بھی کالج میں داخلے کے لیے فیس کے پیسے ان سے لے چکا ہے۔وہ باپ کی سنگ دلی سے نالاں و بدگمان تھا۔اس نے مجبور ہو کر گھر میں چوری کی تھی۔مگر یمین کی کیا مجبوری تھی؟ کتنی ہی دیر وہ بے حس و حرکت وہاں کھڑی رہی پھر تھک ہار کر اپنے اور تنزیم کے مشترکہ کمرے میں آ گئی۔

"تم اب تک جاگ رہی ہو؟"

تنزیم صوفے پر پاؤں سمیٹے بیٹھی کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھی یا پھر لکھ چکی تھی اور اب اپنے لکھے لفظوں کو سجا رہی تھی۔

"بس سونے لگی تھی۔تم بھی تو ان میں پرانی حویلی کی چڑیل بنی گھوم رہی تھیں۔"

تنزیم سے سنجیدگی کی امید بھی عبث تھی۔اس نے جھرجھری لی۔

"کوئی نہیں،میں تو بس یونہی۔"

وہ الجھی سی گئی۔

"یمین کو دیکھا ہے تم نے۔وہ تو روز رات کو باہر جاتا ہے۔روکنے کی کوشش کرو تو بدتمیزی پر آتا ہے۔مما بھی عاجز آ گئی ہیں مگر سالف انکل کے سامنے پردے ڈالتی ہیں۔"

وہ بیڈ کی طرف بڑھ رہی تھی،تنزیم کی بات سن کر ٹھٹک کر رکی۔

"تم نے بھی دیکھا ہے؟ تو روکا کیوں نہیں؟"

اسے تعجب ہوا۔تنزیم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

"تم بھی ناں اگر تمہارا وہ بھائی ہوتا تو اسے بہت خوشی ہوتی۔اور میں بھی کیوں روکتی؟ یدان رکا تھا تمہارے روکنے سے؟ ویسے محترمہ! میں بہت بار کوشش کر چکی ہوں وہ سنتا ہی نہیں۔ابھی بس کھڑکی سے ایک جھلک دیکھی تھی۔"

اس نے گہری سانس لی۔

"بھائی مجبور ہو گئے تھے اور اچھا ہی ہوا جو وہ چلے گئے۔یہاں رہتے تو شاید کچھ نہ بن پاتے۔آج ایٹ لیسٹ ان کے پاس ایم بی اے کی ڈگری تو ہے۔اور یہ یمین یہ گھر چھوڑ کر نہیں گیا۔وہ کچھ چرا کر بھاگا ہے۔"

وہ اب جتنا سوچ رہی تھی اس وقت کے حالات کو دکھ ہی ہو رہا تھا یدان کا اقدام درست لگ رہا تھا مگر یمین کی طرف سے بھی متفکر تھی۔

"کیا؟" وہ پہلے چونکی پھر سر جھٹکا۔"تو یہ کون سی غیر معمولی بات ہے۔تمہیں پتا تو ہے وہ کئی بار ہمارے پیسے بھی چوری کر چکا ہے۔"

دجانا نے ہاتھ مسلے۔

"نہیں، اس کے پاس ایک بیگ تھا۔"
وہ چاہتی تھی اس کا اندازہ غلط ہو مگر تضریم نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔
"مما کی جیولری۔ انہوں نے نکاح کی تقریب کے لیے بینک لاکر سے نکلوائی تھی۔ یمین کو ساتھ ہی بینک لے کر گئی تھیں آج۔ اس نے آج ہی ہاتھ دکھا دیا۔"
وہ سونے کا ارادہ موقوف کر کے صوفے پر تضریم کے قریب آ بیٹھی۔
"تضریم! تم اسے روک لیتیں۔ وہ تمہاری سن لیتا۔ پتا نہیں کہاں گیا ہوگا؟ اف مائی گاڈ! تم نے کیوں کچھ نہیں کیا؟"
وہ اب اسے جھنجھوڑ کر پوچھ رہی تھی۔
"میں کیسے روکتی؟ جب تک لان میں پہنچتی اسے چلے ہی جانا تھا اور تم نے کیوں کچھ نہیں کیا؟"
وہ ہی سوال تضریم کی نوک زبان پر آیا تو وہ ٹھس سی بیٹھی رہ گئی۔ تضریم کی نگاہیں اس کے چہرے سے پلٹی نہیں۔ انہیں جواب کی طلب تھی۔
"وہ میری کہاں سنتا؟ دھمکی دی تھی وہ بھی بہت رکیک۔"
وجاہا یوں شرمندہ ہوئی جیسے اس کا ہی قصور ہو اور قصور تو تھا۔ ایسے انسان خود ہی تو دوسروں کو خود پر حاوی ہونے کا موقع دیتا ہے۔ منہ توڑ جواب نہ دے کر۔ غلط بات سن کر ڈر جانے والے، چپ رہ جانے والے جتنے بھی مخلص ہوں ان کی قدر کرتا ہی کون ہے۔ اخلاص، رواداری، بے لوث محبت تو پچھلے زمانوں کی قصے کہانیوں میں رہ گئی تھیں۔
"تم نے اس کے منہ پر تھپڑ کیوں نہیں مارا۔ بڑی ہو تم اس کا منہ توڑ دیتیں اس کا۔ رشتے، تعلق، رواداری ایک ہی فریق کیوں نبھائے؟ یہ تو دو طرفہ ذمہ داری ہے۔ وہ بھائی ہے تم پریشان ہو اس کے لیے مگر کیا بھائی کو اس کی فکر ہے؟ نہیں۔ تم کیوں ڈر گئیں۔ انسان حق پر ہو تو اسے ڈرنا نہیں چاہیے ورنہ بزدل شیر ہو جاتے ہیں۔ ظالم بھیڑیے بن جاتے ہیں۔ اور شعور کا تقاضا ہے، کسی ظالم کے ہاتھ مضبوط نہ کیے جائیں۔ برائی کی بیخ کنی اپنے گھر سے شروع کی جائے۔"
وہ واعظ اور نصیحتوں سے قائل ہو بھی جاتی اگر نصیحت کرنے والی کے قول اور فعل میں تضاد نہ ہوتا۔
"تم نے بھی کب اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے؟ مما نے مجھے اس کے قریب نہیں آنے دیا مگر تمہیں تو نہیں روکا۔ وہ نہیں سنتا پھر بھی اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا۔"
وجاہا اکتائی ہوئی سی تھی۔
"میری جان! مکافات عمل کا نام سنا ہے تم نے؟ بس وہ ہی تھا میری راہ میں حائل۔ شاید مسٹر اینڈ مسز سالف نذر بھی ماضی کی غلطیوں بلکہ گناہوں کی فکر کرنے لگ جائیں۔"
وجاہا کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔
"تم ہمارے بھائی کی غلطیوں کو مکافات عمل کا نام نہیں دے سکتیں۔۔۔ وہ ابھی بچہ ہے۔ کسی کے کیے کی اسے سزا کیوں ملے؟ میں ابھی انہیں جا کر یمین کا بتاتی ہوں۔"
وہ جانے لگی تھی۔ تضریم نے اس کا ہاتھ پکڑا۔
"اب وہ یقین کریں گے تمہاری بات کا؟"
وہ مسکرا رہی تھی۔ وجاہا کو آگ لگانے والی استہزائیہ مسکراہٹ، جیسے کہہ رہی ہو کچھ دیر پہلے یہ بہادری کیوں نہ دکھائی؟
"تم بھی تو ہو۔ تم بتانا انہیں۔"
اس نے گڑبڑا کر کہا۔
"میرا کچھ بھی کہنے کا ارادہ نہیں۔ آرام سے مما کی جیولری ٹھکانے لگانے دو اسے پھر۔"
وہ مطمئن تھی۔ مگر وجاہا نہیں رکی۔ اس نے بھی وجاہا کی تقلید کی۔ سست قدم اس کی بے دلی کے غماز تھے۔ نصرہ اور سالف کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بے خبر سو رہے تھے۔
"چلو میرے ساتھ۔"
وجاہا نے تضریم کو کھینچا۔ وہ بھی ساتھ چلی آئی۔

"پاپا!"
وجاہا نے ڈرتے ڈرتے آواز دی۔
"مما!" نصرہ نے ماں کو ہلایا۔ مگر بے سود وہ لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ ان دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ انہونی کے احساس نے ان کے دل کی دھڑکنوں کو روک دیا۔ نیم تاریکی میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو تضریم نے کمرے کی بتی جلا دی۔
کمرہ روشنی سے نہا گیا۔ اور تب ہی وجاہا کی نگاہ نصرہ کے چہرے کے قریب رکھے رومال پر پڑی تھی۔ اس نے رومال اٹھا کر دیکھا۔
"تو مما پاپا کو سوتے میں کلوروفام سنگھا کر بے ہوش کیا گیا ہے۔"
وہ فوراً نتیجے پر پہنچ گئی۔
"دکھاؤ مجھے۔"
تضریم نے رومال اس کے ہاتھ سے لیا۔ اور چہرے کے قریب لے گئی۔ وہ اسے سونگھنا چاہتی تھی۔ وجاہا نے اس سے رومال چھینا تھا۔
"پاگل ہو گئی ہو؟ اس نے کلوروفام سونگھایا ہے۔"
وجاہا خوف سے کانپ رہی تھی۔
"وہ مجرمانہ ذہنیت کا حامل ہے۔ دیکھو، یہ ہوتا ہے مکافاتِ عمل۔ کل کو کوئی ذلت و رسوائی میری قسمت میں بھی رقم ہوگی۔"
تضریم کو دکھ تھا مگر اس سے بھی بڑھ کر اپنی ماں کے اعمالوں کا خوف تھا۔ وجاہا نے ان کے چہروں پر پانی چھڑکا۔ کئی آوازیں دیں۔ ان کی نبض دیکھی۔ وہ بس گہری نیند میں تھے۔ تضریم نے پلٹ کر لاکر کی طرف دھیان دیا۔ کچھ فائلز اور کاغذات تھے باقی کچھ نہیں۔ وجاہا اس کا ہاتھ پکڑ کر جس طرح اسے لائی تھی ویسے ہی کمرے سے باہر لے آئی۔
"کیا کریں اب کچھ سوچو؟"
وہ متفکر تھی۔ پیسے تو وہ پہلے بھی چوری کرتا تھا مگر اب اس نے نصرہ اور تضریم کی ساری جیولری صاف کر دی تھی۔ نصرہ نے تضریم کے لیے بہت کچھ بنوا کر رکھا تھا۔ یہ کوئی معمولی چوری نہیں تھی۔
"ہمیں پولیس سے مدد لینی چاہیے۔"
تضریم کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا۔
"نہیں، پہلے ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔ ڈاکٹر سجاد پاپا کے دوست ہیں۔ وہ پاپا کی اور نصرہ آنی کی کنڈیشن بتائیں گے۔ کہیں کوئی نقصان ہی نہ پہنچ جائے انہیں۔"
وجاہا کی بات پر اس نے گھور کر دیکھا۔
"وہ ٹھیک ہیں، دھڑکن چل رہی ہے۔ میں پولیس کو کال کرتی ہوں۔"
تضریم کمرے کی طرف گئی تھی موبائل لینے۔ اس نے بھی پیروی کی۔
"تضریم! رکو میں بھائی کو کال کرتی ہوں۔ شاید وہ ان حالات میں ہماری مدد بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔"
وجاہا نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ تضریم سے اسے اختلاف کی امید تھی مگر وہ چپ رہی تو وجاہا کو بھی حوصلہ ہوا۔
دوسری طرف وہ گہری نیند میں تھا جب موبائل کی مخصوص دھن نے اس کی نیند میں رخنہ ڈالا تھا۔
اس نے موبائل اٹھایا۔ رات کے دو بجے وجاہا کال کر رہی تھی۔ وہ ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔
"ہاں وجاہا بولو سب خیریت ہے؟"
اس کی تشویش محسوس کر کے وجاہا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ تضریم کے اشارے پر اس نے اسپیکر کھول دیا۔
"بھائی! آپ گھر آ سکتے ہیں؟"
وہ لب بھینچ گیا تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
"کیا ہوا ہے؟ مجھے بتاؤ۔"
اس نے اس سوال کے جواب میں ساری تفصیل کہہ سنائی تھی۔ تضریم کے اعصاب تن گئے۔ اب وہ ضرور کہے گا۔ یہ ہوتا ہے مکافات

عمل۔مگر وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے اس کے دوستوں کے فون نمبرز اور ایڈریس ٹیکسٹ کرو۔"

اس نے مکینکی انداز میں سر ہلایا۔

"نمبر نصرہ آنی کے موبائل میں ہیں۔تضریم آپ کو اس کے دوستوں کے ایڈریس بتادے گی۔"

اس نے موبائل تھام کر کوئی دوسری بات یا سلام دعا کے تکلف کے بغیر ہی اسے ایڈریس بتادیے۔وجاہا،نصرہ کا موبائل بھی لے آئی تھی۔اس نے دھیان سے نمبر نوٹ کرنے کے ساتھ پھر ٹیکسٹ کرنے کی ہدایت دینے کے علاوہ انہیں تسلی دی تھی۔

"میں دیکھتا ہوں۔پریشان ہوکر اسے ڈھونڈنے کے لیے خود مت نکل کھڑی ہونا۔"

یہ ہدایت تضریم کے لیے تھی۔

"اتنی بھی پاگل نہیں ہوں۔"

وہ اس وقت بھی چپ نہیں رہی۔

"پتا ہے مجھے،بہت عقل مند ہو تم۔"

اس نے رابطہ منقطع کردیا۔وہ دونوں ساتھ بیٹھی۔درودِ پاک اور آیت کریمہ کا ورد کرنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اس نے بستر سے نکل کر جوتے پہنے اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔وہ ٹراوزرز ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔لباس تبدیل کرنے کا وقت نہیں تھا،وہ عجلت میں گھر سے نکلا تھا۔شمیر صاحب پانی پینے کے لیے اٹھے تھے۔گاڑی کی آواز سنی تو چونک گئے کھڑکی سے دیکھا پھر موبائل اٹھا کر اس کا نمبر ملایا۔اس نے پہلی ہی بیل پر کال ریسیو کی۔

"کہا ہے ناں،میں خود کال کروں گا۔"

وہ دوسری طرف کی سنے بغیر بولا تھا۔

"کہاں جارہے ہو اس وقت؟"

وہ رابطہ منقطع کرتا اس سے قبل شمیر حیات کی آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے آنکھیں زور سے بند کرکے کھولیں۔

"پاپا!ایک کام سے جانا پڑ رہا ہے۔"

وہ اسی قدر بول سکا۔

"ٹھیک ہے واپس آؤ پھر بات کرتے ہیں۔"

اس نے "او کے خداحافظ" کے الفاظ ادا کرکے رابطہ منقطع کردیا۔اور گاڑی تیز رفتاری سے منزل کی طرف بڑھادی۔کچھ ہی دیر بعد وہ پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔

ایس پی توقیر اعجاز کے پاس وہ ایک دوست کے توسط سے آیا تھا۔ادھیڑ عمر توقیر اعجاز نے اس کے مہیا کردہ یمین اور اس کے دوستوں کے موبائل نمبرز کے ذریعے اسے ٹریک کیا تھا۔وہ اپنے ایک دوست کے بنگلے پر موجود تھا۔

وہ ایک کاروباری شخصیت کا بنگلہ تھا مگر وہاں سے پہلے بھی مشکوک سرگرمیوں کی شکایات موصول ہوچکی تھیں۔توقیر اعجاز نے اس بار سخت اقدام اٹھانے کو بہتر سمجھا۔پولیس کی نفری فوری طور پر وہاں بھیجی گئی تھی۔یمین کے دوست کے بنگلے سے سولہ سال سے لے کر پچیس سال تک کے نوجوان لڑکوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔وہاں کھلے عام ڈرگ کا استعمال ہورہا تھا۔جوا کھیلا جارہا تھا۔دل بہلانے کا پورا انتظام تھا وہاں۔یمین کے دوست عنایت کے بھائی اور والد کی گرفتاری عمل میں لائی جاچکی تھی۔اس ساری کارروائی میں کئی گھنٹے لگے تھے۔اس نے وہیں ایک کپ چائے اور پانی پی کر روزے کی نیت کی تھی۔فجر کی نماز بھی قریبی مسجد میں پڑھی۔صبح تک وہ تھانے میں موجود رہا تھا۔اور جس وقت یمین اس کے سامنے آیا اسے ایک لمحہ نہیں لگا تھا اسے پہچاننے میں۔وہ اسی کا تو لڑکپن تھا۔

"یمین سالف کون ہے تم میں سے؟"

پولیس اہلکار کے استفسار پر ڈرا سہا یمین گھبرا گیا تھا۔اس نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ اٹھایا تھا۔

"گھر سے کیا کیا لے کر نکلے تھے۔"

کچھ دیر میں ہی وہ تفصیلات توقیر اعجاز کو بتا رہا تھا۔اس کے دوست عنایت کے والد باقاعدہ اس کی

عمر کے امیر گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کو ٹارگٹ بناتے تھے۔انہیں نشے کا عادی بنا کر ان سے بہت کچھ ہتھیانے کے بعد بھی انہیں بلیک میل کرتے تھے۔کچھ کو اغوا کر کے تاوان وصول کرتے تھے اور کچھ کو جرائم کی ایسی اندھی کھائی میں پھینکتے تھے جہاں سے وہ کبھی نہ نکل سکیں۔یمین بھی ان میں سے ایک تھا جسے بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ان کے پاس سینکڑوں لڑکے لڑکیوں کی ویڈیوز تھیں۔

"پلیز سر! مجھے معاف کر دیں۔مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔میں اب کبھی کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔"

وہ توقیر اعجاز سے منت کر رہا تھا۔

"یدان ثمیر! آپ بچے کو لے جا سکتے ہیں۔"

یدان اس نام پر یمین نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تھا۔اور دوسری جانب بھی ایک لمحے میں پہچان کے مراحل طے ہوئے تھے۔وہ ہو بہو سالف نذر کی جوانی کی تصویر تھا۔

"بھائی۔" یمین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"سر! آپ کا بہت شکریہ۔"

اس نے توقیر اعجاز سے اجازت لی اور یمین کو لیے وہاں سے نکل آیا تھا۔

اس کے بھینچے ہوئے جبڑے۔ماتھے کی ابھری رگ اور سرد نگاہیں یمین کو خوف زدہ کر رہی تھیں۔راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔اس نے گاڑی سالف نذر کے گھر کے سامنے روکی تھی۔

وہ گیٹ جہاں سے نکلتے ہوئے اس نے واپسی کا نہیں سوچا تھا۔اس نے دروازے پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔وہ اسے لانے کا تحریری پیغام بذریعہ وائس ایپ وجاہا کو ارسال کر چکا تھا۔اس نے گہری سانس لے کر اپنے اندر پھیلتے اضطراب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ہلکی ہلکی دھوپ بھی اس کے اندر تازگی کا احساس بیدار نہیں کر رہی تھی۔اندر کہیں بے چینی نے بہت گہرائی میں پنجے گاڑے تھے۔

"میں تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ آئندہ ایسا نہ ہو۔کیونکہ اندھیرے میں ہاتھ تھام کر سیدھی راہ پر لانے والا ہر بار نہیں ملتا۔شکر ادا کرو کہ تمہارے پیچھے پریشان ہونے والے موجود ہیں۔"

یمین اب ہونٹ [illegible]

اس نے تاسف بھری [illegible] پر ڈالی۔

"[illegible]

[illegible] اسے عرق ندامت میں ڈبو یا۔

"بھائی! آئی [illegible] ری۔" وہ نادم تھا۔

[illegible] اندر جا کر اپنے والدین سے بھی معذرت کر [illegible] نصیحت یاد رکھنا۔غلط راستے سے واپسی [illegible] آسان نہیں ہوتی۔اب اگر تمہیں موقع [illegible] پرانی ڈگر چھوڑ کر اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔اب اترو گاڑی سے، مجھے بھی اپنے گھر پہنچنا ہے۔"

یمین حیران ہوا تھا۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے؟" اس نے پوچھا

"نہیں۔"

یمین متذبذب سا گاڑی سے اتر گیا۔

اس نے گیٹ کھلتے دیکھ لیا تھا۔سالف نذر تیز قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔یدان ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور سالف نذر کی تشنہ نگاہوں کے سامنے سے گاڑی بھگا لے گیا تھا۔وہ تہی داماں سے کھڑے رہ گئے۔کھلے گیٹ سے یہ منظر نصرہ، تنزیم اور وجاہا نے دیکھا تھا۔نصرہ اور سالف کے بیدار ہوتے ہی تنزیم اور وجاہا نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔وہ رات بھر سے جاگتی رہی تھیں۔سحری بھی بامشکل کی۔ملازمین اندرون خانہ حالات سے بے خبر تھے۔نصرہ یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔انہیں یقین تھا، یہ کسی ملازم کا کام ہے۔وہ ان سے باز پرس بھی کرنا چاہتی تھیں مگر سالف نذر نے سختی سے منع کر دیا۔

"یہ دونوں میرے معصوم بچے پر الزام لگا رہی

ہیں۔"
انہیں تو سگی بیٹی پر بھی اعتبار نہ تھا۔
"اپنے لاکر کی حالت آپ دیکھ چکی ہیں۔ گھر کے سی سی ٹی وی کیمرے سے بھی آپ کو حقیقت کا علم ہوجائے گا اور پھر بھی یقین نہ آئے تو آپ یہ خبر دیکھ لیں اگر یدان ہماری مدد نہ کرتا تو یمین یا تو ان کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنا رہتا اور پھر وہ اسے معاشرے کا ناکارہ پرزہ بنا کر آپ کے حوالے کر دیتے۔ کئی لڑکے لڑکیوں کو وہ اغوا کر کے بھاری تاوان وصول کر چکے ہیں۔ ہم اپنی غفلت میں بہت بڑا نقصان اٹھانے والے تھے۔ وہ یمین کو اخلاقی طور پر تباہ کر رہے تھے۔ مالی نقصان سے بڑھ کر خسارہ تھا یہ۔"
تضریم جذباتی ہو رہی تھی۔
"پاپا! آئی ایم سوری۔ وجاہا آپی! آپ بھی مجھے معاف کردیں آپ نے مجھے جب بھی روکا، نصیحت کی، میں بدلحاظی سے پیش آیا۔ اگر یدان بھائی انہیں پولیس کے حوالے نہ کرتے تو میں کبھی ان کے چنگل سے نہیں نکل سکتا تھا۔"
نصرہ نے بے یقینی سے اس کا اقرار جرم سنا۔
"یدان مجھ سے ملے بغیر چلا گیا۔"
وہ آج پہلی بار اولاد سے غفلت برتنے پر پشیمان تھے۔
"وہ کہاں رہتا ہے مجھے بتاؤ میں خود اسے منا کر لاؤں گا۔ اس کا شکریہ ادا کروں گا۔"
سالف نذر بے چین ہو اٹھے تھے۔
"وہ یہاں آنا نہیں چاہتے۔"
یمین نے انہیں اطلاع دی تھی۔
"تم یہ سب کب سے کر رہے ہو؟"
نصرہ نے یمین کا بازو پکڑا۔ وہ ماں سے معافیاں مانگنے لگا۔ اچانک یدان اتنا اہم ہوگیا تھا۔ وہ کیسے برداشت کرلیتیں؟ انہیں یہ بات گوارا نہ تھی۔ ان کے بات بدلنے سے وقتی طور پر یہ ذکر ختم ہوا تھا مگر سالف نذر خود وجاہا اور تضریم کے کمرے میں چلے آئے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ بیٹی کے پاس خود چل کر آئے ہوں۔ وہ جو ہاتھ میں کاغذ لیے تضریم کی کاوش دیکھ رہی تھی۔
"تضریم یدان" بہت خوب صورتی سے یہ دو نام ایک ساتھ لکھے گئے تھے۔ وہ ٹھیک سے حیران بھی نہ ہو سکی۔ پاپا کے دستک دینے پر چونک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ دروازے کے فریم میں اس کے دراز قد، وجیہہ و جمیل پاپا ایستادہ تھے۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔
"پاپا! آپ آئے ناں۔"
وہ کاغذ تہہ کر کے گھبرائی ہوئی سی نظر آئی۔
"پتا نہیں آج کیا خطا سرزد ہوئی کہ پاپا نے اسے بلانے کے بجائے یہاں تک آنے کی زحمت کی؟ غالباً بھائی کو مدد کے لیے بلانا ناگوار گزرا ہے۔"
اس نے لمحوں میں امکانات پر غور و خوض کر کے نتیجہ نکالا۔
"بیٹھو بیٹا!"
وہ غش کھانے کو تھی۔ پاپا کا نرم ملائم لہجہ اس کے لیے کبھی نہیں تھا۔ یہ تو فقط یمین کا حق تھا۔ وہ صوفے پر براجمان ہو گئے تھے۔
"جی۔" وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔
"تم اپنے بھائی سے ملتی رہی ہو؟"
پاپا کے لہجے میں کیسی لپک تھی۔ آج انہیں اپنے بڑے خسارے کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ یہ دونوں بچے ان کا اپنا ہی خون تھے مگر لبنیٰ سے بیزاری کے اظہار میں انہوں نے ان سے بھی سوتیلی اولاد جیسا سلوک روا رکھا بلکہ سوتیلی اولاد کو بھی وہ شفقت و محبت سے مخاطب کرتے تھے کہ وہ ان کی محبت نصرہ کی بیٹی تھی جبکہ اپنی اولاد سے ہمیشہ ناامید رہے تھے۔
"جی پاپا!"
اس نے سر جھکا کر جواب دیا تھا۔ اصل میں اس کی آنکھوں کے فرش بھیگنے لگے تھے۔ لہجہ بھرایا سا تھا۔
"ناراض ہے وہ مجھ سے؟ ہاں ناراض ہی

ہوگا۔ میں نے باپ ہونے کا کوئی فرض جو ادا نہیں کیا۔ اس لیے وہ مجھے چھوڑ گیا اور تم۔ تمہیں بھی میں نے کبھی محبت و شفقت نہیں دی۔ آج ایک دم ہی مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس نہیں ہوا بلکہ بہت عرصے سے میں یہی سب سوچ رہا ہوں۔ یدان کو بہت ڈھونڈا بھی مگر مجھے اس کا پتا نشان نہیں ملا۔ وہ میری اولاد ہے۔ یہ سب اس کا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں اتنا سنگ دل بن گیا تھا۔ اپنے ہی پیاروں سے دور رہا۔"

وہ خاموشی سے اپنی سفید ہتھیلیوں کو دیکھتی آنسو بہاتی رہی۔ انہوں نے چند پل کے توقف کے بعد اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

"تم میری بہت صابر بیٹی ہو۔ اپنی ماں کی طرح ہو۔ پتا نہیں انسان کو اپنی غلطیوں کا ادراک بروقت کیوں نہیں ہوجاتا؟ اگر پہلے ہوجائے تو کم از کم تلافی تو ممکن ہوتی ہے۔ جب وقت کی قلت ہو تو ازالہ کرنا دشوار ہوتا ہے۔"

وہ اس کا سر تھپک رہے تھے۔

تضریم اپنی ہی دھن میں کمرے میں داخل ہوئی تھی لیکن پہلے ٹھٹک کر رکی پھر پلٹنے لگی۔

"تضریم! یہاں آؤ۔"

سالف نے اسے آواز دی تھی۔

"جی انکل!" وہ حیران پریشان سی چلی آئی۔

"بیٹھو۔"

وہ سامنے صوفے پر ٹک گئی۔

"تم دونوں میری بہت اچھی اور سمجھ دار بیٹیاں ہو۔ بس بیٹوں کے معاملے میں، میں اتنا خوش نصیب نہیں۔"

وہ مسکرائے تھے۔

"تم دونوں نے بروقت اور درست فیصلہ کرکے بڑے بھائی کی مدد سے اپنے چھوٹے بھائی کو اس دلدل سے نکال لیا۔ مجھے اپنی دونوں بیٹیوں پر فخر ہے۔"

(ہاں وجاہا کا بڑا بھائی) تضریم نے دل میں ٹکڑا لگایا۔ وہ دونوں مسکرادی تھیں۔

"جی انکل! یہ وجاہا نے کیا تھا۔" تضریم نے وضاحت کی۔

"وجاہا! بیٹا! اپنے پاپا سے ناراض تو نہیں ہو۔"

وہ اب اس کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کرکے، زندگی بھر کی محرومیوں کا جیسے ازالہ کردیا تھا۔

"جیتی رہو میری بچی۔ خوش رہو۔ لبنیٰ ہوتی تو وہ بھی اپنی بیٹی کو دیکھ کر خوش ہوتی۔ بہت زیادتی کی میں نے اس سے۔ پتا نہیں کیوں اس کی محبت کی قدر نہیں کی؟ شاید تکبر نے مجھے اندھا کردیا تھا۔"

ان کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ اس اعتراف نے وجاہا کو افسردہ کردیا۔ اگر کچھ سال قبل اس کی ماں کے سامنے ان کی زندگی میں وہ یہ سب کہتے تو شاید وہ اتنی جلدی دنیا سے نہ جاتیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنے بھائی کے متعلق انہیں بتارہی تھی۔ وہ کتنا قابل ہے۔ کتنا اچھا پڑھاتا تھا۔ ملک سے باہر رہا ہے اور اب کہاں رہتا ہے۔ وہ جانتے تھے وہ ان کے بلانے پر نہیں آئے گا مگر کوشش تو کرنی تھی۔ وہ اٹھ کر گئے تو تضریم نے اسے گلے لگالیا۔

"شکر اللہ کا، سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ بس اب میری شادی بھی تیمور لنگ سے نہ ہو۔"

اس نے گھور کر تضریم کو دیکھا۔ پھر وہ کاغذ لہرایا۔

"یہ کیا ہے؟"

اس نے لپک کر کاغذ چھینا۔

"تضریم! کیوں خود کو روگ لگاتی ہو؟ جانتی ہو، بھائی نصرہ آپی کو پسند نہیں کرتے۔"

وہ ہنسی تھی اس کی بات پر۔

"یوں کہو ناں کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔"

وجاہا نے اسے تاسف سے دیکھا۔

"بس کردو۔ چند دن بعد تمہارا نکاح ہے۔"

اس نے یوں منہ بنایا جیسے منہ میں کونین کی گولی گھلی ہو۔

"تب کی تب دیکھی جائے گی۔ابھی تو میری مرضی کسی کا بھی نام لکھوں۔"

وہ سرشار تھی۔محبت اس کی آنکھوں کے دریچوں سے جھانک رہی تھی۔وجاہا کو کئی اندیشوں نے گھیر لیا۔

"پلیز،اب تم کوئی کھڑاک مت پھیلا دینا۔"

اس کی تنبیہ پر تفریم نے نہایت معصومیت سے اوکے کہا تھا۔

☆☆☆

وہ ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔تفریم کو ساتھ چلنے کا نہیں کہا کہ وہ پھر کچھ الٹا سیدھا کہہ کر بات خراب نہ کردے۔اس خوب صورتی سے سجے ڈرائنگ روم میں بیٹھے اسے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے۔ایک نہایت باوقار مرد اور سجی سنوری خاتون اس سے ملنے چلی آئیں۔

"السلام علیکم!"

وہ انہیں جانتی تھی۔سارہ شمیر اور شمیر حیات۔

انہوں نے اس کے سلام کا جواب دے کر نشست گاہ سنبھال لی تھی۔

"میں یہ انویٹیشن کارڈ دینے آئی تھی۔میری بہن کا نکاح ہے۔"

اس نے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا۔پتا نہیں ان دونوں کو دیکھ کر اپنا بھائی صدیوں کے فاصلے پر کیوں لگا تھا؟اسی وقت وہ بھی آ گیا تھا۔

"وجاہا!گڑیا،میں تھوڑا لیٹ ہو گیا۔"

وہ اسے اپنے آنے کی اطلاع دے کر آئی تھی۔اس نے آتے ہی اسے کندھے سے لگاتے ہوئے۔اس کے سر پر بوسہ دیا تھا۔

"ممی!پاپا!یہ میری بہن ہے۔وجاہا میری اکلوتی لاڈلی بہن۔"

وہ اس کا تعارف کروا رہا تھا۔کچھ دیر پہلے محسوس کیا جانے والا فاصلہ یک بیک سمٹ گیا۔اس نے اپنے آنے کا سبب دوبارہ بتایا تھا وہ دعوت نامہ دیکھ کر چپ رہ گیا تھا۔

"تمہیں رخصت کرنے آؤں گا ناں۔اس نکاح کی تقریب میں نہیں آسکتا۔"

اس نے صاف گوئی سے انکار کر دیا تھا۔

"بھائی!پاپا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

اس نے جھجکتے ہوئے بتایا تھا۔یدان کے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔

"مگر میں ان سے ملنا نہیں چاہتا۔"

وہ رکھائی سے بولا تھا۔

"بھائی!وہ باپ ہیں ہمارے۔گزرے وقت کا ملال ہے انہیں۔پچھتا رہے ہیں۔ہمیں بھی اپنے دل سے تکلیف دہ احساسات اور اذیت ناک یادوں کو نکال دینا چاہیے۔تاکہ دل میں خوشیوں کی جگہ بن سکے۔"

وہ کچھ سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"میں ہم دونوں سے کی گئی زیادتیاں بھلا بھی دوں تو اپنی ماں کے دکھ نہیں بھولتے۔وہ تو تنہا ہی رہیں ہمیشہ۔انہیں کبھی سالف نذر کی محبت ملی نہ ان کی زندگی میں وقعت و اہمیت۔وہ ہماری ماں تھیں،اب وہ نہیں ہیں۔سالف نذر گزرے وقت کی تلافی نہیں کر سکتے۔"

اس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔وجاہا نے بھی خاموشی اختیار کرتے ہوئے فیصلہ وقت کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

گھر کے وسیع و عریض لان میں ہی نکاح کی تقریب کا اہتمام و انتظام کیا گیا تھا۔روزے کے بعد ہی قریبی مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔اس بار پورے تیس روزے ہوئے تھے۔لہذا کہیں کوئی افراتفری کا عالم نہیں تھا۔سب ہی عزیز و اقارب نکاح کی تقریب میں شریک تھے۔دولہا بھی اپنے رفقاء کے جھرمٹ میں آ گیا تھا۔بس دلہن پارلر سے نہیں آئی تھی۔وجاہا کو نصرہ نے گھر میں روک لیا تھا۔

"اتنا کام ہے۔تم چلی جاؤ گی تو میں اکیلی کیسے

سب دیکھوں گی؟"

حالانکہ ارینجمنٹ کا دردِ سر ایک ویڈنگ کمپنی کا تھا۔ پھر بھی انہیں خلجان لاحق تھا کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔ مگر اب وہ بھی متفکر تھیں۔ وجاہا کے دل میں تو کب سے دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی۔ اور اب بالکل سکوت تھا۔ موت سے پہلے کی خاموشی۔ دولہا کا چہرہ بھی بے تاثر تھا۔ کل وہ اپنی انا اور عزت نفس کو ایک طرف رکھ کر یدان سے ملنے گیا تھا۔

"میرا انکار مسئلہ نہیں۔ مسئلہ اس لڑکی کی عزت نفس ہے جسے اس کے باپ نے کبھی اولاد ہی تسلیم نہیں کیا۔ میں منع کر کے اسے مزید معاشرے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

وہ جو پہلے بھی کبھی نصرہ کے رشتے داروں کو پسند نہیں کرتا تھا اب تیمور کو اپنی سیاہ آنکھوں میں ناگواری لیے دیکھ رہا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

تیمور یدان سے چار سال بڑا تھا پھر بھی یدان کا انتہائی بگڑا ہوا لب و لہجہ برداشت کر رہا تھا۔

"تم، اگر تم تضریم سے شادی۔"

اور اس نے بات قطع کر دی۔

"دماغ تو درست ہے تمہارا؟ میں اور اس تضریم سے شادی۔ نو نیور۔" وہ بھڑک کر بولا تھا۔

"شاید تمہیں احساس ہی نہیں کہ تم کس کس کے دل کا خون اپنے سر لے رہے ہو۔"

تیمور کو افسوس ہوا تھا۔ یہاں وہ تضریم کے کہنے پر ہی آیا تھا۔

"اب میں اپنے منہ سے شادی کا کہتی اچھی لگوں گی۔ تم اس سے بات کرو۔ وہ اکڑو انسان پتا نہیں کیسے موم ہوگا؟"

وہ چلا آیا تھا لیکن یدان کی آنکھوں میں تضریم کے لیے کوئی بھی جذبہ نہ دیکھ کر اسے دکھ ہوا تھا۔ اس نے تضریم کو اپنی اور یدان کی ملاقات کی بابت کچھ نہیں بتایا تھا، وہ اس لڑکی کی عزت نفس کی توقیر میں اپنے دل کی خواہش کا لہو کر رہا تھا۔ وجاہا اس سے نگاہیں چرائے مہمانوں سے مسکرا کر مل رہی تھی۔ سب سے زیادہ تو نصرہ خوش تھیں۔ کچھ لوگوں کے لیے من چاہی خوشیاں پھولوں کی طرح ہوتی ہیں۔ بس ہاتھ بڑھایا اور سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیں۔ کچھ کے نصیب کی خوشیاں آسمان پر چمکتے ستاروں کی طرح ہوتی ہیں، دسترس سے دور۔

☆☆☆

وہ دن یدان سالف کبھی نہیں بھولا تھا جب اس نے اپنی ہی فیس کے لیے اپنے ہی گھر میں چوری کی تھی۔ پاپا اور نصرہ سے کئی بار مانگنے پر بھی اسے پیسے نہیں ملے تھے۔ اس نے پیسے نکال کر فیس تو بھروا دی تھی مگر اس کے بعد نصرہ کی باز پرس پر تضریم نے سب کچھ اگل دیا تھا۔

"آپ اگر یدان کو پیسے دے دیتیں تو کیا تھا۔ آپ کی شکایت میں سالف انکل سے کروں گی۔ آپ نے یدان کو چوری کرنے کے لیے مجبور کیا۔"

نصرہ نے اس کے منہ پر پہلی بار تھپڑ رسید کیا تھا۔

"میں بتاؤں گی سالف انکل کو۔"

وہ چیخ کر بولی تھی۔ نتیجتاً اسے مزید مار سہنی پڑی تھی۔ انہوں نے اسے کمرے میں بند کر دیا تھا۔

"ماں کے خلاف بولو گی۔ دیکھتی ہوں کیسے زبان چلائی ہو اب؟ اپنی سگی ماں کے بجائے ان سوتیلوں کا ساتھ دے کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟ اور اس یدان کو تو میں پوچھتی ہوں۔ آنے دو سالف کو سب بتاؤں گی۔"

وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھیں۔ سالف کے آنے سے پہلے یدان آ گیا۔ انہوں نے جوس میں نیند کی گولیاں ڈال دی تھیں۔

اس کے کمرے میں سگریٹ کے پیکٹ رکھ دیے تھے۔ ادھ جلی سگریٹ کی راکھ سے ایش ٹرے بھر دی تھی۔ بہت اچھی ڈرامہ ڈائریکٹر بن سکتی تھیں

وہ۔اسکرپٹ تو ان کا ہمیشہ ہی لاجواب ہوتا تھا یا پھر سالف نذر تھے ہی کانوں کے کچے۔انہوں نے یقین کرلیا تھا جو کچھ نصرہ نے بتایا۔وہ اس کے کمرے کا حال دیکھ کر دل برداشتہ ہوئے تھے پھر غصے سے پاگل ہوگئے۔انہوں نے بغیر کچھ سوچے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

نیم غنودہ ذہن کے ساتھ وہ جسم پر پڑتی ضربوں سے زیادہ ان کے الزامات سے ٹوٹا تھا۔چوری،نشہ اور بے راہ روی کے جیسے بہتانوں کی فہرست اور کوڑوں جیسے الفاظ سے انہوں نے اسے لہولہان کردیا۔

"اپنی ماں کی طرح دھوکے باز ہے۔نصرہ کہتی رہی،یہ بگڑ رہا ہے مگر میں نے ہی توجہ نہیں دی۔گھر میں چوری تو کرتا ہی تھا۔تضریم پر بھی بری نگاہ ڈالی۔بہن کی طرح ہے وہ تمہاری مگر تمہارے دماغ میں تو خناس بھرا ہے۔"

وہ زخموں سے چور ہوگیا۔انہوں نے تو اس سے صفائی بھی نہیں مانگی تھی جو کچھ نصرہ نے کہا یقین کرلیا۔اور اسے اپنی بیلٹ سے مار مار کر ادھ موا کردیا۔مگر وہ رویا نہیں تھا۔اور یہ اس رات کی بات تھی جب وہ وہاں سے جا رہا تھا۔اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر۔

"وجاہا! چلو میرے ساتھ۔ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

وجاہا کا ہاتھ تضریم نے پکڑ لیا۔

"وجاہا کہیں نہیں جائے گی۔" وہ مدبرینی کہہ رہی تھی۔

"بھائی! میں پاپا کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔آپ بھی مت جائیں۔پاپا ابھی ناراض ہیں،آپ نے پیسے لیے تھے۔"

وہ باقی کی کہانی سے انجان تھی۔اس نے بتایا بھی نہیں۔وہ یک دم تنہا ہوگیا۔

"میں واپس کبھی نہیں آؤں گا۔"

اس نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"یدان! میں انکل سے بات کرلیتی۔انہیں سب سچ بتادیتی مگر مما نے کہا تھا اگر کچھ کہا تو وہ میرے بجائے وجاہا کو کمرے میں بند کرکے بھوکا رکھیں گی۔"

وہ وضاحت دے رہی تھی۔اسے فرق ہی کیا پڑتا تھا۔

"تم آگ لگاتی ہو اور تمہاری ماں اس پر پٹرول ڈالتی ہے۔ظاہر ہے تم نے ہی انہیں پیسوں والی بات بتائی۔مگر مجھے اب یہاں رہنے کا کوئی شوق نہیں۔میں جا رہا ہوں یہاں سے۔"

وہ تلخ و تند لہجے میں بولا تھا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟ حالت دیکھی ہے اپنی۔"

تضریم نے اسے ٹوکا تھا۔

"کہیں بھی مگر یہاں نہیں رہوں گا۔"

وہ اس کی راہ میں حائل ہوگئی۔

"پلیز یدان! مت جاؤ۔تم ہمارے بھائی ہو۔اور ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔"

اس نے خون آشام نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم نہیں ہو میری بہن۔"

وہ غرایا تھا۔

"بھائی! مت جائیں۔"

وجاہا نے منت کی۔مگر اس کے قدم نہیں رکے تھے۔وہ دنیا کی بھیڑ میں گم ہوگیا تھا۔یہ تو تضریم کو سالہا سال گزرنے کے بعد بھی پتا نہیں چلا تھا کہ انہوں نے سالف نذر کے کانوں میں کیسا زہر گھولا تھا۔

وہ آج زندگی کی سب سے خوب صورت تیاری کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی۔اور وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسائے۔اسے گھور رہا تھا۔اور وہ ایسے تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔پاؤں پر پاؤں رکھے سلور گرے رنگ کے شرارے میں سر پر دوپٹہ اور ماتھے پر ٹیکا سجائے لاپروا نظر آرہی تھی۔کانوں میں جھولتے آویزوں کو چھوتی تو کبھی چوڑیوں سے کھیلتی کبھی جھک کر شرارہ درست کرتی تو کبھی دوپٹہ۔

"تم یہاں کرنے کیا آئی ہو؟"
شمیر حیات ہی نہیں سارہ شمیر بھی آگئی تھیں۔ آکورڈ سچویشن تھی۔

"آنٹی انکل! آپ دونوں ہی سمجھائیں اس کم عقل کو۔ میں یہاں کیوں آئی ہوں؟ بس بارات رہ گئی ورنہ خود ہی سمجھ آجاتی اسے۔"

وہ اپنی ہی بات سے لطف لے رہی تھی۔

"تضریم! یہ زندگی ہے کوئی فلم یا ڈرامہ نہیں۔ وہاں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔

"تم چلو میرے ساتھ، سب سے کہو کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔ اس طرح ہی وجاہا اور تیمور کی مدد ہو سکتی ہے۔ وہ بہن تمہاری ہے اور فکر مجھے ہے۔"

اسے یہ بات اول روز کی طرح بری لگی۔

"وجاہا کے کندھے پر بندوق رکھ کر مت چلاؤ۔ اگر تمہیں تیمور سے شادی نہیں کرنی تو نہ کرو مگر اپنی والدہ کی سیاست میں ہم بہن بھائیوں کو مت شامل کرو۔ اسپیشلی وجاہا کو۔ کم از کم اپنی ماں کی پروا کرلو اور جاؤ یہاں سے۔"

وہ افسردہ ضرور ہوئی تھی مگر ہمت نہیں ہاری۔

"یہ کوئی سیاست نہیں۔ تم اگر میرے ساتھ نہیں جاؤ گے تو میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ اور مما ہی سے تو سارا حساب بے باک کرنا ہے۔ نبیٰ آنٹی کے ساتھ جو کچھ انہوں نے غلط کیا، اس کا حساب انہیں ایسے ہی دینا ہوگا۔ سب کچھ کر کے وہ کیسے سوچ سکتی ہیں کہ انہیں بدلہ نہیں ملے گا؟ آج وہ اسی کرب سے گزریں گی۔ مکافات عمل سے گزر کر ہی وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں گی ورنہ نہیں۔"

وہ جو کچھ ٹھانے بیٹھی تھی۔ اس میں یدان سالف اس کا ساتھ دینے کو بھی تیار نہ ہوتا۔ اس نے موبائل نکالا تھا تا کہ وجاہا کے ذریعے سالف نذر اور تیمور کو اس کی یہاں موجودگی کی خبر دے سکے اور وہ یہاں آکر اسے لے جائیں۔

"یدان! تم انہیں انفارم نہیں کرو گے۔"

اس نے اٹھ کر اس کا موبائل لینا چاہا۔ اس نے موبائل ہاتھ اونچا کر کے اس کی پہنچ سے دور کر دیا۔

"وہ الزام جو تمہاری ماں نے مجھ پر لگایا تھا تم اسے سچ ثابت کرنا چاہتی ہو۔ یہ کیسا بدلہ ہے جس میں عزتوں کے جنازے اٹھائے جا رہے ہیں؟ تمہیں اندازہ ہے کہ تم کیا کر رہی ہو؟ تم خود کو مجھے۔ وجاہا اور تیمور کو ہی نہیں پورے خاندان کو بدنامی کی اسی آگ میں جھونک رہی ہو۔ جس میں تمہاری والدہ نے برسوں پہلے سب کچھ جلایا تھا۔ تم غلط ہو۔ اسے مکافات عمل نہیں کہتے۔ اور میں کسی کی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا کر کوئی بدلہ کبھی نہیں چاہوں گا۔ میری مما نے یہ تربیت نہیں کی تھی میری۔"

تضریم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"یدان ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹا! چلیں، ہم آپ کو چھوڑ آئیں۔"

سارہ شمیر بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس رکھتی تھیں۔

وہ مضمحل سی کھڑی ہو گئی۔

"یدان سالف! تمہاری نیکی آج کسی کا بھلا نہیں کرے گی۔ کئی دل اجڑیں گے۔ آہ لگے گی تمہیں میری۔"

وہ اب باقاعدہ بددعاؤں پر ہی اتر آئی تھی۔

"کم زور لوگ اکثر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ آہیں، بددعائیں بے بس لوگوں کا ہتھیار ہوتی ہیں۔ تم نہ کمزور ہو اور نہ بے بس۔ جا کر گلزار سے کہو وہ تم سے نکاح کر لے گا۔ ویسے بھی اس دن میری بات سنے بغیر چلی گئی تھیں۔ اور اسی کے گھر موجود تھیں تم۔ مجھے کیوں پرائی آگ میں جھونک رہی ہو؟"

وہ سلگ رہا تھا۔ تضریم جل ہی گئی۔

"اس سے کیوں کہوں؟ وہ میرا رشتے دار نہیں صرف بچپن کا دوست ہے۔ اور اب تو ویسی دوستی بھی نہیں۔ اس کے ایکسیڈنٹ کے بعد نگہت آنٹی کے

کہنے پر ملتے ہیں اس سے۔اور اطلاعاً عرض ہے وہ آل ریڈی منگنی شدہ ہے۔خواہ مخواہ اس سے کہوں کہ مجھ سے نکاح کرلے۔اتنا دماغ خراب نہیں میرا، جبکہ مجھے اس سے محبت بھی نہیں۔خیر نہ تو نہ سہی۔میں چلی جاتی ہوں۔"

وہ بیمار کی نبض تھامے بغیر مرض پہچان گئی تھی۔یعنی اسے شدید قسم کی غلط فہمی تھی۔

وہ بھی کچھ نہیں بولا تھا۔

سارہ ثمیرا اور ثمیر حیات اس کے ساتھ جا رہے تھے۔

"یدان! ہم بچی کو چھوڑنے جارہے ہیں۔تم چاہو تو ساتھ چلو۔"

مگر اس نے منع کر دیا۔

"آپ لوگ جائیں۔مجھے ویسے بھی وہاں جا کر کوئی نیا تمغہ نہیں لینا۔"

تضریم نے اسے ملامت آمیز نگاہوں سے گھورا۔

"تمغات،اعزاز،انعامات بھی بہادر لوگوں کو ملتے ہیں۔مصائب سے گھبرا کر فرار ہو جانے اور منہ چھپا کر بیٹھنے والوں کو صرف آسانیاں ملتی ہیں۔اور تم نے آسان راہ کا انتخاب کیا ہے۔"

وہ طنز کے تیر چلا رہی تھی۔

پتا نہیں لوگ مطمئن نظر آنے والے انسان کو دیکھ کر کیوں اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ سدا سے آسان راستوں کا مسافر ہے؟

یدان نے اپنا کوئی دکھ کسی سے کبھی کہا بھی تو نہیں تھا۔

☆☆☆

مہمانوں کی سوالیہ نگاہیں انہیں دولخت کر رہی تھیں۔چہ مگوئیاں،کرید،استہزا وہ آج اسی تکلیف سے گزر رہی تھیں۔جس سے ان کے قریبی رشتے گزر چکے تھے۔آج وہ اسی مقام پر کھڑی تھیں۔جہاں کبھی ان کے اور سالف کے والدین تھے۔اقبال بھائی اور ثمینہ بھابھی کو صرف ڈر تھا کہیں کوئی انہونی نہ ہو جائے۔اور نصرہ کے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ان کے ہاتھوں میں کچھ تصاویر تھیں جن میں ایک انجان چہرہ تھا۔وہ مرد کون تھا وہ نہیں جانتی تھیں۔نہ ہی اس لڑکی کا چہرہ واضح تھا۔پتا نہیں وہ لڑکی کون تھی؟ مگر انہیں خوف محسوس ہو رہا تھا۔کہیں یہ ان کی بیٹی نہ ہو۔بدنامی،رسوائی کا خوف بہتان تراشی کا ڈر۔

"اچھا ہوا، وہ چلا گیا۔جان چھوٹی۔بڑا ہی شاطر لڑکا تھا۔جیسے پیسے چوری کیے تھے۔ایسے ہی سب ہتھیا لیتا۔میں نے بھی سالف کو وہ کچھ بتایا کہ وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔تمہیں تو وہ اپنی بیٹی مانتا ہے۔اور جب اسے پتا چلا کہ وہ چور، نشئی اور بدکردار لڑکا تم پر بری نظر رکھتا ہے تو غصے میں اس نے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔یہ سبق کافی تھا اس کے لیے۔گھر سے نہ جاتا تو کچھ عرصے میں، میں اسے دھکے دلوا کر نکلواتی۔"

وہ ماں کو بتانے آئی تھی، یدان چلا گیا ہے اور ماں نے پوری کہانی اس کے گوش گزار کر دی تھی۔وہ پتھرا گئی تھی۔اور آج نصرہ کو وہی بہتان تراشی یاد آرہی تھی۔لبنی پر لگایا الزام، ایسی ہی تصاویر تو لبنی اور سالف کی بنوائی تھیں انہوں نے۔کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی؟ یا کسی نے ان سے کوئی پرانی دشمنی نکالی تھی۔ان کے ہاتھوں سے وہ تصاویر سالف نذر نے لے لی تھیں۔اور بہت پرانی یاد ان کے ذہن میں بھی تازہ ہوئی تھی۔

"یہ سب کیا ہے؟"

وہ دونوں سب سے الگ تھلگ گوشے میں کھڑے تھے۔یہ تصاویر انہیں ابھی کوریئر سروس سے ملی تھیں اور وہ ایک طرف چلی آئی تھیں۔تصاویر دیکھنے کے بعد انہوں نے سالف نذر کو بلایا تھا۔اب وہ بھی حق دق تھے۔نصرہ رو رہی تھیں۔

"سالف! یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔پہلے یمین غلط رستے پر چل نکلا اور اب تضریم کا کچھ پتا نہیں اور یہ تصویریں جو کہانیاں سنا رہی ہیں، یہ سب

میرے گناہوں کا شاخسانہ ہے۔"
سالف نے اطراف میں نگاہ ڈالی۔ ابھی تک کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔
"بس کرو نصرہ! کیوں تماشا لگانا چاہتی ہو؟ ابھی کوئی اس طرف متوجہ نہیں۔ میں خود پارلر جا کر دیکھتا ہوں۔ تضریم کو دیر کیوں ہو رہی ہے؟"
وہ متفکر تھے مگر ابھی ان کے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے۔
"سالف! میں اسی دن سے ڈر رہی تھی۔ وہ لڑکی مجھ سے، اپنی ماں سے بدلہ لے رہی ہے۔ وہ مکافات عمل سے ڈراتی تھی۔ آج اس نے میرے سر میں خاک ڈال دی۔ ہماری ناک کٹوادی۔"
وہ سر پیٹنے اور زور زور سے رونے والی تھیں جب وجاہا ان کی طرف آئی تھی۔
"تضریم آگئی ہے۔"
اس اطلاع کے ساتھ ہی ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ دونوں دولہا دلہن کے لیے بنائے گئے اسٹیج کی طرف بھاگے تھے۔
"پاپا! وہ پچھلے گیٹ سے آئی ہے اور اندر گھر میں ہے۔"
وجاہا نے عجلت میں مزید کہا تھا۔ وہ تینوں وہیں آگئے۔ تضریم تنہا نہیں تھی اس کے ساتھ موجود نفوس کو دیکھ کر ان کے قدم تھمے تھے۔
سارہ ثمیر ہالی ووڈ ایکٹرس تھی۔ ثمیر حیات ایک کاروباری شخصیت۔ وہ برسوں سے امریکہ میں مقیم تھے۔ سالف نذران سے واقف تھے مگر روبرو پہلی بار ملاقات ہو رہی تھی۔
"کہاں گئی تھیں تم؟ کیا تھا یہ سب؟"
نصرہ نے آگے بڑھ کر سختی سے تضریم کا بازو دبوچا۔
"صرف ایک سبق۔ انسان جو بوتا ہے، وہ ہی کاٹتا ہے۔"
وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولی تھی۔
"آپ نے محبت کی اور سب کچھ تباہ کر دیا۔ آپ نے ہی اپنی غرض کے لیے دوسری بار لبنیٰ آنٹی کو برباد کیا۔ پہلی بار ایسی ہی تصویروں سے ان کی راہ کھوٹی کی اور دوسری بار خود سالف انکل سے شادی کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہیں اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ آپ بھی دوست تھیں اور میں بھی دوستی نبھا رہی ہوں۔ آج وجاہا اور تیمور کا نکاح ہوگا۔ میرا نہیں اگر آپ نے مجھے فورس کرنے کی کوشش کی تو میں کوئی لحاظ نہیں کروں گی۔ میں چیخ چیخ کر اس شادی سے انکار کروں گی۔ بہتر ہوگا آپ لوگ وجاہا کو وہاں لے جائیں۔"
وہ مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔ وجاہا مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا؟"
نصرہ آج طیش میں نہیں آئی تھیں۔ ان کا لہجہ کمزور تھا۔
"مما! مان لیں، انسان کتنی بھی چالیں چلے مگر کسی کی قسمت نہیں چھین سکتا۔ آپ کی تمام تر خواہش اور کوششوں کے باوجود کیا ملا تھا محبت میں آپ کو، فقط ناکامی۔ اور آج دیکھیں لبنیٰ آنٹی کی اولاد سے ہمیں حق چھین کر دینے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ دونوں صابر ہیں۔ نیک طینت اور اعلا ظرف ہیں۔ یہ جو سامنے کھڑی ہے اگر ایک اشارہ کرتی تو کبھی تیمور یہاں نہ آتا اور وہ یہ دان سالف اس کی کتنی منت سماجت کی میں نے مگر اس نے کہہ دیا اسے ایک گھر کی عزت و ناموس کی پروا ہے۔ یہ وہ ہی لڑکا ہے جس پر آپ نے رکیک الزامات عائد کیے تھے۔ چور، ڈرگ ایڈکٹ، کریکٹر لیس کیا کیا نہیں کہا آپ نے اسے اور وہ بدلہ لینے میں بھی انٹرسٹڈ نہیں۔"
یہ انکشافات تھے مگر سالف کو پہلے ہی ادراک ہو چکا تھا کہیں نہ کہیں وہ ہی غلط تھے۔
"وہ خود ہی گھر چھوڑ کر گیا تھا۔"
نصرہ نے مبہم سا انکار کیا تھا اپنی سابقہ کارکردگی کا۔

"مجبور تو آپ نے کیا تھا۔"
وہ تنک کر بولی تھی۔
"وہ پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ کچھ تو غلطی ہوگی اس کی۔"
نصرہ نے بدقت کہا۔
"اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا ہماری گاڑی سے۔ہم اسے اپنے ساتھ اسلام آباد لے گئے تھے۔کسی ہمدردی میں نہیں بلکہ وہ ہمارے مرحوم بیٹے سے مشابہہ تھا اس لیے۔اسے بھی کچھ یاد نہیں تھا۔دو سال تو وہ بالکل ہی خود سے بیگانہ تھا۔اسے سب یاد کرنے میں وقت لگا اور جب آپ لوگ یاد آ بھی گئے تو اس نے اپنی نئی شناخت کو پرانی شناخت پر ترجیح دی۔یدان سالف سے یدان شمیر بننے میں اس کی آمادگی شامل تھی۔یدان کی صورت میں ہمیں ہمارا بیٹا مل گیا۔جسے کینسر جیسا موذی مرض ہم سے چھین لے گیا تھا۔"
شمیر حیات نے پچھلے دس سالوں کی یدان سالف کی کتھا سنادی تھی۔
"کچھ بھی ہو مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔یدان شروع سے ہی ایک باغیانہ سوچ کا حامل سرکش لڑکا تھا۔اس نے جو کچھ کیا، وہ اس کی مرضی تھی۔"
انہیں سالف نذر سے نگاہ ملانا مشکل ہوگیا تھا۔
"نصرہ! تمہیں ہی نہیں میں خود کو بھی قصوروار سمجھ رہا ہوں۔میری زندگی عدل سے خالی ہے۔آئندہ زندگی میں شاید تم پر بھی اعتبار نہ کرسکوں۔"
لمحوں میں ان کی ساری چالبازیاں ان کے منہ پر ماردی گئی تھیں۔
"سالف! مجھے معاف کردو۔"
نصرہ کے پاس معافی مانگنے کے سوا کوئی راہ نہیں تھی۔سالف چپ رہے تھے۔
"انکل! میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے کسی ایسے شخص کے ساتھ مت نتھی کریں۔جس کے دل میں، میں نہیں۔"
تفریم نے صاف لفظوں میں ان تک اپنا انکار پہنچادیا تھا۔
"تفریم کی مرضی نہیں تو تیمور اور تفریم کی شادی نہیں ہوگی۔"
سالف نے فیصلہ سنادیا تھا۔تفریم نے انہیں شکر گزاری کے تاثرات لیے دیکھا۔
"ہم مہمانوں کو کیا جواب دیں گے؟ لوگ کیا کہیں گے؟ شادی ہر صورت آج ہی ہونی چاہیے۔ورنہ بہت بے عزتی ہوگی ہماری۔"
نصرہ کے پاس پریشان ہونے کی کئی وجوہات تھیں۔
"آپ تیمور کو بلا کر پوچھ لیں۔اور وجاہا کی مرضی مجھے پتا ہے۔شادی آج ہی کردیں، اس میں کوئی دقت نہیں۔"
تفریم نے چٹکیوں میں حل نکالا۔
سالف نذر بھی متفق ہوگئے۔کچھ ہی دیر میں دلہن بدل گئی۔تیمور اور اس کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔البتہ وجاہا ضرور بار بار موبائل کی اسکرین دیکھ رہی تھی۔جتنی دیر میں اسے تفریم نے تیار کیا۔اتنی دیر میں اس کا بھائی اسے رخصت کرنے پہنچ گیا۔وہ گہرے سبز رنگ کے فراک میں نفاست سے دوپٹہ اوڑھے میک اور جیولری میں کس قدر اپنی مرحومہ ماں سے مشابہ نظر آرہی تھی۔یدان اس کے ایک میسج پر چلا آیا تھا۔وہ حیران ہوا تھا۔تفریم نے کیسے کچھ ہی دیر میں سب کو اپنے حق میں کرلیا تھا۔
"تم خوش ہو؟"
اس نے بہن سے پوچھا تھا۔
اس نے محض سر ہلانے اور نگاہ جھکانے میں ہی اپنی رضا کا اقرار و اظہار کردیا۔
"وہ ماشاءاللہ خوش ہے۔تمہیں اس کی خوشی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"
شیشے میں اس کا عکس دیکھتے ہوئے اس نے کھٹاک سے کہا تھا۔وہ اپنا میک اپ ٹشو کی مدد سے

صاف کررہی تھی۔

"یہ کیا کررہی ہوتم؟ رہنے دوایسے ہی۔"

وجاہانے اسے ٹوکا۔

"اتنا میک اپ دلہن پر ہی اچھا لگتا ہے۔ اور اب میں دلہن نہیں۔ اور بہت اچھا لگنے کا حق اور روقت فی الحال تمہارا ہے۔"

وہ منفرد تھی۔ کسی کا تھوڑا سا بھی حق چھیننا اسے گوارا نہ تھا۔

"بھائی! کیا میری بھابھی ایسے اچھی نہیں لگ رہیں۔"

وجاہا کو بھی شرارت سوجھی تھی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے یدان کے مقابل لے آئی تھی۔ وہ لب بھینچ کر بہن کو گھور ہی سکا۔

"نکاح پڑھانے کے لیے قاضی صاحب کب سے انتظار کررہے ہیں۔ میں مما کو کہہ دوں کہ دلہن تیار ہے۔"

وہ جانے لگی تھی۔

"دلہن تو میری بھی تیار ہے۔ میرے خیال میں مجھے بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

یدان کے سنجیدہ سے لہجے نے اس کے ہوش اڑائے تھے۔ وجاہا کو خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی۔

"سچ بھائی!"

وہ چہکی۔

"سچ لیکن میرا ساتھ تمہاری سہیلی کے لیے سہل نہیں ہوگا۔ میں اس کی والدہ اور اپنے والد کو پسند نہیں کرتا۔ شادی کے بعد یہ صرف تضریم یدان ہو گی۔"

وہ دروازے میں رک گئے تھے۔ بے یقینی سے ان کا بیٹا ان کے سامنے تھا۔

"یدان!"

وہ بے ساختہ آگے بڑھے اور اس کی بے اعتنائی کے باوجود اسے گلے بھی لگالیا تھا۔

"تم وہ سب بھول کر مجھے معاف نہیں کرسکتے۔"

وہ جیسے عجلت میں تھے۔ یدان منہ موڑ لینا چاہتا تھا مگر سالف نذر نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"یدان! تمہاری ماں کا مجرم ہوں میں۔ نصرہ سے زیادہ قصوروار ہوں۔ نصرہ کی باتوں میں مجھے کبھی کھوٹ نہیں نظر آیا کیونکہ کھوٹ تو میرے اندر تھا۔ میں نصرہ سے آگے کچھ دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ کسی کا حق ادا نہیں کرسکا میں۔ تم دونوں سے شرمندہ ہوں۔ پشیمان ہوں مگر اب تمہاری ناراضی کا بار اٹھانے کے قابل نہیں۔ اب بوڑھا ہوگیا ہوں۔ تمہاری ضرورت ہے مجھے۔ میرے بعد تم اس گھر کے سربراہ ہو۔ تمہیں سب کچھ سنبھالنا ہے۔"

وہ اپنے کندھوں پر سے ان کے ہاتھ نہیں جھٹک سکا۔ وہ ان کی طرح سخت دل نہیں تھا۔

"معافی آپ اللہ سے مانگیں۔ میں سب کچھ معاف کرسکتا ہوں لیکن امی کے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو نہیں۔ شاید وقت کے ساتھ میرے دل میں اتنی وسعت آجائے لیکن فی الحال اس دل میں آپ کے لیے کچھ نہیں، ویسے بھی وہ لوگ بھی مجھ پر حق رکھتے۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھ پر ان کی محبتوں کا قرض ہے۔"

انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔

"وہ لوگ میرے بھی محسن ہیں۔ تم انہیں بھی مت چھوڑو۔"

قاضی اور گواہان بھی آگئے تھے۔ وجاہا اور تیمور کا نکاح ہوگیا تھا۔ چاند رات مبارک کے شور میں نکاح کی مبارک سلامت کا شور بھی شامل ہوگیا۔ یدان نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھا۔ تیمور کو گلے لگا کر مبارک باد دی تھی۔

"تضریم تمہاری ذمہ داری ہے۔ اب تم میری بات ماننے کے پابند ہو۔ عمر میں بھی تم سے بڑا ہوں اور اب بہنوئی بھی بن گیا ہوں۔"

تیمور نے اس پر رعب جھاڑا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ تمہاری پھوپھی زاد بہن

سے شادی کر کے میں بھی اسی درجے پر فائز ہو جاؤں گا۔"

یدان کے جواب نے اسے خوش گوار حیرت سے دوچار کر دیا۔

نصرہ، یدان کی طرف آگئیں۔

"یدان!"

اس کے چہرے پر ناگواری آگئی۔ اس نے لب بھینچ لیے۔ ان کی معذرت قبول کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"تم نے یمین کو ان جرائم پیشہ لوگوں سے بچا کر بہت بڑا احسان کیا مجھ پر۔ تم چاہتے تو یمین یا تضریم کے ذریعے مجھ سے بدلہ لے سکتے تھے مگر تم لبنی کے بیٹے ہو۔ اس نے بھی شکست قبول کر لی لیکن کبھی مجھ سے شکایت نہیں کی۔ دراصل تو وہ جیت گئی مجھ سے۔ آج نہ شوہر کی نظر میں میری وقعت ہے نہ اولاد کی نظر میں۔ تم مجھے معاف کر دو۔ میں نے جو کچھ بھی کیا اپنی زندگی کو سہل بنانے کے لالچ میں کیا۔"

کتنے ہی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ یدان نے دل پر بوجھ محسوس کیا۔

"اپنی مما سے کی گئی زیادتی کے لیے میں شاید کبھی نہ معاف کر سکوں۔ آپ نے تو ان کی اولاد پر جھوٹے الزام لگا کر ان کی روح جو تکلیف پہنچائی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔"

وہ اتنے پر ہی خوش ہو گئیں۔

وہ اپنے ماموں سے مل کر پلٹ رہا تھا کہ تضریم راہ میں حائل ہو گئی۔

"ابھی تو تم دیر نہ کرنے کی بات کر رہے تھے قاضی بھی ہے گواہان بھی اور چاند رات بھی۔ وہ کیا کہتے ہیں موقع بھی ہے دستور بھی۔"

یدان نے اس تیز طرار سی معصوم صورت والی لڑکی کو گھور کر دیکھا۔ جو یقیناً اپنے تئیں اسے تنگ کر رہی تھی۔

وہ مسکرایا تھا۔ محبت تو ابھی نہیں تھی مگر اسے یہ مخلص سی لڑکی اچھی لگی تھی۔ جس کے متعلق اس کی بہن نے کچھ دیر پہلے ہی بتایا تھا، وہ اپنا نام اس کے نام کے ساتھ لکھتی ہے۔ یدان کو ہنسی آگئی۔

"کچھ بھی ہو، تمہارے ساتھ میں بور نہیں ہوں گا زندگی بھر۔"

اس نے ہاتھ پکڑا۔

وہ سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"تضریم، یدان یہاں آؤ۔"

سالف نذر کی آواز پر دونوں چونک کر ان کی طرف بڑھے تھے۔

انہوں نے دونوں کو ساتھ بٹھا دیا۔ نصرہ نے تضریم کے سر پر تیز گلابی زرتار دوپٹہ اوڑھایا۔ وہ حیران پریشان تھی۔

"آج سے تضریم یدان کی امانت ہے۔ جلد ہی میں ان بچوں کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاؤں گا۔"

یدان کے ہاتھ میں انگوٹھی سارہ شمیر نے تھمائی تھی۔ تضریم کے گندمی سے شفاف ہاتھ کی تیسری انگلی میں یدان نے انگوٹھی پہنائی تھی۔ یدان سالف کے لبوں پر دل آویز تبسم تھا۔ تضریم اب بھی کھلکھلا رہی تھی۔

وہ اپنی ماں سے یکسر مختلف ایک حساس لڑکی جس کی قدر یدان کے دل میں خود بہ خود پیدا ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا اس کے لیے دل محبت کے کواڑ بھی کھول دے گا۔ وہ اس کے نام کی انگوٹھی پہن کر شاداں و فرحاں دھیمے سے پوچھ رہی تھی۔

"یدان! تم خوش ہو؟"

وہ اس کے متوحش لہجے پر ہنستا چلا گیا تھا۔ وجاہا اور تیمور بھی کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ تضریم کا دل ان کے لیے محو مناجات ہوا۔ وہ لوگ جن کی زندگیوں میں اس کی ماں نے زہر گھولا تھا آج خوش تھے۔ اسے یقین تھا آج دور کہیں لبنی بھی خوش ہوں گی۔

☆☆

ثمین صداقت

گھر

جیسے ہی وہ دروازے سے اندر آئی، سامنے ہی امی کھڑی تھیں۔

"شکر ہے تم آگئیں۔" امی کے شکر ادا کرنے پر وہ ہاتھ ملتی اندر آنے لگی۔ سردی تھی کہ بے تحاشا۔

"آپ روزانہ اتنی سردی میں باہر کیوں کھڑی ہوتی ہیں۔ میں کوئی افسر تھوڑی ہوں جس کا آپ نے استقبال کرنا ہے۔" وہ سردی سے بچتی امی کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

"تمہارا استقبال نہیں کرتی۔ گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ اس لیے باہر کھڑی ہو جاتی ہوں تاکہ چلتے پھرتے ایک دو لوگ تو نظر آئیں۔"

وہ ہنس دی۔ امی کبھی نہیں مانیں گی کہ وہ اندر سے اس کا ہی انتظار کرتی تھیں۔

"نہ مانیں...... کیا بنایا ہے؟" کچن میں جاتے ہی اس نے پوچھا اور خالی کچن دیکھ کر گہری سانس لی۔

"آج سبزی والا ہی نہیں آیا۔" امی پریشانی سے بولیں۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا جھریوں زدہ چہرہ، چہرے پر پریشانی کی لکیریں۔ مائیں معصوم ہولی ہیں۔ اس نے اپنی شدید بھوک کا گلا دبایا، کالج کی ساری بھڑاس کو اندر ہی رکھا۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اندر انڈیلا۔

"چلیں، باہر سے کچھ منگوا لیتے ہیں۔ آپ کے لیے کیا منگواؤں؟"

"کچھ بھی نہیں۔" ہمیشہ کی طرح ایک ہی جواب۔ کبھی اسے اس جواب پر شدید غصہ آتا تھا اب اسے معلوم تھا، اس کی ماں کو کیا پسند ہے۔ وہ فون لے کر قریبی پیزا ہٹ سے چیزیں منگوانے لگی۔ اب ایک گھنٹہ مزید انتظار کرنا تھا۔

"پھر آج کیا کیا آپ نے؟" چادر اتار کر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے ان کی طرف دیکھا۔ روز کا سوال۔ روز کا جواب۔

"سبزی والے کا انتظار۔" وہ دونوں ہنس دیں۔

"رات کو جلدی سو گئی تھی تو ڈرامے کی قسط دیکھی۔ صبا سے صفائی کروائی، پروین نے برتن دھوئے پھر کچھ دیر بعد آنے کا کہہ کر نکل گئی، کھانا بنانا نہیں تھا اس لیے ابھی تک واپس ہی نہیں آئی اور پھر بس تمہارا انتظار۔" بولتے بولتے وہ ایک دم رکیں۔ پھر سر ہلاتے ہنس دیں۔

"ایک وقت تھا تم سب اسکول سے اکٹھے آتے تھے۔ اور پھر کھانے کا شور، نور سے تو بھوک برداشت ہی نہیں ہوتی تھی۔ کھانے میں دیر لگتی تو وہ واویلا مچا دیتی۔ باقی تم اور مونا تو انتظار کر لیتی تھیں۔ لیکن ہمیشہ کچھ بنا کے رکھو۔ اور تمہارے ابو نے تو ہمیشہ صبح صبح ناشتہ کرنا پھر مغرب کے وقت کھانا کھانا ہوتا تھا۔"

"اور اسی وقت گیس چلی جاتی تھی۔" رباب نے بات مکمل کی تو امی زور سے ہنس دیں۔ دروازہ بجا تو وہ اٹھ کر باہر گئی۔

"اتنی جلدی آرڈر آگیا؟" امی بھی پیچھے ہی آگئیں۔

"نہیں پروین تھی، کسی کے گھر سے زردہ آیا ہے۔ پتا نہیں کس کا نام لے رہی تھی۔" اس نے

کچن سے دو چمچے لیے اور ٹیبل کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"اولاد بڑی ہوتی ہے اور ماں کے لیے ملازمہ رکھ دیتی ہے کہ یہ آپ کے پاس رہے گی آپ کو ڈر لگتا ہے یا آپ بور ہوتی ہیں۔ ہم جیسی عورتوں نے تو ساری عمر اولاد کو بڑا کرنے میں لگا دی، ان کے کاموں میں جتے رہے اور جب اولاد کی باری آئی تو ملازمہ رکھ دی۔۔گھر کے افراد کا نعم البدل ہوتا ہے کیا؟" وہ تلخی سے ہنسیں۔ رباب نے تھوک نگلا۔ وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ اولاد، والدین اور محبت ان تینوں کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔

"آجائیں، گرم ہے۔"

"نہیں۔ تم کھاؤ۔ پھر میری شوگر بڑھ جائے گی۔" رباب نے چمچہ پلیٹ میں رہنے دیا۔ معلوم تھا کچھ دیر میں آہستہ آہستہ خود ہی کھانا شروع ہو جائیں گی۔

"کسی زمانے میں کیسا بھرا ہوتا تھا یہ صحن۔ سب ہی اسکول کالج سے آتے تھے۔" امی نے صحن کی طرف رخ کرتے کہا۔ آج وہ زیادہ ہی اکیلا پن محسوس کر رہی تھیں۔

"صاف صاف کہیں آپ کو میری دادی یاد آ رہی ہیں۔" امی نے مسکرا کے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ اسے اداسی محسوس ہوئی۔۔شاید امی کی آواز میں تھی یا امی کے ساتھ تھی۔

"ابھی اتنا وقت تو نہیں گزرا۔ جب شادی ہوئی تو۔ ہم صبح سویرے اٹھتے تھے، نماز کے بعد جس کی صحن میں جھاڑو لگانے کی باری ہوتی۔ وہ جھاڑو لگاتی، پھر باقی مل کے ناشتہ بناتے، تمہاری دادی مکھن اور دودھ کا کام کرتیں، ناشتے کے بعد تم سب کو نہلا دھلا کے تیار کرتے، کمرے صاف کرتے پھر خود تیار ہوتے۔ پھر دوپہر کے سالن کی تیاری۔" امی جلدی جلدی کہانی لپیٹ رہی تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا وہ تھکی ہوئی ہے لیکن بولنا بھی تو اسی سے تھا۔ باتیں بھی تو آخر اولاد سے ہی کی جاتی ہیں۔

اور بہت سا وقت آگے گزرا۔

وہ بڑے ہوئے۔اسکول سے کالج۔۔کالج سے سب یونی ورسٹی ہاسٹل۔۔گھر اگر مکینوں سے ہوتا ہے تو ان کا گھر بھی مکان بن گیا۔وہ خود دو سال پہلے ہاسٹل سے روزرو کے گھر آئی تھی۔

"دروازہ بج رہا ہے جاؤ بھی رباب پتا نہیں کہاں گم ہو جاتی ہو۔۔پروین تو پتا نہیں کون سے سیر سپاٹوں پر نکلی ہے۔" امی اسے ہلاتے ہوئے بولیں۔

آرڈر آ گیا تھا۔زردہ ایسے ہی پڑا رہا۔

☆☆☆

آج اس کی چھٹی تھی۔وہ ناشتے کے بعد صحن میں کرسی کھینچ کر لے آئی۔سورج آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔امی بھی پروین سے کرسی منگوا کر وہیں بیٹھ گئیں۔

"تمہارے دادا نے یہ گھر بنایا تھا۔پھر ہر کسی نے اپنے اپنے نقشے بنا لیے۔" امی کی بات پر اس نے آس پاس دیکھا۔ہاں ہر کسی نے نقشے بنا کے مکان چھوڑ دیے تھے۔کچھ رزق کی تلاش میں بے گھر ہوئے، کچھ اولاد کے لیے اور کچھ شوق میں۔

گھر نئے زمانے کے معیار پر اترتے ہوئے بھی پرانا سا تھا۔درمیان میں ماربل والا صحن اور اس کے اطراف میں چار مکان۔۔اونچی دیواروں والے۔تین تین منزلہ۔شیشوں بھری عمارات۔سامان کے انبار اور خاموشی۔

ایک وقت تھا ہر گھر سے آواز آتی تھی۔

"یہ والی فیملی کب آئے گی؟" اس نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے پورشن کے ساتھ والے پورشن کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"پتا نہیں۔۔کہہ تو رہی تھیں باجی کہ ہفتے کے لیے جا رہے ہیں لیکن مہینہ ہونے کو آیا۔" بڑے تایا تائی تو اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ سرکاری گھر میں ہی رہائش پذیر تھے،ان سے چھوٹے تایا کچھ دنوں کے لیے اپنے بڑے بیٹے کے گھر لاہور گئے تھے۔اور سب سے چھوٹے چچا چچی جیسے ہی تینوں بچے یونی ورسٹی گئے وہ اپنا بوریا بستر سمیت لاہور شفٹ ہو گئے۔سب کی اولادیں کچھ باہر کے ملک، کوئی دوسرے شہر۔

اور ان سب کے گھر جو لڑ جھگڑ کے بنائے تھے وہ خالی تھے۔دادا دادی کا کہنا تھا اس طرح الگ چار گھر بنانے سے اچھا ہے دو کر لو لیکن سب نے کہا نہیں الگ بنائیں گے پھر ہر کسی نے صحن چھوڑ کر اپنی مرضی کے نقشے بنوا لیے۔کتنے جھگڑے ہوئے تھے، دعائیں کوسنے سنے دادی سے، یہ الگ کہانی تھی رباب نے کہانی میں گھسنے کے بجائے سر جھٹکا۔

"ایسا نہ کریں۔نور اور مونا کو بلا لیں؟" اس نے گھر کی خاموشی دیکھتے ہوئے کہا۔

"رہنے دو۔میکے آ کر ان دونوں کو جو پروٹوکول چاہیے جو کم از کم میں نہیں دے سکتی۔" امی توبہ کرتی صفائی والی کے لیے دروازہ کھولنے چلی گئیں۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔جنوری کی ٹھنڈی یخ ہوا چہرے سے ٹکرائی۔ساتھ کچھ اور بھی۔۔

دھیرے سے آنکھیں کھولنے پر اب وہ اکیلی نہیں بیٹھی تھی بلکہ صحن میں لوگ ہی لوگ نظر آئے۔۔

"مار دیے۔میرے سارے مور مار دیے۔ان کے چھوٹے چھوٹے بچے مار دیے۔کیسے شریف نے لا کر دیے تھے اتنے اتنے سے مور اور میں نے پالے پوسے۔۔ہاں یہ منحوس کرکٹ کھلا لو انہیں۔لیکن پانی نہ ڈالیں گے بے زبان جانوروں کو۔" امی کے ہندسے پر ان کی اماں نے غصے سے سامنے کھیلتی پلٹن کو دیکھا۔

لڑکوں نے کرکٹ کھیلتے بال دے کر دروازے پر ماری تو سیکنڈز میں رباب نے دیکھا امی کا چہرہ نظر آیا۔

"ہاں تم توڑ دو دروازہ ہمارا۔لگوا کر تم لوگ دو گے۔" نیا نیا گھر بنا تھا بڑے سارے سلائیڈنگ ڈور پر گیند نہیں لگی تھی رباب اور نور کے دل پر لگی تھی۔بلکہ ابو نے کہا بھی تھا کہ یہ دروازہ اتنا مضبوط ہے کہ اماں جتنی بھی لاٹھیاں ماریں، کبھی نہیں ٹوٹے گا۔پھر بھی۔

"آ جاؤ۔۔کھانا کھا لو۔پتا نہیں کون سی بجلی بھری ہوئی ہے ان لڑکوں میں،اسکول سے آتے ہی

یہ منحوس کرکٹ شروع۔'' چچی چھتے سمیت ہی باہر نکلیں اور اپنی اولاد پر چیخیں جن کے کانوں پر بلاشبہ جوں تک نہ رینگی۔

''ہاں، انہیں ماؤں نے منع کیا ہے اپنے بچوں کو کہ پانی نہ ڈالنا موروں کو۔ اس بوڑھی دادی کی بات نہ سننی۔'' لاٹھی کا شکار اب چچی تھیں۔ جنہوں نے کچھ بولنے کے بجائے صرف اماں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

''گندی نسل ہے ان سب کی۔ گندی۔'' وہ اور بھی کچھ بول رہی تھیں لیکن وہ اپنے گھر کی طرف آئی اسے کوئی آواز دے رہا تھا۔

''رباب۔ پانی دو۔'' اس کے جانے سے پہلے میمونہ عرف مونا کی آواز آئی تھی۔ ''لائی ابو۔''

''ہاں ابھی آواز آئے گی، دو گھونٹ چائے بھی بنا دو۔'' امی کے کہنے کی دیر تھی۔

''چائے بھی بنا دو۔۔ میں نماز پڑھ کے آتا ہوں۔۔ بس آدھا کپ ہی۔'' امی نے چلو کا اشارہ کرتے کچن میں قدم رکھا۔

''ان ہی کے آدھا کپ پانی اور دو گھونٹ چائے کی وجہ سے کھانے میں دیر ہو جاتی ہے۔'' ابو امی کو نظر انداز کرتے نماز پڑھنے چلے گئے۔ رباب نے دیکھا ان کے گھر میں کوئی آ رہا تھا۔

''چچی! دہی ہے آپ کے پاس'' پندرہ سالہ معاذ نے گھر کے اندر آتے امی سے پوچھا تھا لیکن جواب کے بجائے سوال کہیں اور سے آیا تھا۔

''کیا بنا رہے ہو تم لوگ؟'' للچائی آواز میں نور نے اس سے سوال کیا جسے یقیناً بھول گیا تھا کہ وہ کیا بنا رہے ہیں۔

''پتا نہیں...... میں تو کچن میں نہیں گیا۔''

''جھوٹا'' نور نے زور سے کہا۔ ''یہ ہمیشہ ہی بھول جاتا تھا کہ کیا بن رہا ہے ان کے گھر کیا بنا ہے۔''

''ہاں۔ جب دکان سے چیز منگوانی ہو گی تب یاد آؤں گا۔'' طعنہ مارتے وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

''ہاں ہے بیٹا دہی۔ آ جاؤ۔'' امی نے اسے فریج سے نکال کر دہی کا پیالہ پکڑایا۔

''دے جاؤں گا جب بن جائے گا تو ندیدی۔'' وہ منہ بنا کے جا رہا تھا کہ یہاں آنے سے اچھا تھا دکان سے لے آتا۔

''رباب باجی، کون سا نشہ کر کے بیٹھی ہیں۔ آپ کی امی اندر بلا رہی ہیں آپ کو۔'' پروین نے بدتمیزی سے کہتے اسے جھنجوڑا تو اس نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ پروین کی کلاس لگتی اس نے فوراً صفائی پیش کی۔

''جاؤ، میں آتی ہوں۔'' رباب نے گردن پیچھے کرسی پر ٹکاتے آسمان کی طرف دیکھا۔ سورج ندارد اور دھند ہی دھند۔ نظریں صحن کی طرف پلٹیں تو وہ خالی تھا۔ انسانوں سے، کرکٹ سے، اپنوں سے۔ کیسے ایک دن گھر خالی رہ جاتے ہیں۔ ایک ساتھ کھیلنے والے، خوشی غم منانے والے دنیا کے کئی کونوں میں بٹ جاتے ہیں۔

''رشتوں کے بدلنے پر افسردہ نہیں ہوتے۔۔ ان سب رشتوں نے ایک دن بدلنا ہی ہوتا ہے، چچا چچی کا ہو، کزن کا، بہن کا یا بھائی کا۔۔ سب ایک وقت پر بدل جاتے ہیں۔ یہ دنیا کا اصول ہے۔ تبدیلی ساکن چیزوں سے بہتر ہوتی ہے۔ جب ایسا وقت آئے تو آرام سے قبول کر لینا چاہیے۔''

کسی موقعے پر ابو نے ان بہنوں سے کہا تھا۔ دل نے نہ کیا ہو، دماغ نے کر لیا تھا۔ اس نے گھر کو دیکھتے ہوئے کسی آواز کو نام دینے کی کوشش کی تھی کیا یہاں ویرانی ہے۔۔ نہیں اس نے نفی میں سر ہلایا یہاں بس خاموشی ہے۔

''رباب سو گئی ہو کیا باہر یا فریز ہو گئی ہو۔'' امی نے سلائیڈنگ ڈور میں کھڑے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ جو سامنے صحن میں اکیلی دانہ چگتی چڑیا کو

دیکھ رہی تھی۔

"آ رہی ہوں۔" وہ کرسی گھسیٹتی اندر آئی۔

کاش موسم کی بدولت ہی چھٹیاں بڑھ جائیں۔ پہلے وہ بھی لاہور میں ہی رہتی تھی اور ماسٹرز کے بعد بھی یہی ارادہ تھا لیکن پیپرز دے کر گھر آئی تو دل نہیں مانا۔ اسے کسی کی بات یاد آئی۔

"بیٹیاں گھر کی رونق ہوتی ہیں بہو اچھی بھی ہو تب بھی وہ رونق اپنے بنائے گھر میں ہی لگاتی ہے ساس سسر کے گھر میں نہیں۔"

"گھر میں ہے کون۔۔ تمہاری آواز نہیں آتی تو ایسا لگتا ہے جیسے میں اکیلی ہوں۔ پتا نہیں کیوں اتنا بڑا گھر بنایا تھا تمہارے ابو نے۔۔۔ بیٹیاں اپنے گھروں کی ہو گئیں۔۔۔ بہو بیٹا کہیں اور جا بسے۔ کیا ضرورت تھی اتنا بڑا گھر بنانے کی۔۔۔ ہم نے تو بنایا ہی بنایا، باقیوں نے بھی محل بنا لیے۔ اور رہ کون رہا ہے یہاں؟" امی نے پیاز کاٹتے اسے دیکھا۔ آج کل انہیں گھر ہمیشہ سے زیادہ خالی لگ رہا تھا۔

"آپ کو کیا پتا کوئی رہتا ہے یا نہیں۔۔ کیا پتا نئے مہمان آ گئے ہوں۔" اس نے لہجے کو ڈراؤنا بناتے کہا۔

"کسی کو تو کیا خاک فرق پڑے گا ان مہمانوں سے۔ تم ہی بھٹکتی روح ہو۔ تمہارے پاس ہی نہ آ جائیں۔" ان کی بات پر وہ مسکرا دی۔

"چلیں اس بہانے آپ کو کمپنی مل جائے گی۔"

"امی، میں اپنی کتابوں کو دیکھ لوں اتنا عرصہ ہو گیا ہے دیمک ہی نہ لگ جائے۔" اس نے اپنے بند کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ کبھی تینوں اسی کمرے میں رہتی تھیں اور پھر وقت نے گلاب ہٹا کر ٹہنیاں پکڑا دیں، دونوں بڑی بہنیں اپنے گھر، بھائی بھابی اپنے گھر، ابو بہت خوب صورت جگہ پر، باقی امی اور وہ ایک ہی کمرے میں رہ لیتی تھیں۔ شاید اسی لیے اللہ نے اسے پانچ سال کے وقفے سے بھیجا تھا۔

"ہاں جاؤ پر سو نہ جانا۔ آواز تو آتی رہے۔"

کمرے کی بتی جلاتے اس نے صاف کمرے کو دیکھا، کبھی اس کمرے میں کتابیں، بیگ اور جا بجا کپڑے پڑے ہوتے تھے۔ نور کے ہوتے ہوئے صفائی۔ ناممکن!

"اس نے لائٹ بند کی اور واپس کچن میں چلی گئی۔ اسے یقین تھا آگے بڑھ گئی تو لازمی کسی کو پانی کا جگ پھینک کر جگانا پڑے گا۔

"واپس کیوں آ گئیں؟"

"پھر کبھی سہی۔" اسی اثنا میں لائٹ چلی گئی وہ دونوں اف کہہ کر رہ گئیں۔

"اب اندھیرے میں کھانا پکاؤ۔" دو بج رہے تھے پھر بھی دھند کی وجہ سے اندھیرا سا تھا۔

"شکر کرو، ٹرانسفارمر نہیں پھٹا۔" امی کے کہنے پر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ روایت عید پر پوری ہو گی۔"

"کہاں اب نہیں پھٹتا یہ ٹرانسفارمر۔ پچھلے سال دونوں عیدوں پر کوئی بھی نہیں آیا۔ اب کی دفعہ بھی کوئی نہیں آئے گا۔ ہاں ہر کسی کے سو کام تھے۔ کام جو ہمارے لیے ہر تہوار اور ہر انسان، ہر رشتے سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔"

"یاد ہے ایک عید امی۔۔۔ جب ٹرانسفارمر پھٹا تھا اور ہم پوری رات باہر سوئے تھے۔ ریحا ایک سال کی بھی نہیں تھی۔"

"ہاں وہ عید جب شاید آخری دفعہ سب اکٹھے ہوئے تھے۔ جولائی کی گرمی۔ چاروں گھروں کے سارے اے سی چلے ہوئے تھے ایسی کوئی بتی بھی نہیں ہو گی جو بند ہو۔ ساری دوپہر گوشت بانٹنے اور سنبھالنے کے بعد جیسے ہی شام کو اے سی والے کمرہ کا رخ کیا ٹھاہ ٹھاہ اور ٹھاہ۔ گھر کے قریب والے ٹرانسفارمر نے اوقات دکھا دی۔ دعا کی شاید نہ پھٹا ہو پر نہیں۔ ادھر ادھر بجلی والوں کو فون کیے گئے۔ جواب ملا چھٹی کے باعث کوئی مدد نہیں ہو سکتی۔ اصل میں کسی حوالے کے بغیر اس ملک میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ دوسرے نمبر ملائے گئے تو صبح سات بجے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

وہ ساری رات انہوں نے باہر گزاری تھی چارپائیوں پر یو پی ایس سے چلتا ایک پنکھا اور دس لوگ، باقی اپنی چھتوں پر۔ اس رات جتنے ستارے ٹوٹے، وہ سب گنے گئے تھے یعنی امر ہوئے۔ صبح کسی طرح دماغ لگا کر علی نے کولر چلایا اور شبین چچی نے لسی بلائی۔ فریزر میں رکھے گوشت، بازار سے منگوائی گئی برف سے اسٹور کیے گئے۔ مکھیاں، جون کی گرمی، قربانی کے خون کی بدبو لیکن پھر بھی ویرانی کہیں نہیں تھی، اکیلاپن مفقود تھا۔

''شکر ہے، آ گئی لائٹ۔'' امی بیڈ سے اٹھتی کچن میں دوبارہ چلی گئیں تو وہ اٹھ کر اسی کمرے میں چلی آئی جہاں کتابوں کے ساتھ تصویروں کا ڈھیر تھا۔

اس نے پہلی تصویر پکڑی۔۔چودہ اگست 2015، دل سے منائی گئی چودہ اگست۔۔موٹا کا بنایا چھوٹا سا کیک اور پچیس لوگ ذبح کرنے کو تیار۔۔دوسری تصویر 12 جولائی 2013۔ بڑی عید کی تصویر۔ لال اینٹوں والا صحن اور انگلیوں سے وی بناتے کزنز۔ 8 مئی 2010۔ امی ابو کی اینورسری پر کیک کاٹتے تصویر۔۔دونوں کا مخصوص جملہ کہ کیا ضرورت تھی لیکن لبوں پر مسکان۔۔، بہنوں اور بھائی کی شادی کی، کزنز کی، اسی صحن میں لی گئیں لاتعداد تصویریں۔

اس نے ان تصویروں کو ویسے ہی بکھرے رہنے دیا۔ نیچے والے شیلف میں رباب کی لاتعداد پھٹی ہوئی کہانیاں تھیں جو نور نے غصے میں آ کر پھاڑ دی تھیں۔

وہ اٹھ گئی۔ کپڑا لے کر ساری کتابیں جھاڑیں، صفائی کی اور یادوں کی پٹاری کو بند کر کے آ گئی۔

☆☆☆

''آج پھر سبزی والا نہیں آیا۔۔پھر دال۔ جس دن آپ کے چہیتے بچے آئیں گے تو من و سلویٰ نازل ہو جانا ہے امی۔۔میرے لیے سبزی بھی نہیں صرف دال'' اس نے دال کو دیکھ کر منہ بنایا۔ کل کچھ بنا نہیں تھا اور آج دال۔

''میرا دل چاہ رہا تھا۔۔اور اچھی بنے گی دیکھنا تم۔'' امی نے تڑکے کا سامان نکالتے کہا۔

''ہاں بڑی باجی! میں خود حیران ہوتی ہوں۔۔آپ کی سبزی، دال سب اچھا بنتا ہے۔'' پروین جو باہر کپڑے دھو رہی تھی اندر آتے ہوئے بولی۔

''ہاں اس کے ابو بھی یہی کہتے تھے۔''

''ہاں ہم سے کہتے تھے اپنی ماں سے سیکھو۔ دال، سبزی، گوشت سب اچھا بناتی ہے۔'' رباب یاد کرتے ہوئے بولی۔

''باجی آپ نے پھر بھی نہیں سیکھا۔'' پروین نے ہاتھ مار کر مذاق اڑایا۔ امی بھی ہنس دیں۔

''جس دن بریانی بناؤں گی میں، اس دن تمہاری شکل نظر نہ آئے پروین۔'' رباب جل کے کہتی کمرے میں چلی گئی۔ جب تک پروین تھی امی نے اس کے ساتھ خوش رہنا تھا۔ وہ سو سکتی تھی۔

☆☆☆

دھند نے چھٹیاں بڑھوا دی تھیں۔ اس لیے پیر کے دن بھی وہ کتاب اور کرسی لیے صحن میں آ کر بیٹھ گئی۔ آج سورج آ جا نہیں رہا تھا بلکہ شرمندہ سا کھڑا تھا۔ سارا زور اس سورج کا بھی گرمیوں میں ہی چلتا ہے۔ سورج کے بعد اس نے صحن میں دیکھا۔

آنکھیں بند کر کے کھولیں تو آج پھر بہت سے لوگ تھے۔ صبح کے آٹھ بجے تھے لیکن صحن میں کھڑے لوگ چوکنا تھے۔

''میری بوگن ویلیا کی بیل کٹوا دی اس وحید نے اپنی شادی کی لائٹنگ کے چکر میں۔۔اللہ پوچھے گا اسے، ستیاناس کر دیا۔ روز پانی دیا اپنی بیل کو۔ میرا نقصان کر دیا۔'' اماں کے واویلے سے تنگ وحید سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''ساری نہیں کٹوائی تھوڑی سی کٹوائی ہے دوبارہ اگ آئے گی۔'' وہ دنیا سے تنگ کھڑا تھا۔ جب سے سب سے بڑے تایا نے اپنا گھر مرمت کروانا شروع کیا تھا یہ تماشا روز کا تھا۔ کبھی اماں اپنی

بڑی بہو سے لڑتی دکھائی دیتیں کبھی ان کے بچوں سے اور تو اور مزدوروں کے لیے بددعائیں کوسنے تیار تھے۔

"تیری تھی وہ بیل؟ تو نے پانی دیا۔" اپنی لاٹھی زمین پر ماری وہ دھاڑی تھیں۔ جتنی ایکٹو اماں اسی سال کی عمر میں تھیں ان کے پوتے پوتیاں اپنی جوانی میں بھی نہیں تھے۔

"دوبارہ آجائے گی۔ مجھے معافی دے دو" وہ شور شرابے سے بیزار اپنے اوپر والے پورشن میں جانے لگا۔

"غرور۔ غرور آگیا ہے اسے، ماں نے سکھایا دیا ہے اسے۔ کیا بری گھڑی تھی جب میں اس عورت کو لے کے آئی۔ اور یہ وحید اس کی نوکری ختم ہوگی تب دیکھیو، کیسے سیدھا ہوگا یہ۔ دماغ خراب ہوگیا ہے اس کا۔۔ میری بیل کٹوادی۔" صحن میں صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور شور۔

"بس کردیں اماں۔" شاید کسی چچا کی آواز آئی تھی اور ان کی شامت بھی۔

"تو بھی کھا گیا سارے گھر کو۔۔ سارے بھائیوں کا حصہ تھا اس زمین میں۔۔ تو نے بیچ دی اور کسی کو پیسے نہیں دیے۔" آگے بہت سے القابات سے نوازا جارہا تھا۔

"نہ تو بولتی رہ اماں۔۔ ان کے پیچھے ہی لگی رہ۔۔ میری جان چھوڑو۔" چچا غصے میں بولتے چلتے بنے۔

"آپ نے ضرور کچھ بولنا تھا۔۔ اب بڑی باجی کی فیملی کو چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگ جائیں گی۔ اور تو اور چھوٹی بہن آرہی ہے آج آپ کی۔" چچی نے پریشانی سے سرہلایا۔

اس گھر کے مردوں میں تو ذرا حوصلہ نہیں تھا اپنی ہر وقت بولتی ماں کو یا بہن کو برداشت کرنے کا۔ یہ ان کی بیویاں تھیں جنہوں نے سارے گھر کو ایک بھی کرکے رکھا اور سب کی سنی بھی۔ کہتے ہیں مرد برا ہو تو چار دیواری خراب کرتا ہے اور اگر عورت بری ہو تو چار نسلیں۔۔ لیکن اگر عورت اچھی ہو تو چار کیا سات نسلیں سنوار دیتی ہے۔ کسی کو بھی یہ کہنے میں کوئی گریز نہیں تھا کہ اگر یہ چار بھائی اتنے سالوں سے اکٹھے رہ رہے تھے اور گھر میں بلاوجہ کی بدمزگی نہیں تھی تو اس میں گھر کی عورتوں کا بہت ہاتھ تھا۔

"اب انہوں نے آکر شکایت کرنی ہے کہ تم سے ایک میری ماں نہیں سنبھالی جاتی، خود دو گھنٹے نہیں بیٹھتی کہ میری توبہ۔" ناشتہ بناتے چچی کی زبان سیاس کے اثر کی بدولت تیز چل رہی تھی۔ لیکن خیر یہ وقتی ابال تھا۔

"یار! ناشتہ دے دو آپ، ماما بعد میں برائیاں کرلینا۔" وردہ نے جلدی جلدی کتابیں بیگ میں رکھتے ہوئے۔

"سر میں درد ہوگیا ہے۔ کیا ضروری ہے ان سب کا اونچی آواز میں بولنا۔ صبح کے آٹھ بج رہے ہیں، کوئی جاکے ان سب کو بتادے۔" نور نے کانوں پر تکیہ رکھتے چیخ کر کہا تھا اور چیخ تکیے سے باہر نہیں آئی تھی۔

رباب نے دیکھا منظر بدلا تھا۔ اب رات کا وقت تھا۔

بیڈمنٹن کھیلا جارہا تھا۔ صحن کے درمیان میں چارپائی تھی اور دونوں اطراف میں حرا اور مونا ریکٹ لیے کھڑی تھیں۔ نور، رباب، وردہ اپنی باری کے انتظار میں سیڑھیوں [illegible] بیٹھی تھیں۔ لیکن حرا اور مونا کو دیکھ کر لگتا تھا، اگلی [illegible] صدی تک وہ یہ جگہ چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔

ایک کا بھی فاؤل ہوتا تو آواز آتی۔

"ہوا۔۔ ہوا کی وجہ سے ہوا ہے۔" جب کے نیم کے درخت کے پتے بھی ساکن تھے۔

"دوسرے کا ہوتا تو"

"[illegible] ہلی تھیں نا۔ ڈسٹرب کردیا۔ دیکھا تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔" پھر آخر کار شٹل نیم کے درخت پر اٹک گئی تو اس سے پہلے ان تینوں کو مورد الزام ٹھرایا جاتا وہ تینوں اٹھ کے اپنے اپنے پورشنز

میں واپس جا رہی تھیں۔

"رباب باجی۔۔۔ سچ میں بتائیں، کالج میں کوئی افیم بیچتا ہے کیا؟ اور آپ اس کی خریدار ہیں" پروین اس کے سر پر کھڑی چیخی تھی۔

"ایک تو یہ پروین۔" رباب جتنا برا منہ بنا سکتی تھی بنا کے اسے دیکھا۔

"اور تم موت کا فرشتہ ہو، جو ہر وقت میرے سر پر منڈلاتی ہو۔" رباب کرسی سے اٹھ کر اندر جانے لگی کہ امی نے بلایا ہوگا اور یہ میڈم آواز دیتی یہاں آ گئی ہے۔

"کدھر جا رہی ہیں۔ آپ کی امی نے تو نہیں بلایا، میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔" اسے اندر جاتے دیکھ کر پروین ہنسی نکال کر بولی۔ رباب بس مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی۔

"اب تم مجھے صحیح بتاؤ، تم نے خریدنی ہے افیم؟ کب سے لے رہی ہو تم؟" پروین رفو چکر ہو گئی۔

وہ اندر گئی تو امی فون پر بات کر رہی تھیں شاید مونا کا فون تھا، اسے ہر دس منٹ بعد اپ ڈیٹ دینے کا بہت شوق تھا۔

☆☆☆

کمرے کے بیڈ پر چت لیٹے اس نے سوچا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اور پھر وہ ایک دم اٹھی تھی۔

"چلو آؤ پروین! یہ تینوں گھر کھولتے ہیں۔ کبھی چوہے رہ رہے ہوں۔ سال ہونے والا ہے سب بند ہے۔ آج اتنا اچھا سورج ہے۔۔۔ کھڑکیاں دروازے کھولتے ہیں۔" رباب نے پروین کو کہا جسے کام کا سنتے ہی موت آ گئی تھی۔

"باجی! بس کریں۔۔۔ جھوٹ نہ بولیں۔ گرمیوں میں تو سارے گھر صاف کیے تھے۔"

"اور اب کیا ہے؟ سردیاں میڈم!" رباب چابیاں پکڑتی چھوٹے چچا کے پورشن کی طرف آئی۔

"دھیان سے کھولنا۔" امی بھی پیچھے ہی آ گئیں۔

اس نے دروازہ کھولا تو مٹی نے استقبال کیا۔۔۔ مٹی تہہ در تہہ مٹی۔ کیا شوق سے بنائے گئے گھر سب اسی طرح چھوڑ جاتے ہیں؟ ہاں شوق کا اتنا ہی مول ہوتا ہے بس!

"رک جاؤ ابھی کچھ نہیں کرنا۔ پہلے سارے گھر کھولیں گے پھر اکٹھے صفائی کریں گے۔" پروین جھاڑو پکڑنے لگی تو رباب نے روک دیا اور خود تصویریں اور ویڈیو بنانے لگی۔ کمروں کو کھولتے مٹی سے بھرے سامان کی۔ سفید کپڑا تھا اور پر پھر بھی مٹی ہی مٹی۔

'باجی چوہا۔۔۔ چوہا' پروین نے چیخ ماری تو رباب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس چوہے کی بھی تصویر بنائی۔ جو پروین کی چیخوں سے ڈر کے سہما سا بیٹھا سوچ رہا تھا یہ انسان کہاں سے آ گئے۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" پروین کی آنکھیں باہر آ گئیں۔

"پیارا لگ رہا ہے۔" اس کے ہاتھ سے جھاڑو نیچے گر گئی اور اس کی رباب باجی ہر مٹی سے اٹی چیز کی تصویر بنا رہی تھیں۔ کہیں چھپکلی تھی تو اس کی بھی ہزار پوز سے تصویر بنائی گئی۔ باری باری تینوں پورشنز کھولے گئے۔ تصویریں بنیں اور واٹس ایپ کر دیں۔

"بڑی باجی! میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ آپ کی بیٹی کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔ شادی کر دیں۔ کوئی نشہ وشہ کا چکر ہے۔" پروین امی کے کان میں گھسی ہوئی تھی۔

"چلو، اب سارے دروازے بند کر دو۔ ہم کیوں کریں صفائی؟ جن کے گھر ہیں وہی کریں گے۔" امی نے غصے سے اس سر پھری لڑکی کو دیکھا۔ پروین نے تو شکر کا کلمہ پڑھا۔

"تم نے یہ کھولے کیوں تھے رباب! کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ یہی ہے امی۔۔۔ مکان بنا کے ہمارے

سروں پر چھوڑ دیے ہیں انہوں نے۔ یہ عمارات۔ دم گھٹتا ہے۔۔ کبھی تو چکر لگا کر دیکھا کریں ان کا حال۔ ان کے ماں باپ ملنے جاتے ہیں، اپنی اولادوں سے لیکن ان سے نہیں ہوتا کہ کبھی یہاں آ کر مل لیں۔ یا اپنے مکانوں کو دیکھ لیں۔ بیچ دیں انہیں آ کر۔ انسانوں پر گھروں کا بھی حق ہوتا ہے۔" امی اس کے فلسفے پر ہیں ہیں کرتی رہ گئیں۔ اس پر یہ دورہ سات سالوں میں پہلی دفعہ پڑا تھا۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے، ان کے گھر ہیں۔۔ وہ بیچیں نہ بیچیں، رہیں نہ رہیں۔" امی نے تپ کر اسے دیکھا۔

"اور آپ کی بیٹیوں کو، بیٹے کو ذرا شرم نہیں آتی۔ کبھی آ جائیں مل لیں۔ اتنی بھی کیا مصروفیت۔" اب توپوں کا رخ بہن بھائیوں کی طرف تھا۔ وہ پانچ سال چھوٹی تھی اپنی بہنوں سے۔۔ آخری اولادیں اکثر اکیلی ہی رہ جاتی ہیں۔

اسی وقت اس کا فون زوں زوں کی آواز سے ہلا تھا۔

"یار! صفائی کروا دو، کتنا برا حال ہو رہا ہے۔" معاذ کا فوراً میسج آیا تھا۔

"ملازم ہیں ہم۔۔ خود آ کر کر لو۔" اس کا بھی کھٹ سے میسج گیا تھا۔ اسی طرح وہ لگاتار سب کو جواب دیتی رہی تھی۔

"ہوم فار سیل" بڑے کزنز کو تمیز کے دائرے میں رہتے ہوئے تصویریں بھیجی گئی تھیں۔ سب کے گھر تھے، سب کی ذمہ داری تھی۔ چار دیواری کھڑی کرتے ہو تو ان کا جواب بھی آپ نے دینا ہے۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"اس لڑکی کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے جب سے چھٹیاں ہوئی ہیں۔ پتا چلا گھر میں اکیلے رہ کے کیسا لگتا ہے۔" امی کا لیکچر ہر وقت تیار تھا۔ انہیں ہنسی بھی آ رہی تھی اور کہیں امید بھی تھی کہ شاید کوئی آ جائے۔

☆☆☆

سردیاں ختم ہو گئی تھیں۔

صبح اٹھتے کے ساتھ اس نے آس پاس دیکھا تھا۔ کمرے میں سورج کی روشنی تھی، امی نے ہمیشہ کی طرح سارے پردے جو ہٹا دیے تھے۔ اس نے کروٹ بدل کر کھڑکی سے باہر غور کیا۔ صحن میں لگے تینوں درختوں کے پتے واپس آ گئے تھے۔۔ موسم بہار۔

فون دیکھا 23 مارچ۔۔ چھٹی کا دن۔ واٹس ایپ کھولا شاید کسی کا میسج آیا ہو کہ ہم گھر کی صفائی کرنے آ رہے ہیں۔ لیکن ندارد۔ اب تو اس نے امید بھی چھوڑ دی تھی اور ان کے گھروں کو ان کے حال پر۔ دوبارہ صحن کی طرف رخ کیا۔ اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ غور سے دیکھا تو صحن میں فرنیچر پڑا تھا۔ وہ دھول میں اٹا تھا نہ گندا شاید امی دھوپ لگوا رہی تھیں۔ اب کی دفعہ اس نے پروین کے ساتھ مل کے قسم کھائی تھی کہ کوئی ان گھروں کی صفائی نہیں کرے گا۔ پر امی بھی نا۔

وہ غصہ پیتی اٹھی اور کمرے سے باہر نکلی۔ پاؤں میں کوئی چیز آئی تھی جسے ٹھوکر سے پیچھے پھینکتی وہ کچن میں گئی پانی پیا اور کچھ سوچتی واپس اس چیز کو دیکھنے کے لیے لاؤنج میں آئی جسے بے دردی سے ہٹایا تھا۔ وہ ایک لال فش نما کھلونا تھا اور اس کھلونے کے حق دار آنکھیں چھوٹی کیے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کا بھتیجا آریان اور بھانجا ابراہیم تھا۔ صحن میں آوازیں ہی آوازیں تھیں۔ سلائیڈنگ ڈور کے قریب جاتے اس نے پریشانی سے باہر دیکھا تھا۔

"اتنا گندا گھر ہو رہا تھا۔ شکر ہے ہم آ گئے۔ کبھی کبھار تو چکر لگانا چاہیے سب کو۔" تائی زرمین، زرین چچی سے اپنے دروازے میں کھڑی بات کر رہی تھیں۔

"صحیح کہہ رہی ہیں آپ! لیکن بس بچوں کو

وقت ہی نہیں ملتا ورنہ یاد تو یہ لوگ بھی کرتے ہیں۔" زرمین نے سارے گھر کو دیکھتے کہا۔

"یار باربی کیو اچھا ہونا چاہیئے۔۔اور صحن میں کچھ لائٹس کا بھی انتظام کروا لو۔" لڑکے صحن میں کھڑے پلاننگ کر رہے تھے۔ اس نے گیٹ سے سب سے چھوٹی چچی کو اونچی آواز میں سلام کرتے آتے دیکھا۔

"رباب! کیا حال ہے؟" سلائیڈنگ ڈور سے ناک لگائے اسے اپنا نام سنائی دیا تو کھول کر باہر نکل آئی۔

"ویلکم ٹو ہوم" ہنس کر سب سے کہتے اکٹھے سلام کیا تھا۔

"تم نہ کراؤ صفائی، آ گئے ہم خود۔"

"ہاں صفائی ہی کروانے آئے ہیں آپ لوگ"

☆☆☆

باربی کیو کی خوشبو، لائیٹس۔ اس نے صحن میں دیکھا، وہ بھرا ہوا تھا۔ سارے گھروں کی بتیاں روشن تھیں۔ اس کی بہنیں، بھابی بھائی، ان کے بچے، کزنز ان کی بیگمات، چچا تایا سب وہاں جمع تھے ہنس رہے تھے بول رہے تھے۔ گھر کے مکین گھر کو گھر بناتے ہیں اور جب مکین ٹھکانا بدلتے ہیں تب بھی پیچھے رہتا گھر انہیں لازمی یاد کرتا ہے۔

"بس ٹرانسفار مر نہ پھٹے۔" حرا نے اونچی آواز سے دعا کی جس پر سب نے دل سے آمین کہا۔ اور اس نے سوچا تھا چلو ابھی تو موسم اچھا ہے پھٹ بھی جائے تو خیر ہے۔

کرسی کے بجائے چارپائی پر بیٹھتے بڑے بھائی کہہ رہے تھے۔

"ہاں، اب کوشش کریں گے مہینے دو مہینے میں سب مل کر چکر لگا لیا کریں۔" رباب نے سوچنے کی کوشش کی، شاید یہ وعدہ پہلے بھی کبھی ہوا تھا۔

"چاہے ہم آتے نہیں ہیں پھر بھی یہ کتنا اچھا احساس ہوتا ہے نا کہ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم شہر کی شورش، کام سے تھک کر واپس لوٹ سکتے ہیں، آرام کر سکتے ہیں، جسے ہم گھر کہہ سکتے ہیں۔ جہاں ہم سب ایسے ہی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ اٹس آ گڈ فیلنگ۔"

احمر نے ہو سکتا ہے یہ جملہ کسی سے سنا ہو، یا اس کا اپنا ہو لیکن وہاں بیٹھے ہر شخص کے احساسات کی عکاسی کرتا تھا شاید اسی لیے اس کے فلسفے کا مذاق نہیں بنایا ان سب نے۔

رباب سوچ کر ہنس دی۔ چلو بہار کے موسم پر اتنا تو فرض تھا کہ چند دن کے لیے سہی اس صحن کے لوگ اسے لوٹا دے۔

مگر......

"اس زمین میں میرا حصہ بنتا تھا۔ آپ نے وہ ایسے کیسے بیچ دی۔" چچا کی آواز آئی۔

"میرے اتنے خرچے ہیں۔ میں تو سوچا بیٹھا تھا وہ بیچوں گا۔" درمیانے والے بھی بولے۔

"میرا حصہ تو چاہیے مجھے، آپ ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ اپنا یہ والا پورشن دے دیں۔"

"ریحان نے تو اپنا پورشن بناتے ہوئے صحن کا بھی اتنا حصہ شامل کر لیا تھا اس لیے زیادہ حق میرا ہے۔"

"میں کیوں دوں تمہیں۔ حصہ۔ پہلے بھی آپ نے وہ والا بھی نہیں دیا تھا۔ میرا خرچا پورا نہیں ہوتا۔ میرا بھی نہیں ہوتا۔

نہیں بڑی بہو تو بہت اچھی ہے پر چھوٹی والی جو ہے باجی اس کا نہ پوچھیں۔ امی باربی کیو نہیں کھانا مجھے۔ میرے بچے تو یہ پانی ہی نہیں پیتے۔"

طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر بھی اس سب کے باوجود ہاں۔۔ لوگ تو اپنے ہیں اور گھر تو گھر ہوتا ہے نا۔

رباب اپنا پانی کا گلاس بھر کر گہرا سانس لیتی اٹھی۔ اتنا شور توبہ!

☆☆

سنیعہ عمیر

ہاڑی کدہ

مکمل ناول

فواد ایک متوسط گھرانے کا نوجوان، باپ ایکسیڈنٹ میں ٹانگوں سے معذور ہو جاتا ہے حالات اس نہج پر آ جاتے ہیں کہ سب گھر والوں کو زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ فواد مکان بیچ کر باپ کا علاج کروانا چاہتا ہے۔ وہ منع کر دیتے ہیں۔ شاہد گیلانی اپنی بیٹی راحین کے ساتھ گیلانی ہاؤس میں رہتے ہیں۔ راحین فہد کی یونی فیلو ہے۔ شاہد گیلانی کی بیوی کینسر کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ راحین یونی ورسٹی میں اچانک گرتی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جانے پہ اس کے کچھ ٹیسٹ ہوتے ہیں رپورٹ آنے پہ پتا چلتا ہے کہ اسے اسٹیج ٹو بریسٹ کینسر ہے۔

دوسری قسط

میری ماں نے دو سال ہر طرح سے اپنی بیماری سے مقابلہ کیا تھا لیکن ان کی زندگی تو اس ہی لمحے ختم ہو گئی تھی جب انہوں نے علاج شروع کروایا تھا۔ وہ آئینے سے نظریں چراتی تھیں۔ تکلیف سے راتوں کو جاگتی تھیں ان کی آنکھوں میں موت کا انتظار رہتا تھا۔ میرے پاس برائٹ سائیڈ دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔" اس کے خوف کی وجہ لبوں پر آئی تھی۔

"نوشابہ کی تشخیص بہت ایڈوانس اسٹیج پر ہوئی تھی۔ بیماری پھیل چکی تھی۔" شاہد گیلانی نے ٹیبل پر نگاہ گاڑ کر کہا۔ "یہی بات آپ میری طرف دیکھ کر کہتے تو اچھا ہوتا۔ ابھی میرا مرض صرف رپورٹس تک محدود ہے تو آپ مجھ سے نظریں نہیں ملا سکتے۔ جب یہ مرض میرے جسم کے ہر حصے میں نظر آئے گا تب آپ مجھے کیسے دیکھیں گے؟" وہ باپ سے بھڑنے لگی۔

"اب علاج بہت ایڈوانس ہو گیا ہے۔ سرجری اور کیمو کے بعد آپ کو اورل میڈیسن پر شفٹ کر دیں گے۔ علاج سے مت گھبرائیں۔ بال واپس آ جاتے ہیں زندگی واپس نہیں آتی۔" ڈاکٹر نے پھر سائنس کا سہارا لیا۔

"میری ماں نے میری طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ انہیں میری آنکھوں میں اپنا بیمار جسم نظر آتا تھا۔ ان دو سالوں کے بجائے ہم تینوں کو صرف چھ ماہ یا چھ ہفتے ہی پارل مل جاتے تو آج میرے باپ میں اتنی ہمت ہوتی کہ بڑھ کر میرے آنسو پونچھ سکتا۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں میں کسی قسم کا علاج نہیں کرواؤں گی۔ زندگی جتنی رہ گئی ہے۔ اس کو ایسے ہی جیوں گی جیسے اب ہے۔" راحین نے جھٹکے سے اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالا اور اٹھ کر جانے لگی۔

شاہد گیلانی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بہت دقت سے آنکھیں اٹھا کر اپنی نگاہیں اپنی بیٹی کی صورت تک لے گئے۔ وہ نڈھال تھے۔ چند دنوں میں ان پر ان کی اصل عمر دکھنے لگی تھی۔ وہ دنیا کے باقی معاملوں میں دماغ کے کھلاڑی تھے۔ صرف راحین کے معاملے میں ان کا دل داؤ پر لگ جاتا تھا۔

"نوشابہ کے کیس میں ڈاکٹرز پرامید نہیں تھے۔ مگر اس نے تمہاری اور میری خاطر علاج کی تمام تکلیفیں سہیں۔ کیا تم میری خاطر ڈاکٹر کی بات نہیں مان سکتیں؟ تمہارے کیس میں تو ڈاکٹر پرامید ہیں۔ میں تمہیں ٹھیک دیکھنا چاہتا ہوں۔" ان کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو آپ کو میرے فیصلے کو ماننا ہوگا۔ مجھے جانے دیں۔" اسے اپنی

بات منوانے کی بہت بری عادت تھی۔
شاہد گیلانی نے ڈرتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑا۔ انہیں بھی رامین کی ہر بات ماننے کی عادت تھی۔ رامین دوست کمرے میں رہی۔ کمرے کے دونوں مرد اب بیٹھے تھے۔ پھر وہ کلینک سے بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔ "ان کی بیماری سخت سہی مگر قابل علاج ہے اور یہ علاج بھی کوئی ناقابل برداشت نہیں جو وہ اتنا ڈر رہی ہیں۔ ویسی تکلیف کسی کو نہیں ہوتی۔" ڈاکٹر نے چشمہ اتار کر آنکھیں میچیں۔
"میں نے اس کو کبھی ذرا تکلیف بھی نہیں ہونے دی۔" شاہد گیلانی نے بتایا۔
ڈاکٹر اور مریض کے رشتے میں اعتماد لازم تھا۔ یہ کیس رامین کا بھروسہ جیتنے کا تھا۔ "اسے تھوڑا وقت دیں۔" شاہد گیلانی نے پروفیشنل انداز میں کہا۔
"مسٹر شاہد میں خود بات کروں گا۔ جب یہ مرض پھیل جائے گا۔ تو رامین خود علاج کے لیے آ جائیں گی۔ لیکن تب ٹھیک ہونے کے کتنے امکانات ہوں گے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ڈاکٹر الیاس اب دل کی کہہ رہا تھا۔
"میں اس کو سمجھاؤں گا۔" شاہد گیلانی نے کہا۔
ڈاکٹر الیاس کا آدھا دن دوسروں کو تسلی دیتے گزرتا تھا۔ اس لیے جب اسے جھوٹی تسلی دی جاتی تھی تو وہ فوراً پہچان لیتا تھا۔ شاہد گیلانی کی بات ایک جھوٹی تسلی کے سوا کچھ نہیں تھی۔
"آئی ایم سوری لیکن آپ ان باپوں میں سے ہیں ہی نہیں جن کی اپنی اولاد کے سامنے چلتی ہو۔ آپ نے اپنی بچی کی ہر فرمائش اس کے کہنے سے پہلے پوری کر کے اس میں لڑنے کی صلاحیت پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ اس کے سامنے نہ جینے کا مقصد ہے نہ کھونے کا خوف۔ ان کی سب سے بڑی کامیابی آپ کی بیٹی ہونے کے علاوہ ان کی خوب صورتی ہے۔ جس کو اس علاج سے خطرہ ہے۔ اس لیے وہ کسی صورت بھی اپنی خوبصورتی نہیں کھونا چاہتیں۔"
شاہد گیلانی کے پرورش کے طریقہ کار کو بھی علاج کی ضرورت تھی۔
"اس کی لائف بیسٹ ہے۔ جو لوگوں کے تصور میں بھی نہیں ہے۔ وہ سب اس کی گرفت میں ہے۔ کوئی بھی یہ سب حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔" شاہد گیلانی نے ایک پین مضبوطی سے پکڑتے ہوئے رعونت سے کہا۔ "ان کو دوبارہ میرے پاس بھیجیں۔ میں انہیں کینسر کے مرض سے زندہ بچ جانے والے مختلف لوگوں سے ملواؤں گا۔ انہیں صرف ذہنی جنگ جیتنی ہے۔ باقی بازی آسان ہے۔" الیاس نے ٹھنڈے انداز میں کہا۔
شاہد گیلانی چپ رہے۔
"یہ بیسٹ لائف ان کا گول نہیں ہے ان کی روٹین ہے۔ اسے لگتا ہے علاج سے اس کی یہ بیسٹ لائف ختم ہو جائے گی۔" الیاس نے تسلی سے سمجھایا۔
شاہد گیلانی کے ہاتھ میں موجود پین تھم گیا۔ وہ سوچ نہیں رہے تھے بکھر رہے تھے۔
"بہتر ہے کہ آپ اپنی بیٹی کے لیے اس دنیاوی زندگی جینے کا کوئی مقصد ڈھونڈیں۔ پھر اس مقصد کو ان کے سامنے لا کھڑا کریں۔ کچھ کھونے کا خوف نہ ہو تو زندگی سے محبت نہیں ہوتی۔" ڈاکٹر کی بات سن کر شاہد گیلانی گہری سوچ میں چلے گئے۔ ان کی انگلیوں میں پکڑا پین ان کی سوچ کی رفتار سے ہلنے لگا۔

٭٭٭

سعد بائیک کی چابی گھما رہا تھا۔ زارا بال کھول کر بکھرے کپڑے پہن کر آئی تھی اور اب ٹیبل سے چمچہ اٹھا کر آئینے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اپنی لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی۔
"ان میں سے کون سے اچھے ہیں؟" مائرہ کمرے سے ایک ہاتھ میں گھنگھرو والے آویزے اور دوسرے میں نگوں والے جھمکے لے کر زارا کے پاس آئی۔
سعد کی چیخ نکلتے نکلتے بچی۔
"اتنا تیار کیوں ہو رہی ہو؟ ایسا لگے گا میں بندریوں کا تماشا دکھانے لایا ہوں۔" سعد نے ان کے کپڑوں کے رنگ گنے۔ اسے دونوں چم چم والے

زرد بے جیسی لگ رہی تھیں۔

"گھومنے جا رہے ہیں تیار تو ہوں گے۔ البتہ لوگوں کو تمہاری شکل دیکھ کر بندر یاد آ جائے تو ہمارا کیا قصور ہے؟" زارا مائدہ کے کانوں میں بندے ڈالتے ہوئے بولی۔

"امی سعد کو سمجھائیں۔ ہمیں تنگ کر رہا ہے۔" مائدہ نے ماں کو آواز دی۔

سائرہ چٹیا بنا کر ایک رنگ کا سوٹ پہنے پرس میں موبائل ڈالتے ہوئے آ رہی تھی۔ سعد کی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑی۔

"سائرہ آپی کو دیکھو۔ ایسے تیار ہوا کرو۔" سعد نے ویری گڈ کا اشارہ کیا۔

"کیوں کیا ہم نے سرکاری چینل پر خبرنامہ پڑھنا ہے؟" زارا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

سائرہ نے ہلکے رنگ کا اچھا ہلکی کڑھائی والا سوٹ پہنا تھا۔ مگر دوپٹہ پرانی نیوز کاسٹرز کی طرح دوہرا کر کے گلے میں ڈال رکھا تھا۔

"سائرہ آپی! کتنا نیچرل تیار ہوئی ہیں۔ اس حلیے میں تم جنازے سے لے کر وزیراعظم کی حلف برداری جیسے تمام فنکشن اٹینڈ کروا سکتے ہو۔" سعد نے بہن کو ویل ڈن کا انگوٹھا دکھایا۔

"یہ تم میری تعریف کر رہے ہو یا مذاق اڑا رہے ہو؟" سائرہ نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے۔

غزالہ یہ دھاچوکڑی دیکھ کر فکرمند ہو گئیں۔

"تم سے یہ افلاطون نہیں سنبھالے جائیں گے میں فواد کو بلاتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے فواد کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

سائرہ کہتی رہ گئی کہ بھائی کی پڑھائی کا حرج ہوگا ان کے امتحان سر پر ہیں۔ مگر غزالہ نے اپنے بعد بچوں کی ذمہ داری ہمیشہ فواد کو ہی دی تھی۔ سعد نبیل کے قریب ہوا اور پانی پینے کے بہانے زارا کے کان کے پاس گیا۔ "لو جی آپ کی تو تیاری کے پیسے پورے ہو گئے۔" زارا فوراً دور ہوئی تا کہ یہ کہہ سکے کہ اس نے تو سعد کی بات سنی ہی نہیں۔ لیکن اس کی مسکراہٹ اتنی گہری تھی کہ سعد کے علاوہ دوسروں کو بھی شک میں ڈال سکتی تھی۔

"اچھا ہے فواد آ رہے ہیں۔ میں گاڑی کی چابی لے آئی تھی۔ فواد گاڑی چلا لیں گے۔ اب گاڑی پہ چلتے ہیں۔" زارا نے خوش ہو کر پرس سے گاڑی کی چابی نکالی اور وضاحت کی کہیں دوسرے بھی اس خوشی کا کوئی مطلب نہیں نکال لیں۔

"السلام علیکم۔" فواد آتے ہی سیدھا زارا کے سامنے آیا اور ہاتھ بڑھایا۔ زارا بے یقینی سے مسکرائی۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ یہ دن آ ہی گیا۔ وہ خوش ہو رہی تھی۔

"چابی؟" فواد نے بڑھے ہاتھ کی وضاحت کی۔

"وعلیکم السلام۔" زارا خیالوں سے نکلی اور چابی فواد کو دے دی۔

☆☆☆

مہک کو شاہد گیلانی نے خود فون کیا تھا۔ حیرت کے مارے اس کا موبائل گرتے گرتے بچا تھا۔ جب اس نے راحین کی بیماری کا بتایا تو اس پر مزید بم گر گئے۔ شاہد نہیں چاہتے تھے کہ راحین کمرے میں بند ہو کر رہ جائے۔ انہوں نے مہک سے مدد مانگی تھی۔ مہک انجان بن کر گئی تھی اور راحین کی تمام ضد اور نخروں کے باوجود اس کو باہر لے آئی تھی۔

"گاڑی یہاں کیوں روک لی۔ اتنی دور تک پیدل چلنا پڑے گا۔" راحین نے ریسٹورنٹ اور گاڑی کے بیچ موجود کئی قسم کی دکانوں کو دیکھا۔

"واپسی پر وہاں سے لمبا یوٹرن لینا پڑتا ہے اور اچھا خاصا رش ہو جاتا ہے۔ گاڑی ادھر سیف ہے۔" مہک کی الگ ہی منطق تھی۔

راحین سن گلاسز چڑھا کر بے دلی سے اتری تھی۔ بیچ میں موجود ان سادہ سی دکانوں میں ایک چاٹ کی دکان بھی تھی۔ سائرہ کی کمائی سے عیاشی کرتا ٹولہ اسی دکان کے باہر لگی پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھا گول گپے کھا رہا تھا۔ فواد نے موسمبی کا جوس لیا تھا اور خاموشی سے پی رہا تھا۔ سعد مائدہ کی نوک جھونک چل

رہی تھی۔ انہیں کوئی نہیں روک رہا تھا۔ آج بچوں کو بچے بننے دینے کا دن تھا۔

"اگلی بار فلم دیکھیں گے۔" زارا نے چہکتے ہوئے کہا۔ وہ بوٹینیکل گارڈن میں تتلیاں دیکھ کر آئے تھے۔

"ہر وقت ڈراموں کی اسکرین ہی دیکھتے ہیں۔ باہر آ کر اسکرین والی تفریح نہیں کرنی چاہیے۔" مائدہ نے بڑی بنتے ہوئے کہا۔

"فلموں اور ڈراموں میں بہت فرق ہے۔ ڈرامے کی ہیروئن سائرہ باجی کی طرح بے زبان ہوتی ہے۔ اور فلموں کی ہیروئن زارا باجی کی طرح بولڈ ہوتی ہے۔ ایک سین میں ہیرو سے ملتی ہے اور اگلے سین میں اس کے ساتھ گانا گانے لگتی ہے۔" سعد نے کہہ کر بڑا سا گول گپا منہ میں ڈالا۔

زارا نے غصے سے کھٹے پانی کی پلیٹ ٹیبل پر رکھی۔

"جب دیکھو مجھے کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہو۔ بہت ہو گیا۔" اسے ہتک محسوس ہوئی تھی۔

"سعد! آرام سے کھاؤ۔" فواد نے سعد کو تنبیہ کرتے ہوئے زارا کی پلیٹ اٹھا کر دوبارہ اس کو تھمائی۔ زارا کے گال خوشی سے سرخ ہو گئے۔ سائرہ خاموشی سے چاٹ کھا رہی تھی اور ساتھ مائدہ اور سعد کو خوشی سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی کمائی کا اتنا اچھا استعمال اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"اچھے ہیں؟ اور کچھ چاہیے؟" فواد نے سب کی طرف دیکھا۔

"اچھے ہیں بس تھوڑی مرچیں زیادہ ہوتیں تو اور مزہ آتا۔" زارا نے جواب دیا۔

"ہیلو فواد۔" راحین فٹ پاتھ سے گزر رہی تھی جب فواد پر اس کی نظر پڑی۔ وہ کرسی کے پیچھے بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر فواد کے کندھے کے قریب جھکی۔ اس کے کھلے بال بائیں کندھے پر گرے تھے۔ فواد کے علاوہ سب لوگوں کی نظر اس کے ریشمی بالوں پر گئی تھی۔ اس سے پہلے ایسے بال انہوں نے صرف شیمپو کے اشتہاروں میں دیکھے تھے۔

اپنے مرض کی تشخیص کے بعد اس نے اپنی یاں کو اتنا یاد کیا تھا کہ فواد کے ساتھ گزارا وقت بھول گئی تھی۔ اب اسے دیکھ کر اس کی باتیں وہ پروجیکٹ سب یاد آ گیا تھا۔ وہ جیسے نخلستان میں آ گئی ہو۔

"وعلیکم السلام۔" فواد فوراً کرسی سے اٹھ کر راحین کے سامنے آ گیا۔ اپنے کندھے پر اس کا بے تکلف ہاتھ اسے پسند نہیں آیا تھا۔

اس نے راحین کو دیکھا۔ دل کی دھڑکن لمحہ بھر کو بھی بے ترتیب نہیں ہوئی تو اس نے دل کو شاباش دی۔ وہ راحین کے احساس ذمہ داری سے متاثر ہوا تھا اور اس کے بعد راحین بغیر اطلاع کیے غائب ہو گئی تھی۔ جس وجہ سے وہ پھر سے قابل ستائش سے قابل برداشت ہو گئی تھی۔

"آپ کو دیکھ کر میں سرپرائز ہو گئی ہوں۔" وہ سچ میں خوش تھی جب کہ فواد اور اس کے درمیان ابھی دوستی تک نہیں تھی۔ "میں بھی جہاں آپ کو دیکھنے کی توقع ہوتی ہے وہاں آپ آتی نہیں اور جہاں آپ کو دیکھنے کا سوچا بھی نہیں ہوتا۔ وہاں آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ لانچ ڈے پر میں نے آپ کو بہت کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔" فواد نے یاد کروایا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ افسردہ ہوئی۔ بیماری کو چند لمحے سے زیادہ بھولنا اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

سعد نے بہت دلچسپی سے بھائی کے ساتھ کھڑی سپر ماڈل جیسی لڑکی کو دیکھا۔ جو بہت بے تکلفی سے فواد سے بات کر رہی تھی۔ واضح تھا کہ وہ اس کو اچھی طرح جانتی ہے۔ سعد نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ اب سے وہ خوب محنت کرے گا دل لگا کر پڑھے گا تا کہ بھائی جیسی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ ملے۔

سائرہ مائدہ کی توجہ بھی وہیں تھی۔ انہیں فواد کی بہن ہونے پر دوبارہ سے فخر ہوا۔ ان کا بھائی تو بڑے بڑے لوگوں کو جانتا تھا۔ وہ ایک چمچہ منہ میں ڈالتیں اور ایک نگاہ راحین کو دیکھتیں۔

سب سے زیادہ حیران زارا تھی۔ وہ کھاتے

ہوئے رک گئی تھی۔ جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔ منہ سے ایک انچ کے فاصلے پر گول گپے والا اس کا ہاتھ تھم گیا تھا اور وہ بت بنی فواد کے مقابل کھڑی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ گول گپے سے قطرہ قطرہ پانی دوبارہ کٹورے میں گر رہا تھا اور اس میں ہلنے کی ہمت نہیں تھی۔

''لگتا ہے زارا باجی کو مرچیں لگ گئی ہیں۔'' سعد کے تبصرے پر زارا نے ہاتھ نیچے کیا مگر نگاہیں اب بھی وہیں لگی تھیں۔

''میں سچ میں شرمندہ ہوں۔'' راحین نے کہا فواد مان گیا۔

''کوئی بات نہیں پروجیکٹ بہت کامیاب تھا۔'' فواد نے مسکرا کر کہا۔

راحین کی نظر پیچھے بیٹھی اس کی فیملی تک گئی۔ پلاسٹک کی میز کرسیاں، کھلا آسمان اور ڈسپوزیبل پلیٹوں میں کھاتے وہ اسے بہت عجیب لگے۔ پیچھے کھڑی مہک بھی ان کو دیکھ رہی تھی۔ فواد بھی کوئی نئی بات نہیں کر رہا تھا۔ یعنی ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ صرف راحین تھی جسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کے بیچ کی باتیں ختم ہو گئی ہیں۔ اتنی جلدی کیسے؟ ابھی تو وہ اس سے اتنے دنوں بعد ملی تھی۔ وہ کیسے چلی جاتی لیکن رکتی تو کیوں؟

''میں اور مہک لنچ کرنے جا رہے تھے۔ آپ اپنی فیملی کے ساتھ ہمیں جوائن کریں۔''

راحین نے بہت کھلے دل سے آفر کی۔ اسے سیاہ رات میں جگنو دکھا تھا۔ جیسے وہ مٹھی میں قید کرنا چاہتی تھی۔

مہک نے اس آفر پر اسے پیچھے سے چٹکی کاٹی۔ اسے فواد کے بے ہودہ ٹی۔ شرٹ والے بھائی اور اپنے قد سے لمبے دوپٹوں والی بہنوں کے ساتھ مزید وقت نہیں گزارنا تھا۔

''نہیں تھینک یو۔ ہمارا تو واپسی کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' وہ پھر سے نپی تلی گفتگو پر اتر آیا تھا۔

''پلیز مجھے خوشی ہو گی۔'' راحین نے اصرار کرتے ہوئے باقیوں کو دیکھا۔ مائدہ اور سعد واضح طور پر اس کی آفر قبول کرنا چاہتے تھے۔

''ویسے بھی یہاں کا کھانا بہت ان ہائی جینک ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہے وہ پاؤں سے گول گپوں کا آٹا گوندھتے ہیں۔'' راحین نے منہ بنا کر کہا۔

سعد نے اسی لمحے ایک بڑا سا گول گپا منہ میں ڈالا تھا۔ یہ سن کر گول گپا اس کے حلق میں پھنس گیا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

فواد کے دل میں راحین کی آفر قبول کرنے کی ایک فیصد بھی خواہش تھی تو اس وقت ختم ہو گئی تھی۔ یہ واضح تھا کہ وہ اور راحین بھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ فواد اسے سائیڈ پر آنے کا اشارہ کر کے ان سب سے اتنی دور جا کر کھڑا ہو گیا کہ کسی کو ان کی باتوں کی آواز نہ آئے۔ زارا نے اب لمحہ بھر کو نظر پھیری تھی۔

''ہمارے معدے کو ایسے کھانوں کی عادت ہے۔ ہمیں فائیو اسٹار کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔''

وہ راحین کی طرف ایک نظر بھی اٹھاتا تھا تو راحین کا توہین آمیز رویہ اسے دو قدم دور ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔

''میں نے تو خلوص سے آفر کی تھی۔'' وہ اچھا ہونا بھی چاہتی تھی تو دل آزاری کا سبب بن جاتی تھی۔

''میں اپنی فیملی کے ساتھ آیا ہوں اور آپ اپنی فرینڈ کے ساتھ۔ ہمیں ان ہی لوگوں کے ساتھ رہنا چاہیے جن کے ساتھ ہم کمفرٹیبل ہیں۔'' وہ راحین کے ساتھ خود کو بھی سمجھا رہا تھا۔

''آپ سے یونیورسٹی میں ملاقات ہو گی۔'' فواد الوداعی انداز میں مسکرایا۔

راحین اس جملے کی رسمی نوعیت سے واقف تھی۔ مگر اس کو یہ سن کر اچھا لگا۔

''میں آؤں گی یونیورسٹی۔ ضرور آؤں گی۔'' اس نے عزم سے کہا۔

اس روز وہ وہاں سے چلی گئی۔ آگے ویک اینڈ تھا۔ جو راحین سے گزارے نہیں گزر رہا تھا۔ سعد اور مائدہ بہت خوش لوٹے تھے۔ زارا نے واپسی کے

سارے راستے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سب کو لگا وہ بہت تھک گئی ہے۔ فواد ویسے ہی راحین سے مل کر ملے جلے جذبات کا شکار تھا۔ ایک سائرہ بچی تھی جس کی خوشی گھر آ کر تب مدھم ہوگئی جب غزالہ نے بتایا کہ اتوار کو اس کا رشتہ دیکھنے لوگ آ رہے ہیں۔

☆☆☆

غزالہ نے رشید صاحب کا کرتا شلوار ہینگر سے نکال کر بستر پر رکھا۔

"آج اخبار پڑھنے کا ناغہ کر لیتے اور بال ڈائی کروا لیتے۔ اچھا تاثر آتا ہے۔" انہوں نے ناقدانہ نگاہ شوہر پر ڈالی۔

"بیگم! لڑکی کے باپ کا حسن و جمال متاثر نہیں کرتا۔ اس کا بینک بیلنس، کوٹھی اور گاڑی کرتے ہیں۔ میرے پاس تینوں نہیں ہیں۔" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسے۔

"جہاں دیدہ لوگ شرافت حلال کمائی اور تربیت دیکھتے ہیں۔ ہماری سائرہ میں تینوں ہیں۔" وہ پرامید تھیں۔

"پہلی ملاقات میں خلوص کسی کو نظر نہیں آتا۔" رشید چڑ کر بڑبڑائے۔

غزالہ بیٹی کو ماں کی نظر سے دیکھ رہی تھیں انہیں ناامیدی کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ انہیں نے سعد کو لوازمات لینے بیکری بھیج دیا۔ وہیں اسے صارم مل گیا۔ صارم انسٹنٹ فوڈ ترک کر کے بیکری کی تسلی سے بنی ہوئی خوراک کو ترجیح دینے لگا تھا۔

"ارے سعد کیا ہو رہا ہے؟" صارم نے سعد کو بڑبڑاتے سنا تھا۔

"کچھ نہیں اچھا بھلا کرکٹ کھیلنے جا رہا تھا امی نے کہا اکرم سے پیٹیز لے آؤ۔ سائرہ باجی کو دیکھنے کے لیے لوگ آ رہے ہیں۔ وہ کل سے حلیم پکا رہی ہیں۔ رشتے والوں کو ان کی حلیم کے بجائے اکرم کے ہاتھ کے پیٹیز زیادہ پسند آ گئے تو میرا کوئی ذمہ نہیں۔" سعد نے بلند آواز سے جملے کہے۔

سعد اپنی طرف سے ایسے ہی لطیفے چھوڑتا تھا جو بہت کم لوگوں کو سمجھ میں آتے تھے۔ زیادہ تر لوگ اسے فضول بات سمجھ کر اگنور کر دیتے تھے۔ سعد نے صارم کو افسردہ ہوتے دیکھا تو یہی سمجھا کہ اس کا یہ لطیفہ صارم کو فضول لگا ہے۔

☆☆☆

"خوش قسمت ہو تمہیں سب ٹیچرز نے ایڈجسٹ کر لیا ہے۔" مہک نے راحین سے کہا۔

ویسے اسے شک گزرا تھا کہ شاہد گیلانی نے ان کے بالا ہی بالا راحین کی چھٹیوں کا معاملہ حل کیا ہے۔

"میں چند ہفتوں کے لیے گئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ ہمیشہ کے لیے بھی چلی جاؤں گی تو کچھ نہیں بدلے گا۔" راحین نے چلتے ہوئے ایک باڑ کے پتوں کو چھوا۔

"یہ جو تم نے فلاسفی شروع کر دی ہے اس کا علاج کرنا پڑے گا۔" مہک نے موبائل نکال کر ایک کانسرٹ کا اشتہار اس کے سامنے کیا۔

"میرا کزن مینجمنٹ میں ہے۔ ہمیں آسانی سے پاس مل جائیں گے۔"

وہ یونیورسٹی میں تھیں۔ انہوں نے سبزے کے ساتھ بنے راستے پر موڑ کاٹا۔

"میں نے نہیں جانا۔ رش میں میرا دم گھٹتا ہے۔" یونیورسٹی آ کر وہ زیادہ مضطرب نظر آ رہی تھی۔

"کیوں؟ کیا ہوا ہے؟" مہک نے پوچھا۔

راحین نے ابھی تک مہک کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ مہک اور شاہد کی فون کال ابھی تک راز ہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا بس موڈ نہیں ہے۔" وہ مہک سے بھی پردے ڈھک رہی تھی۔

اس ہی وقت راحین کی نظر فواد پر پڑی وہ تیزی سے اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگی۔ پچھلی ملاقات کا والہانہ پن اسے اب شرمندہ کر رہا تھا۔ فواد علیم اور ثوبیہ کا گروپ سبزے میں بیٹھا تھا۔ راحین کامیابی سے ان کے پاس سے گزر گئی۔ پچھلی بار وہ کچھ زیادہ ہی اتاولے انداز میں فواد سے ملی تھی۔

"مس مہک ہمارا بھی حال پوچھ لیں۔" علیم ایک بینچ کے اوپر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ مہک کو

دیکھ کر چھلانگ مار کر اترا اور بات کرنے لگا۔

مہک رک گئی۔ اس لیے آگے بڑھتی ہوئی راحین کو بھی رکنا پڑا۔ اس نے ایک محتاط نظر اٹھا کر دیکھا فواد اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہیلو۔'' راحین نے فواد سے کہا۔

''السلام علیکم۔'' فواد نے بے تاثر انداز میں کہا۔ گزرتے ہوئے سب اسٹوڈنٹس اس کو سلام کرتے تھے اور وہ ایسے ہی جواب دیتا تھا۔

احساس ذمہ داری وہ کڑوی گولی تھی جو انسان کو منھی مستیوں کا وقت بھی نہیں دیتی تھی۔ فواد نے بھی سنجیدگی سے راحین کو نظر انداز کیا وہ نوٹ بک کھول کر کوئی چیک لسٹ بنانے لگا۔

''جی سنائیں آپ کا کیا حال احوال ہے؟'' مہک کی علیم سے اچھی سلام دعا تھی۔

''ہمارا تو یہ حال ہے کہ اسائنمنٹ سے گرے اور پریزنٹیشن میں اٹکے۔ لگتا ہے یونیورسٹی مجھ سے جدا ہونا ہی نہیں چاہتی۔ اس لیے جان کر میرے راستے میں روڑے اٹکا رہی ہے۔'' ان کے سمسٹر کے آخری دن چل رہے تھے۔

''میں تو خود تنگ آ گئی ہوں۔'' ثوبیہ پڑھاکو نمبرون مشہور تھی۔ اس کی یہ حالت تھی تو باقی سب کو تو نانی یاد آ گئی ہوگی۔

''مطلب آپ کو بھی پتا لگ گیا ہے کہ آپ جتنا بھی پڑھ لیں آپ کا کچھ نہیں بننا۔'' مہک نے علیم کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

فواد کا بی بند کر کے مسکرایا۔ ثوبیہ بھی ہنس دی۔ راحین بھی مسکرانے پر مجبور ہو گئی۔ وہ ہنستے ہوئے اچھا لگتا تھا۔ فواد نے ہنستے ہوئے راحین کو دیکھا اور اپنی ہنسی روک لی۔ وہ کوئی جھوٹی امید بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

''میرے پاس اس سب کا علاج ہے۔ آپ سب کو چاہیے آج پڑھائی سے بریک لیں۔ میرے پاس ایک کانسرٹ کے پاس ہیں۔ ہم سب وہاں چلتے ہیں۔ کچھ ہم جونیئرز کو بھی خدمت کا موقع دیں۔'' مہک نے موبائل میں وہی اشتہار دکھایا۔

بڑے بڑے سنگرز کے نام دیکھ کر علیم اور ثوبیہ کی ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔

''فری پاس۔ اللہ نے تو آپ کو فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔'' علیم نے مہک کو سیلوٹ کیا۔

''ابھی ارینج کر دو فوراً۔'' ثوبیہ نے دونوں انگوٹھے اوپر کر کے مہک کو ڈن کیا۔

''تم لوگ جاؤ مجھے کانسرٹ پسند نہیں۔'' فواد کو راحین کی اپنی طرف اٹھتی چور نظریں محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ خود اس سے بے تکلفی کا مرتکب ہوا تھا۔ اب اس پر نادم تھا۔

''ہیلو...... ہیلو مجھے تمہارے بہانوں کی آواز نہیں آ رہی۔ یونیورسٹی ختم ہونے والی ہے۔ اب تو تمہیں ہمیں وقت دینا ہی ہوگا۔'' علیم بولا۔

ثوبیہ بھی اس پر چڑھ دوڑی تو اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا۔ کانسرٹ کا بزنس پلان معلوم ہے کسی کو؟'' فواد نے پھر پڑھائی کی بات چھیڑ دی۔

''یعنی تم آؤ گے تو وہاں بھی پڑھائی کی باتیں ہوں گی۔'' علیم نے گھورا۔

''اچھا نہیں کرتا پڑھائی کی باتیں۔ آج کی شام تم پاس ہو گے۔ اب خوش؟'' فواد نے ہار مانتے ہوئے ہاتھ اٹھائے۔

''ایکسلینٹ میں سب کے پاس کا کہتی ہوں۔'' مہک نمبر ملاتے ہوئے دور چلی گئی۔

راحین فواد کا انداز دیکھ رہی تھی۔ سرطان سے پہلے والی راحین ہوتی تو کب کی دور جا چکی ہوتی۔ مگر یہ جو راحین تھی اس کے پاس وقت کم تھا۔ اسے یہ وقت ان کاموں میں گزارنا تھا جو اسے خوشی دیتے تھے۔ اس نے اقرار نہیں کیا تھا۔ مگر روٹھا، اکھڑا فواد سامنے تھا تو بھی اسے اچھا لگ رہا تھا۔

''میں بھی چلوں گی۔'' اس نے مہک کے پیچھے آ کر کہا۔

مہک نے پہلے راحین کو دیکھا۔ پھر فواد کو دیکھ کر اس کے بدلے ارادے کی حقیقت بھانپنے لگی۔

"تم شیور ہو؟" اس کی مراد فواد سے تھی۔

"ہاں۔" راحین نے کانسرٹ کے بارے میں جواب دیا تھا۔

☆☆☆

صارم نے اسکالرشپ کے لیے اپلائی کر رکھا تھا۔ وہ فواد کو قبولیت کا خط دکھانے آیا تھا۔

"مجھے تم پر بہت فخر ہے۔ اب تم وہ سب پڑھ کر آؤ گے جس کے بعد مجھے تم سے ٹیوشن لینی پڑیں گی۔" فواد نے عرصے بعد کسی کو گلے لگایا تھا۔

وہ سچ میں خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ تو ہمیشہ میرے گرو رہیں گے۔" صارم نے کہا۔ وہ اتنا خوش نہیں تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔

"بھائی آپ کی کون سی شرٹ استری کرنی ہے؟" سائرہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔

صارم اور فواد لاؤنج میں کھڑے تھے۔

صارم کو ایک دم قرار آ گیا۔ آج وہ اگر کچھ اور بھی مانگ لیتا تو مل جاتا۔ لیکن وہ سائرہ کی جھلک کے سوا کچھ اور مانگتا ہی کیوں۔

"مجھے اسکالرشپ ملی ہے۔" اس نے سائرہ کو لیٹر دکھایا۔ وہ خوش ہوتی تو صارم بھی خوش ہو جاتا۔

اس نے فواد کے سامنے ہی سائرہ کو مخاطب کر لیا تھا۔ آگے نہ جانے کتنے سال سائرہ کو دیکھے بغیر رہنا پڑے۔ آج وہ اس کو جی بھر کر دیکھ لینا چاہتا تھا۔

"میں شرٹ نکال دیتا ہوں۔" فواد نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

سائرہ نے لیٹر پکڑا۔

"بہت خوشی کی بات ہے۔ آپ جب واپس آئیں گے تو محلے یا شاید شہر کے ہی صاحب بہادر بن کر آئیں گے۔ بہت مبارک ہو۔" اس نے زبردستی بتیسی دکھائی۔ جبکہ اس کے دل پر آری چل گئی تھی۔ اس کو صارم کی ترقی بری نہیں لگی تھی۔ لیکن اتنی اچھی پڑھائی کے بعد ان کی تعلیمی قابلیت میں زمین آسمان کی دوری آ جاتی تھی۔ سائرہ کو ہلکی سی امید تھی کہ کبھی وہ اور صارم ہم پلہ ہو جائیں گے تو اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔

"میرا انتظار کرو گی؟" اس کو یہ پوچھنا تھا ورنہ مر جاتا۔

"نہیں۔" اس نے دل توڑا۔ "کر نہیں سکتی۔" اس نے خط میں لکھے صارم کے نام پر انگلی پھیری۔

"پھر کیا فائدہ اس ترقی کا۔ اس کامیابی کا۔" صارم نے خط واپس لیا۔ اس کا دل کیا وہ خط پھاڑ ہی دے۔

"آپ اپنے ملک کا نام روشن کرنا۔ زرمبادلہ بھیجنا۔ گر سیکھ کر واپس آنا اور یہاں دوسروں کو سکھانا ہے۔" سائرہ نے اس کی ہمت بندھائی۔

"اور کبھی اپنے لیے کچھ کرنا چاہوں تو کیا کروں؟ صبر؟" صارم تلخ ہوا۔

اس سے پہلے کہ سائرہ کچھ کہتی فواد شرٹ لے کر آ چکا تھا۔

سائرہ چلی گئی تو صارم کو احساس ہوا وہ اس کو جتنا بھی دیکھ لے اس کا جی نہیں بھرے گا۔

☆☆☆

فواد تیار ہو کر کانسرٹ کے لیے نکل رہا تھا۔ اس کے ماں باپ کے کمرے سے آوازیں آنے لگیں۔

"وہ سائرہ سے کس قدر ذاتی اور احمقانہ سوال کر رہے تھے۔ مہمان نہ ہوتے تو میں گھر سے نکلوا دیتا۔" رشید صاحب کا غصہ بھی تین سالوں سے مفلوج تھا اور غزالہ کی وفاداری سے مرعوب ہو کر انہوں نے اونچی آواز میں بات کرنا ترک کر رکھا تھا۔ آج تین سالوں بعد ان کے غصے کو بھی پر لگے تھے۔

فواد دروازے کے قریب ہو گیا اور سننے لگا۔

"نصیبن نے تو بہت تعریف کی تھی۔ کیسے لوگ نکلے۔ نہ گھر کا ادھڑا پلستر چھوڑا نہ نئی سیٹ کا مدھم رنگ۔ ... پر ایسے کون کہتا ہے؟" وہ آنسو پی رہی تھیں اور فواد غصہ۔

''تمہیں ہی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی پڑی ہے۔'' رشید نے کہا۔

''بیٹیاں ایسی بیری ہوتی ہیں۔ جو قد اور عمر میں بڑھ جائیں تو پتھر پھینکنے والے بھی نہیں آتے۔'' غزالہ نے جتایا۔

''خیر سے فواد کا روزگار لگے گا تو پرانا گھر بیچ دیں گے۔ حالات اچھے ہوں گے تو ہی اچھے رشتے آئیں گے۔ ابھی اچھے رشتوں کا آنا پیڑ پر بے موسم پھل لگنے کے برابر ہے۔'' رشید نے کہا۔ پھر اس کی نظر فواد پر پڑی جو دروازے میں کھڑا ماں باپ کی باتیں سن رہا تھا۔

''میں دوستوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔'' اس نے ایسا کہا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''بیٹا وہ اسلم کی خبر تو لو۔ ہمیشہ پہلی کو کرایہ ٹرانسفر کر دیتا ہے آج چار دن ہو گئے۔ نہ فون اٹھا رہا ہے۔ نہ کوئی پیغام آیا۔'' رشید کو اس کی صورت دیکھتے ہی ضروری کام یاد آیا تھا۔

''میں معلوم کرتا ہوں۔'' فواد نے کہا اور نکل گیا۔

بے چاری سائرہ کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ یہ سوچ کر دکھی ہو رہا تھا۔ ہر غم کی طرح یہ غم بھی اس نے پلے سے باندھ لیا تھا۔ جیسے یہ سب بھی اسے ہی ٹھیک کرنا ہے۔

☆☆☆

وہ فواد کے مرحوم دادا کا گھر تھا۔ جہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گھر پر کھنڈر کا گمان ہو رہا تھا۔ فواد کچھ گھبرا گیا۔ پھر اندر سے اوچھے گانوں کی آواز باہر تک آنے لگی۔

''اسلم صاحب گھر پر ہیں؟'' کئی بار بیل بجانے کے بعد اندر سے ایک آوارہ لڑکا نکلا تھا۔ جس کی شرٹ کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے۔

''کون اسلم؟'' لڑکا منہ کھول کر چیونگم چبا رہا تھا۔

''اسلم صاحب جو یہاں کرائے پر رہتے ہیں۔ یہ گھر میرے ابو کا ہے۔'' فواد نے تحمل سے کہا۔

''رؤف مہمان کو اندر تو آنے دے۔'' اندر سے آواز آئی۔

اندر سے آئی آواز کے جواب میں لڑکے نے راستہ چھوڑ دیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ فواد غلط گھر میں آیا ہو۔ یہ اس کے دادا کا گھر تھا جہاں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ وہ نیند میں بھی یہ راستہ بھول نہیں سکتا تھا۔ لیکن یہ بھی واضح تھا کہ اندر سے آواز دینے والا ان کا کرایہ دار اسلم نہیں تھا۔ فواد نڈر ہو کر اندر چلا گیا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا اور صحن میں چارپائی ڈال کر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا۔ جو ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ جس صحن میں اس کا بچپن کھیلتے گزرا تھا اب وہ بدمعاشوں کا اڈہ بنا ہوا تھا۔

''آؤ بچے بازی لگائیں۔ اس گیم کا اصل مزہ تو چار بندوں میں ہی ہے۔'' بھاری بھرکم آدمی نے شاگرد کو آنکھ دبا کر دیکھا اور ظالمانہ قہقہہ لگایا۔ رؤف نے پیچھے گیٹ بند کر دیا اور جیب سے پستول نکالی۔

''کون ہو تم؟'' اس کی پرورش حلال پر ہوئی تھی وہ آنکھیں دکھانے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔

''میرے گھر میں کھڑا مجھ سے میرا تعارف پوچھ رہا ہے؟'' استاد سنجیدہ ہو کر بیٹھا۔

''بڑا ہی پپو ہے تو۔ کیا معصوم شکل ہے۔ ویسے تو کوئی مجھ سے یہ پوچھ لے کہ میں کون ہوں تو پھر وہ اس کے آخری جملے ہوتے ہیں۔ پر تو مجھے پسند آ گیا ہے۔ ایسے چکنے چہرے اب دیکھنے کو نہیں ملتے۔ چل تجھے سیدھا بتا دیتا ہوں کہ کون ہوں میں۔ جیلا استاد کہتے ہیں مجھے۔''

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' فواد نے آنکھیں نکالنے والے آنکھیں دکھائیں۔

''میں تجھے تاش کھیلنے کا کہہ رہا ہوں۔ مہمان نوازی کر رہا ہوں اور تو ہے کہ آنکھیں دکھا رہا ہے۔ رؤف کیا ہو گیا بھئی آج کی نسل کو۔'' وہ میٹھی چھری کے انداز میں بولا۔ اس کی خونخوار نگاہیں بدمعاشوں کا خاصہ تھیں۔

"مطلب کی بات کرو۔" فواد دانت پیس کر بولا۔

"سوہنیوں میرا احسان مانو۔ تمہارا گھر سنبھال لیا۔ وہ تمہارا ڈھیلا کرائے دار اسلم دو مہینے سے سب چھوڑ چھاڑ کر گاؤں بیٹھا تھا۔ اس کی ماں بیمار تھی۔ مجھے جگہ کی ضرورت تھی میں ادھر آ گیا۔ بڑا ہی اچھا علاقہ ہے۔ روز رات کو تم لوگوں کو دعائیں دیتا ہوں کیا ٹھنڈی چھتوں والا گھر بنایا ہے۔ بھائی واہ۔"

"استاد دعا تو صبح کی لگتی ہے۔ رات کی نہیں۔" تاش کھیلتے ہوئے شاگرد نے کہا۔

"جی بچے! جانتا ہوں دعا تو دن کی لگتی ہے۔ بس گھنٹہ دو میں اور جاگ سکوں تو دن چڑھا ہی چڑھا۔ پر اذانوں سے پہلے نیند آ جاتی ہے۔" اس استاد نے بے ہودہ قہقہہ لگایا۔

وہ سارے ایسے موڈ میں تھے جیسے پکنک منا رہے ہوں۔ لیکن معاملے کی سنگینی فواد پر کوڑے برسا رہی تھی۔ ان کے گھر پر بدمعاشوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ان کی واحد آمدن اس کے باپ کی سفید پوشی کا بھرم ان کے مستقبل کی اچھی امید سب وہ گھر ہی تو تھا۔

"اسلم صاحب یہ جگہ تمہیں دے گئے ہیں؟" اسے یقین نہیں آیا۔

"اس کی کیا مجال کہ مجھے کچھ دے۔ مجھے یہ گھر پسند آ گیا۔ تو میں مالک بن بیٹھا۔ سادی سی بات ہے۔ بیوی بچے گاؤں چھوڑ کر اکیلا آیا تھا۔ بے چارے کی ماں مر گئی تھی۔ میں نے اچھے سے سمجھا دیا کہ میں تو ادھر ہی رہوں گا۔ بیوی بچے لے کر آنا ہے تو اس کی مرضی۔ مجھے بھی رونق ہو جائے گی۔ منٹوں میں سامان لے کر چلتا بنا۔" جیلے استاد کی آنکھیں گندی دھمکی دے رہی تھیں۔

"تم میرے گھر پر ناجائز قبضہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس کاغذات ہیں۔ گواہ ہیں۔ اگلی بار میں پولیس لے کر آؤں گا۔" وہ اس غنڈے کا گریبان پکڑنے آگے بڑھا۔ پیچھے سے رؤف نے آ کر اس کی کنپٹی پر بندوق تان دی۔

"نا رؤف پیارے! مجھے نئے گھر میں خون خرابا نہیں چاہیے۔ تو جا مہمان کے لیے ٹھنڈی بوتل لے کر آ۔ جا شاباش...... اس کا دماغ ٹھنڈا ہو گا تو عقل ٹھکانے آئے گی۔" وہ بیک وقت گڈ کاپ اور بیڈ کاپ دونوں تھا۔ پھر اس نے فواد کو دیکھا۔

"پولیس سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے۔ تو کرسی ڈال کر بیٹھ جا۔ ڈیوٹی آف کر کے آتی ہی ہو گی۔ رات یہاں تاش کی بازی چلتی ہے۔ تب میں عقل سے پیدل کرنے والا ٹھنڈا پلاتا ہوں۔" استاد نے جیب سے ایک تیز چاقو نکال کر لہرایا۔

"کیا چاہتے ہو؟" فواد زمین پر بے خوف کھڑا تھا۔ سامنے ایک اشتہاری مجرم تھا۔ باپ کی کوئی نیکی یا ماں کی دعا نے ان کے ہاتھ روک رکھے تھے۔

"تو بھی شہزادہ ہے۔ مجھے پسند آ گیا ہے۔ اس لیے تیرے لیے رعایت کرتا ہوں۔ تیرا گھر ہے تو رکھ میں چلا جاتا ہوں۔ کیا یاد کرے گا۔ بس راستے کا خرچا پانی دے دے۔ صرف ساٹھ لاکھ بلکہ وہ بھی چھوڑ تیرے لیے صرف پچپن لاکھ بس۔" وہ لہک کر بولا۔

"پچپن لاکھ؟ اپنے گھر کے لیے۔" یہ ناانصافی فواد کی سمجھ سے باہر تھی۔

"تو نے سنا نہیں شاید میں مالک ہوں اب اس کا۔" جیلے استاد کا اعتماد خوفناک تھا۔

"تم ٹھیک نہیں کر رہے۔" فواد نے انگلی دکھائی۔

"بادشاہو میں جو کرتا ہوں وہی ٹھیک ہوتا ہے۔" اس نے مکا بنا کر اپنے سینے پر مارا۔ اس کا مضبوط پہلوانی سینہ گونج اٹھا۔

"میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ تم یہ گھر ہتھیانے میں کامیاب نہیں ہو گے۔ یہ میرا گھر ہے۔"

استاد نے تاش کے پتے چارپائی پر پھینکے۔

"شکل سے کیا پو بچہ لگتا ہے اور باتیں ایسی کڑوی۔ سارا موڈ خراب کر دیا۔ چل رؤف نکال اس کو باہر۔ میرے آرام کا ٹائم ہو گیا ہے۔" استاد بے خبر بن کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

فواد چلانے لگا۔ رؤف نے بندوق اب اس کے سینے پر رکھی اور اس کو باہر نکالنے لگا۔ رؤف نے اور زور سے دھکا لگایا۔ فواد کا چلانا سن کر استاد نے اپنی آنکھوں سے ہاتھ اٹھایا اور ظالمانہ انداز میں فواد کو دیکھا۔

''اگلی بار پچپن لاکھ لے کر آنا۔ خالی ہاتھ آئے تو پھر مجھے تمہارے دوسرے گھر کا راستہ بھی معلوم ہے۔ جس میں تم، تمہارا لنگڑا باپ اور تمہاری کنواری بہنیں رہتی ہیں۔'' جیسے استاد کے چہرے پر اب کوئی ہنسی ٹھٹھا اور مخول موجود نہیں تھا۔ صرف حیوانیت تھی۔

فواد کے جسم سے جیسے روح نکل گئی۔ رؤف اسے دھکیل کر گیٹ کے باہر نکال گیا۔ استاد نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور کوئی گانا گانے لگا۔

☆☆☆

شاہد گیلانی آفس کے کام گھر پہ کرنے لگے۔ تاکہ ہر وقت راحین کے آس پاس رہ سکیں۔ راحین کا یونیورسٹی جانا۔ شاہد نے اچھا شگن سمجھا تھا اور آج تو وہ بہت خوش تھے۔ کیونکہ راحین پہلے کی طرح تیار ہو کر ایک کانسرٹ اٹینڈ کرنے گئی تھی۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں ٹہلتے ہوئے ماتحتوں کو ہدایت دے رہے تھے اور بات کر رہے تھے۔ جب قد آور کھڑکی سے انہوں نے راحین کو واپس آتے دیکھا۔ وہ اتنی جلدی کیسے آ گئی؟ ابھی تو کانسرٹ شروع ہی ہوا ہو گا۔ شاہد نے تصدیق کے لیے اپنی گھڑی دیکھی۔

''ٹھہرو راحین۔'' شاہد گیلانی نے دروازے سے آواز لگائی۔

راحین اپنا پرس لان ٹیبل پر رکھ کر کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اسی کرسی پر اداس بیٹھا دیکھ رہے تھے پلنگ آ کر انہوں نے مہک کو کال کر کے بلایا تھا۔ مہک کے آنے سے اچھی تبدیلی آئی تھی۔ راحین نے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ لیکن آج وہ دوبارہ اس کرسی پر بیٹھنے جا رہی تھی۔ جیسے اداسی سے پھر سے تعلق جوڑ رہی ہو۔ شاہد گیلانی کو اسے روکنا ہی تھا۔

''تم جلدی کیوں آ گئیں؟'' شاہد گیلانی چلتے ہوئے لان میں آ گئے۔ پیچھے ان کی ہدایت کے مطابق ڈرائنگ روم کے بلائنڈز بند ہو چکے تھے۔

راحین نے مڑ کر اپنے باپ کو دیکھا۔ جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ شاہد گیلانی اب اس کے بالکل پاس پہنچ چکے تھے، اندر ڈرائنگ روم میں کروڑوں روپے کی ڈیل ہو رہی تھی۔ لیکن شاہد صاحب کے لیے صرف راحین اہم تھی۔ نوشابہ کے بعد انہوں نے خود کو کام میں لگا لیا تھا۔ راحین کو کچھ ہو جاتا تو کوئی بھی مصروفیت جینے کی وجہ نہیں بن سکتی تھی۔

''میرا وہاں دل نہیں لگا۔'' وہ خیالوں کی دنیا سے بولی۔

''کیوں؟ دوسرے لوگ نہیں آئے تھے؟'' شاہد صاحب کو اس کے لفظوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے۔

''سینکڑوں لوگ تھے وہاں بس ایک وہی نہیں آیا تو مجھے لگا وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔'' وہ معصومانہ انداز میں بولی۔ وہ باپ سے کچھ چھپانا جانتی ہی نہیں تھی۔

''کون ہے وہ؟'' شاہد گیلانی صاحب چونکے۔

اب اس کرسی پر بیٹھ کر یہی غور کرنے لگی تھی کہ ''نہ وہ میرا دوست ہے نہ ہمارے ذہن ملتے ہیں۔ نہ ہی مجھے اس کی عادت ہے۔ پھر اس کے آنے نہ آنے سے مجھے اتنا فرق پڑتا ہے؟ آپ کی اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں۔'' اس نے بچکانہ انداز میں سر ہلایا۔

''بیٹھو۔'' شاہد گیلانی مسکرائے۔ اور چہل قدمی کرتے ہوئے ٹیبل کے گرد دو چکر لگائے۔ جب انہیں لگا اچھا خاصا وقت گزر چکا ہے تو پھر وہ خود کرسی کھینچ کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

''کون ہے وہ؟'' شاہد گیلانی نے سگار جلا لیا۔

''یونیورسٹی سینیئر ہے۔'' راحین نے بتایا۔

شاہد گیلانی خاموشی سے کش لیتے رہے۔

''پھر غور کر لیا؟ کیا معلوم ہوا، تمہیں اس کے نہ آنے سے کیوں فرق پڑتا ہے؟'' راحین سے زیادہ

اس جواب میں شاہد گیلانی کو دلچسپی تھی۔

"وہ بہت پازیٹو انسان ہے۔ ہر چیز میں بہتری کا رخ تلاش کرتا ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ وقت بھی پازیٹو ہو جاتا ہے۔ آگ میں جھلس رہا ہوگا تو کہے گا چلو محسوس کرنے کی طاقت تو ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے تمہیں اب اپنے اس سینئر سے دوستی کر لینی چاہیے۔ تاکہ تم اس کی غیر حاضری پر یوں بیٹھ کر سوچنے کے بجائے فون اٹھا کر اس سے پوچھ سکو کہ وہ کیوں نہیں آیا۔"

شاہد صاحب نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا اور اندر جانے کے لیے اٹھ گئے۔

☆☆☆

ہمیشہ مثبت دیکھنے والا وہ شخص اس وقت مایوسی کے اندھیروں میں اندھا ہو رہا تھا۔ کہیں سے کوئی امید کی کرن بھی دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ وہ گھنٹوں مارا مارا پھرا تھا۔ اس نے ہر طرح سے سوچا تھا۔ لیکن اس مصیبت کا کوئی حل اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ فقیروں کے ساتھ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کتنی دیر سوچتا رہا۔ اسے کچھ سجھائی نہ دیا۔ وہ تنہا ہوتا تو سڑک پر زندگی گزار دیتا۔ مگر اس کے گھر والے بے سروسامانی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ آخر گھنٹوں پھرنے کے بعد وہ واپس گھر آیا تھا۔

"فواد بیٹا کرایہ لینے گئے تھے؟" رشید صاحب رات کے اس پہر بھی جاگ رہے تھے۔

"ابو...... وہ اسلم صاحب کو پیسوں کا کچھ مسئلہ ہو گیا ہے۔ ایک ہفتے کی مہلت مانگ رہے ہیں۔" وہ بائیک پارک کرنے کے بہانے نظر چرا گیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ ہمیں بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسروں کی سفید پوشی کا بھرم رکھتے کہیں اپنا پول نہ کھل جائے۔ یہ سات دن نہ جانے کیسے گزریں گے۔ بلوں اور فیسوں کی لائن لگ جاتی ہے۔" پیسوں کی حقیقی فکر تھی جو وہ وقت پر سو نہیں سکے تھے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے وہیل چیئر دھکیلتے چلے گئے۔

ہر حال میں باپ کا سہارا بننے کا عہد کرنے والے فواد میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ باپ کی وہیل چیئر کو سہارا دیتا۔

☆☆☆

"جسم پر چوٹ کا نشان ہونے کا مطلب ہے کہ جس چیز نے آپ کو زخم دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ آپ سے کمزور ہے۔ زخم بھر گیا اور آپ جیت گئے۔ اس لیے چوٹ سے نہیں گھبرانا۔"

اسٹیج پر ڈاکٹر موجود تھیں جو بہت ہمت باندھتی اچھی باتیں کر رہی تھیں۔

سامنے ہجوم میں راحین بیٹھی تھی۔ جس کو دوسروں کی سننے سے سخت چڑ تھی۔ پانی مٹی جذب کرتی ہے اور راحین ابھی لوہا تھی۔ اس کے اردگرد فصاحت کا خزانہ تھا اور اس نے خالی ہاتھ رہنا پسند کیا تھا۔ وہ شاہد صاحب کی ضد پر آئی تھی اور اس نے بھی ضد کر لی تھی کہ اپنا ذہن کسی صورت نہیں بدلے گی۔

"ہم اپنی بیماری کے پہلے دن اپنے رویے سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم نے وکٹم بننا ہے کہ سروائیور شارٹ ہیلی بریسٹ کینسر سروائیور تھیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد اپنے ہاتھ سے پیچ رنگ کے ربن بناتی تھیں جو بعد میں پنک ہو گیا۔"

وہاں ہر جگہ پنک تھی۔ پنک غبارے، پنک پھول، پنک لباس اور پنک ربن۔ راحین کو بھی کسی نے اندر آتے ہوئے پنک ربن پکڑایا تھا جو اس نے بیگ میں ڈال دیا تھا۔

"شارلٹ ہر ربن کے ساتھ پوسٹ کارڈ لکھتی تھیں جس میں لکھا ہوتا تھا کہ حکومت کا جو کینسر کا بجٹ ہے۔ اس کا صرف پانچ فیصد اس کی روک تھام میں خرچ ہوتا ہے۔ میرا بھی یہی المیہ ہے۔ کینسر کی روک تھام ہونی چاہیے اسے ارلی اسٹیج پر پکڑے جانا چاہیے۔ خواتین خود کو چیک نہیں کرتیں اور تب آتی ہیں۔ جب مرض پھیل چکا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر سچ میں کسی ہمدرد فرشتے کی طرح سمجھا رہی تھیں۔ مگر راحین نے سنی ان سنی کر کے اپنی جیب

سے اپنا موبائل نکال لیا۔ اس نے فواد کو ایک دن پہلے میسج بھیجا تھا نہ میسج نیلا ہوا تھا نہ ہی فواد کا لاسٹ سین اپ ڈیٹ ہوا تھا۔

''کسی گلٹی اور لمپ سے نہیں گھبرانا۔ زیادہ تر گلٹیاں بے ضرر ہوتی ہیں۔ لیکن چیک کروانا ضروری ہے۔ میں کہوں مٹر کا دانہ ہاتھ سے محسوس کریں تو آپ ہاتھ سے محسوس کر سکتی ہیں۔ لیکن وہی مٹر کے دانے جتنی گلٹی۔ آپ کی چھاتی گلے یا بغل میں ہوتی ہے تو آپ اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر جاتی ہیں۔ مٹر کے دانے جیسا سائز اسٹیج اول ہے۔ جو ننانوے فیصد تک قابل علاج ہے۔'' ڈاکٹر بول رہی تھیں اور راحین اب فرار کے راستے ڈھونڈ رہی تھی۔ اسے نوشابہ یاد آ رہی تھی۔ اچھے وقتوں کی نہیں برے وقتوں کی نوشابہ۔

''دوسری اسٹیج پر گلٹی ایک ننھی مومبی جتنی ہوتی ہے۔ جب سینے میں اتنی بڑی چیز موجود ہو تو ہم اسے بڑی آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ یقین کریں لوگ اول تو اپنا معائنہ ہی نہیں کرتے کہ اس کو شروع کی اسٹیج پر معلوم کر لیں اور اگر معلوم کر بھی لیں تو بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں آتے۔ علاج نہیں کرواتے عموماً لوگ میرے پاس مرض بگاڑ کر اور جسم میں پھیلا کر آتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

راحین کو لگا ڈاکٹر پرسنل اٹیک کر رہی ہیں۔ وہ بھی تو یہی سب کر رہی تھی۔ راحین نے نیچے سے اپنا بیگ اٹھایا اور اس میں جلدی سے اپنا موبائل ڈالا۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی اور اس جلد بازی میں ہی اس کا موبائل نیچے گرا اور ساتھ بیٹھی بڑی عمر کی خاتون کے پاؤں پر لگا۔

''ہائے۔'' بڑی بی نے آہ بھری۔ انہوں نے سر پر کس کے اسکارف باندھ رکھا تھا۔ کھلی قمیص بڑا سا دوپٹہ اپنے وزن سے زیادہ تو ان کے کپڑے تھے۔ خاتون کا جو ہاتھ نیچے اپنا پاؤں سہلانے گیا تھا۔ اس ہی ہاتھ سے انہوں نے موبائل اٹھا کر راحین کو پکڑایا۔

''بیٹا اسکرین تو نہیں ٹوٹ گئی؟'' آنٹی بہت اچھی تھیں۔ الٹا اس سے اس کے موبائل کا حال پوچھ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔'' راحین عادتاً سوری کہہ دیتی تھی۔ مگر جب آنٹی نے برا نہیں مانا تو اس نے بھی نہیں کہا۔

''بڑی پیاری بچی ہو۔ کیا نام ہے؟''

دیسی خواتین کی فالتو میں بے تکلف ہونے کی عادت۔ راحین نے اس لمحے کو کوسا جب اس نے باپ کی بات مان کر یہاں آنے کی ہامی بھری تھی۔ راحین نے دوبارہ موبائل کھولا تا کہ یہ مصروفیت کا تاثر دے سکے۔ وہ خاتون اب دوسری لڑکیوں سے بات کرنے لگیں۔ باتیں بھی وہ جو راحین کو اپنے معیار سے نچلی لگتی تھی۔ کھانے کی ترکیبیں اور ٹوٹکے۔ نہار منہ کیا پینا چاہیے۔ ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ لوگ پہلے بھی ہسپتال کے ایسے ایونٹس پر آ چکی ہیں۔ اور ایک دوسرے کے گھر بھی آتی جاتی رہتی ہیں۔

راحین کی کوفت میں اضافہ ہوا۔ ان لوگوں نے تو اس کو پکنک بنا رکھا ہے کیسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی ہیں۔ کوئی مصیبت سے گزری ہو تو انہیں زندگی کی بے رحمی کا اندازہ ہو۔ راحین ویسے بھی دوسروں کے بارے میں کم سوچتی تھی۔ اب تو ہنستے مسکراتے لوگ اسے مزید برے لگنے لگ گئے تھے۔

''کسی کے پاس کوئی سوال ہے؟'' ڈاکٹر کی پریزینٹیشن ختم ہو گئی تھی۔

''جی میں پروفیسر ذکیہ ہوں۔ گرلز کالج میں پڑھاتی ہوں۔''

راحین نے چونک کر دیکھا جب اس کے ساتھ والی سیٹ کی خاتون ہی اٹھ کر کھڑی ہوئی تھیں۔ پروفیسر؟ راحین کو اچنبھا ہوا۔ زبردستی اسکارف لپیٹنے والی وہ خاتون جب بولنے لگیں تو ان کا پروفیسر ہونا سمجھ میں آ رہا تھا۔ اردو اور پنجابی کا امتزاج راحین کو پہلی بار مزیدار لگا تھا۔

''میں نو سال سے کینسر سے صحت یاب ہوں۔ میرا کینسر بھی کافی آگے جا چکا تھا۔ ساری عمر نوکریاں

بھی کیں۔ بچے بھی پال لے۔ جب پچاس کی ہو کر معلوم ہوا اب کینسر بھی ہے تو سیاپا ہی ڈال گیا۔" ذکیہ کہتے ہی ہنسیں۔ ان کی دیکھا دیکھی سب ہنسے۔

راحین کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ کون لوگ تھے؟ اتنے مضبوط۔

"سیاپا ہی تو نہیں ڈالنا۔ ہمت کرنی ہے۔" ڈاکٹر بھی ہنسیں۔

"ہاہا...... جی جی مجھے سیاپا ڈال کر سمجھ میں آئی کہ کینسر کی جیت تب ہوگی جب وہ پھیل کر میرے حوصلوں تک آجائے گا۔ بس مجھے اس کو اپنے جذبے تک نہیں آنے دینا۔ اور دیکھیں آج میں یہاں ہوں۔" ذکیہ نے کہہ کر اپنے اردگرد والوں کو دیکھا۔ ان کے لیے زوردار تالیاں بجیں۔

راحین کے مزاج کو کافی ضرب لگی۔ وہ کم عمر تھی۔ اسٹائلش تھی۔ دنیا دیکھ چکی تھی۔ وہ جب آئی تھی تو خود کو اس مجمعے کی سب سے برتر مخلوق سمجھ رہی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا۔ یہ نان برینڈڈ کھدری پیس سوٹ والی عورتیں کتنی عظیم تھیں۔ اس کو اپنی سوچ چھوٹی لگی تھی اور اپنا وجود بونا۔

"اب تو علاج بہت بہتر ہو گیا ہے۔ کھانے کی گولیاں آ گئی ہیں۔ صرف کینسر والے حصے کو ٹارگٹ کرتے ہیں۔ تب تو کیمو سے میرا پیٹ خراب ہو جاتا تھا میرے چھالے پڑ جاتے تھے۔ الٹیاں، درد، کمزوری نہ جانے کیا کیا تھا۔ ان سب سے میں اس عمر میں گزری۔ جتنا پیار اس وقت مجھے سب نے دیا۔ وہی مجھے پار لے کر گیا تھا۔"

وہ بول رہی تھیں اور راحین سوچ رہی تھی۔ اپنے؟ پیار؟ یہ کیا ہوتا ہے؟ کہاں سے ملتا ہے؟ راحین اب تڑپی تھی۔ وہ خاتون بیٹھ گئیں۔ راحین جلدی میں اپنا سامان دیکھنے لگی۔ اس کے لیے اب یہ سب ناقابل برداشت تھا۔

"آپ کو برے دن سے گزر کر اچھے دن حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ ہمیں پروفیسر ذکیہ آپ پر فخر ہے۔" ڈاکٹر بول رہی تھیں۔ تب تک راحین دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

"ذیابطیس کا علاج نہیں ہے۔ بریسٹ کینسر کا علاج ہے۔ بہت اچھا علاج ہے۔ لیکن میں کسی کو اختیار دوں کہ بریسٹ کینسر ہو یا ذیابیطس تو وہ ذیابیطس لیں گے۔ آخر کیوں؟ ایک ایسی بیماری لیں گے جو ساری عمر قابل علاج نہیں ہوگی۔ ذرا سوچیں ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ وہ جانتے ہی نہیں کینسر کا مکمل علاج ممکن ہے۔"

راحین نے یہ آخری الفاظ نہیں سنے تھے۔ وہ تب تک نکل کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

فواد اور صارم پولیس اسٹیشن سے بہت مایوس نکلے تھے۔ ان کی ایف آئی آر نہیں کٹی تھی۔ جو ایف آئی آر نہیں کاٹ رہے تھے آگے کارروائی کیسے کرتے۔

"ان سب غنڈوں کے بااثر سرپرست ہوتے ہیں۔ پولیس بھی ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتی ہے۔" صارم نے وہ کہا جو فواد سوچ رہا تھا۔

"پھر عدالتوں سے امید لگانا تو بے وقوفی ہے۔ ایسے کتنے کیس سالوں سے پڑے ہیں۔ میں کیا کروں؟ میرے باپ کی زندگی کا واحد سہارا وہ گھر ہے۔" فواد نے بے بسی سے اپنے بال نوچے۔

"پچپن لاکھ بہت بڑی رقم ہے۔ سب مل کر بھی اکٹھی کریں گے تو بھی پوری نہیں ہوگی۔" صارم کوئی بھی حل سوچنے میں ناکام ہو رہا تھا۔

"اس استاد نے غلطی کی۔ اسے اندازہ نہیں کہ کمزور اپنی حلال کمائی بچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔" فواد نے مٹھی بھینچ کر کہا۔ اس کے اردگرد اسلحہ لیے سپاہی گھوم رہے تھے۔

"نہیں فواد بھائی! جذباتی ہو کر کوئی غلط قدم مت اٹھایئے گا۔" صارم بھی فواد کے جنونی پن سے گھبرایا تھا۔

"تو کیا بیٹھ کر کسی معجزے کا انتظار کروں؟ سیدھی انگلی سے کام نکلوانے والوں کو بھی نہ کبھی

انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ ورنہ ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔" وہ مرنے مارنے پر اترا ہوا تھا۔ جو کے اس کی طبیعت نہیں تھی۔

"فی الحال آپ یہ رکھیں۔ انکل سے کہیے گا۔ کرائے دار نے دیے ہیں۔ ایک مہینہ تو پردہ رہ جائے گا۔" صارم نے جیب سے اچھی خاصی رقم نکال کر فواد کو تھمائی۔

"صارم تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ نہیں یہ تمہارے ہیں میں نہیں لے سکتا۔" فواد نے واپس کرنے کی کوشش کی۔

"آپ بڑے بھائی ہیں۔ استاد ہیں میرے۔ آپ کا حق اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پلیز انکل کی خاطر رکھ لیں۔" صارم نہیں مانا اور رقم دے کر ہی ہٹا۔

فواد نے رقم جیب میں ڈالی اور آنکھیں ملنے لگا۔ اس کو اب سمجھ میں آئی کہ رشید صاحب گھر بیچنے سے کیوں گھبراتے تھے۔ ہاتھ پھیلانا دل کا سکون برباد کر دیتا ہے۔

☆☆☆

وہ سیاہ کپڑوں میں بیٹھی تھی۔ گھٹنوں کو سینے سے لگائے۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں نے خشک ہونے کے بعد سفیدی چھوڑ دی تھی۔ شاہد گیلانی نے آ کر جب اسے اس حال میں دیکھا تو اسے زبردستی بھیجنے پر بہت پچھتائے۔

"تم مرض دیکھ رہی ہو۔ علاج نہیں دیکھ رہیں۔" شاہد گیلانی اس سے بھی زیادہ تھک جاتے تھے۔

"میری ماں کو کینسر تھا۔ میرا کینسر جینٹک ہے۔ میرا علاج ان سب کے علاج سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ میں علاج کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔" راحین یہاں سے بھی بھاگنا چاہتی تھی۔

"پھر زندگی کو دیکھو۔ تمہارے پاس بیسٹ سے بھی بیسٹ موجود ہے۔ میں تمہیں دنیا کے سب سے اچھے ہسپتال لے کر جاؤں گا۔" شاہد گیلانی کے پاس پیسے کی جو لاٹھی تھی وہ یہاں چل کر ہی نہیں دے رہی تھی۔

"مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ الجھ گئی ہوں۔ میں اس زندگی میں ایک بھکاری ہوں۔ میرے پاس فیملی نہیں ہے۔ ایسے فرینڈز نہیں ہیں جو میرا ساتھ دیں۔ ڈیڈ ہم غریب ہیں۔ یہ دکھ جھیلنے والے تنہا نہیں ہوتے، وہاں سب سروائیورز کے پاس لوگ تھے ان کا خیال رکھنے کے لیے۔ میرے پاس کوئی نہیں ہے۔" راحین سچ میں تڑپ رہی تھی۔

شاہد صاحب یک دم کنگال ہوئے۔ ان کی بیٹی جو مانگ رہی تھی وہ ان کے لیے لانا ناممکن تھا۔ انہوں نے راحین کو اپنے پاس کیا۔

"وہ لڑکا کیا نام تھا اس کا؟ کانسرٹ والا۔ وہ کیوں نہیں آیا؟ تم نے معلوم کیا؟" شاہد صاحب نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"گاڈ نوز جواب ہی نہیں دے رہا۔" راحین کچھ دیر پہلے بھی واٹس ایپ دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کے میسج کے آگے لگے ٹک بلیو ہو جائیں۔ مگر وہ نہیں ہوئے۔ نہ جانے وہ کہاں تھا۔

☆☆☆

وہ بینچ پر گم سم بیٹھا تھا جب راحین اس کے سامنے آ گئی تھی۔

"ہیلو۔" آج اس نے بال باندھ رکھے تھے۔

"اوہ آپ کا بینچ۔" فواد گہری سوچ سے نکلا تھا۔ راحین کو دیکھ کر اس کو پہلا خیال بینچ دینے کا ہی آیا۔

"نہیں آپ بیٹھیے مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔" راحین اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"آپ مجھے اس دن ہاسپٹل لے کر گئے تھے۔ میں آپ کے لیے تھینک یو گفٹ لائی ہوں۔" کل پوری شام اس نے بیسٹ گھڑی ڈھونڈی تھی اور فواد کے لیے لے کر آئی تھی۔

فواد نے مروت میں ڈبہ کھولا۔ گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ وقت کی ریت پھسل رہی تھی۔ اس

کے پاس وقت ہی تو نہیں تھا۔ گھڑی کی سویاں کسی تلوار کی طرح اس کی رگیں کاٹنے لگیں۔ وہ چمکتی گھڑی اسے غصہ دلا گئی۔ کچھ لوگ اتنے مجبور ہوتے ہیں کہ چینی کے دانے بھی ہیروں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور کچھ اتنے امیر ہوتے ہیں کہ دولت لٹاتے پھرتے ہیں۔ وہ چاہ کر بھی کوئی مثبت خیال دل میں نہیں لا سکا۔

"میرا وقت اتنا قیمتی نہیں کہ ایسی مہنگی گھڑی پہنوں۔ میرے لیے تو یہی کافی ہے کہ اللہ نے کسی کی مدد کا موقع دیا۔ اس سب کی ضرورت نہیں۔" وہ جبری مسکرایا اور گھڑی واپس کر دی۔

"میں یہ آپ کے لیے لائی ہوں۔ آپ نہیں لیں گے تو پھینک دوں گی۔" اس کو برا لگا تھا۔ اس نے رعب سے کہا۔

"وہ آپ کا فیصلہ ہے۔" فواد رعب میں نہیں آیا۔

"پیار سے دیے گئے تحفوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرتے۔" وہ اکڑی۔

"پیسے سے چیزیں ملتی ہیں خلوص نہیں۔" فواد بھی بضد تھا۔

وہ صحیح کہتا تھا جو چیزیں پیسوں سے نہیں ملتیں وہ روگ لگا دیتی ہیں۔ راحین کا دل ٹوٹ گیا۔ لیکن راحین گیلانی کو ٹکا سا جواب سننے کی عادت نہیں تھی۔

"میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی ہوں۔" راحین نے ایسا کہا جیسے اعزاز بخش رہی ہو۔

اب کے فواد سچ میں زچ ہو گیا تھا۔

"مس راحین، ہماری دوستی نہیں ہو سکتی۔ میں ایک سینئر کے طور پر ہمیشہ حاضر رہوں گا۔ مگر میری تربیت میں یہی شامل ہے کہ لڑکا لڑکی دوست نہیں ہوتے۔ آپ اسی سے اندازہ لگا لیں کہ ہم کتنے مختلف ہیں۔" وہ ذہنی کشمکش کے باعث کسی بھی بات کی گہرائی میں نہیں جا رہا تھا۔

"میری کلاس کا ٹائم ہو گیا ہے۔" فواد بیگ اٹھا کر کھڑا ہوا۔

"ابھی نہیں ہوا۔" راحین بھی اس ہی یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔

"مجھے جانا ہے۔" فواد نے کہا۔

"ابھی نہیں پہلے اپنی ایک جونیئر کو ایک بات سمجھا دیں۔ آپ مہنگے تحفے نہیں لیتے۔ کہتے ہیں کچھ چیزیں پیسوں سے حاصل نہیں ہوتیں۔ پھر آپ کی دوستی جیسا کچھ انمول مانگ لو تو وہ بھی نہیں دیتے۔ جو چیزیں پیسوں سے حاصل نہیں ہوتیں وہ کیسے ملتی ہیں؟" راحین سوالی بنی کھڑی تھی۔

فواد اسی لیے اس کے پاس زیادہ دیر نہیں رہتا تھا۔ وہ متاثر کر دیتی تھی اور وہ متاثر ہونا نہیں چاہتا تھا۔ بہت دیر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر فواد نے کچھ بولنے کے لیے منہ کھولا۔

"نہیں ابھی نہیں۔ کلاس کے بعد میرے ساتھ کافی پر چلیے گا۔ وہاں اس کا جواب لوں گی۔ اور آئیے گا ضرور ورنہ میں سمجھوں گی ایسا کچھ نہیں جو خلوص سے حاصل ہوتا ہو۔" راحین یہ کہہ کر لمحہ بھر بھی رکی نہیں اور چلی گئی۔

اگر کوئی انسان تھا جس کو وہ خود اپنے سینے میں موجود سرطان کا بتانا چاہتی تھی تو وہ فواد تھا۔

☆☆☆

صارم کے ہاتھ میں اسکالرشپ قبولیت کا خط تھا اور سامنے اعداد و شمار کی لسٹ اس کو سو فیصد اسکالرشپ نہیں ملی تھی۔ ایک بڑا حصہ اسے اپنی جیب سے دینا تھا۔ وہ یہ رقم عرصے سے جوڑ رہا تھا اور پوری بھی ہو چکی تھی۔ مگر اس کا ایک اہم جز وہ فواد کو دے آیا تھا۔ وقت کم تھا۔ اسے جو رقم چاہیے تھی وہ کوئی قیمتی اثاثہ بیچے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے ماں کا زیور بیچنے سے زیادہ موقع گنوانا قبول تھا۔ اس کا سمسٹر فریز نہیں ہو رہا تھا نہ ہی وہ رقم اکٹھے ہونے کے بعد جا سکتا تھا۔ اسے اگلی بار دوبارہ اپلائے کرنا تھا اور قسمت کی مہربانی کا انتظار کرنا تھا۔ مگر اس نے پھر بھی یہ راہ چنی تھی۔

"جانتا ہوں سائرہ تم میرا انتظار نہیں کرو گی۔"

لیکن میں بھی مجبور ہوں تم سے محبت نبھانا چھوڑ نہیں سکتا۔" زندگی کا سنہرا موقع اس کی خاطر قربان کر کے وہ یونیورسٹی کو معذرت کی ای۔میل لکھنے لگا۔ سائرہ جانتی ہی نہیں تھی کہ اس کی محبت اتنی سچی ہے کہ قربانیاں بتاتی بھی نہیں۔

☆☆☆

فواد راحین کے ساتھ قدم ملاتے پارکنگ میں داخل ہوا۔

"لیجیے میری سواری تو آ گئی۔" فواد کی بائیک پہلے آئی تھی۔

"نیا پینٹ کروا کر بالکل نئی لگ رہی ہے۔" فواد نے بائیک کی سیٹ پر ہاتھ پھیرا جہاں راحین نے کبھی ڈوگ لکھا تھا۔

"وہ واقعہ یاد نہ کروائیں۔ ورنہ آپ کو میرے ساتھ دو کپ کافی پینی پڑے گی۔ ایک جواب دینے کے لیے اور ایک سوری قبول کرنے کے لیے۔" وہ بھی پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی تھی۔

"ویسے میں بائیک پر نہیں بیٹھتی۔" راحین نے یاد کروایا۔

"مجھے یاد ہے لیکن آپ پھر بھی نہیں سمجھ رہیں کہ جب ہماری سواریاں ایک سی نہیں ہوسکتیں تو منزل ایک کیسے ہوگی؟" وہ اس بات کو سمجھ چکا تھا۔ راحین کو سمجھانا بھی اب ضروری لگ رہا تھا۔ راحین نے نظریں چرائیں وہ یہ بات سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"ٹریٹ میری ہے تو گاڑی بھی میری ہو گی۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

اب وہ خود ڈرائیو نہیں کرتی تھی۔ بلکہ ڈرائیور کے ساتھ یونیورسٹی آنے لگی تھی۔ اس نے گاڑی کے شیشے پر دستک دی۔ وہ معمول سے جلدی آ گئی تھی۔ شکور مزے سے اے۔سی لگا کر گانے سنتے ہوئے، گاڑی میں سگریٹ پی رہا تھا۔ راحین کو دیکھ کر اٹھ کر باہر نکل آیا۔ راحین ویسے ہی نازک مزاج تھی۔ سگریٹ کی بو آئی تو کھانسنے لگی۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ گاڑی میں سگریٹ پی رہے ہو؟" اس نے پرس سے پانی نکال کر پیا اور بوتل غصے سے نیچے پھینکی۔ وہ ذاتی استعمال کی چیزوں میں پلاسٹک کا استعمال نہیں کرتی تھی۔ وہ کانچ کی بوتل میں پانی لائی تھی۔ اس نے پھینکی تو بوتل ٹوٹ کر گری۔ چھینٹے فواد تک بھی آئے تھے۔

"یہ تمہارا سرونٹ کوارٹر نہیں ہے جہاں گند کی عادت ہو۔ میری گاڑی ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولی تھی۔

"چیخنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹیک اٹ ایزی۔" فواد نے آہستگی سے سمجھایا۔

"نہیں آرام سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بند گاڑی میں دھواں دھواں کر دیا ہے۔" اس کا دھیما لہجہ بھی روح قبض کرنے والا لگتا تھا۔

"باجی میں ابھی ایئر فریشنر کر دیتا ہوں۔" شکور نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"پہلے بھی یہی کرتے ہو گے۔ یہاں ہر کوئی اپنی اوقات سے باہر ہے۔" راحین کا غصہ آسمان پر تھا۔

"وہ آپ سے بڑے ہیں۔" فواد کو ایک محنت کش انسان کی بے عزتی میں اپنی تذلیل محسوس ہو رہی تھی۔

"عمر میں بڑے ہونے کا کیا فائدہ اگر عقل ہی نہیں ہے۔ ایڈیٹ آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے۔" راحین نے منہ پھیرا تاکہ غصہ ٹھنڈا ہو سکے۔

شکور سر جھکائے کھڑا تھا۔ اردگرد موجود دوسرے لوگوں نے بھی اس کی عزت افزائی دیکھی تھی۔

"میں تو شاید کچھ بھی نہیں جانتا۔ مجھے چلنا چاہیے۔ جب آپ کو ہر چیز اتنی شان دار چاہیے تو دوست مجھ جیسا معمولی کیسے رکھ سکتی ہیں۔" وہ جانے لگا۔

راحین ایک دم سے نرم پڑ گئی تھی۔

"فواد آپ میرے نزدیک معمولی نہیں ہیں۔"
راحین کو فواد کا انداز عجیب لگا تھا وہ اس کے بجائے ایک ڈرائیور کی سائیڈ لے رہا تھا۔
"آج معمولی نہیں ہوں کل ہو جاؤں گا۔ میں دن میں اسٹوڈنٹ ہوں تو شام میں ایک ایسے اسٹور کا دکاندار ہوں جہاں قدم رکھنا بھی آپ کی شان کے خلاف ہوگا۔"
وہ تحمل سے سمجھانے کا عادی تھا۔ مگر اب اسے لوگ صرف دو طرح کے نظر آ رہے تھے۔ یا تو اپنے جیسے بے بس یا جیلے استاد جیسے طاقت ور بد قسمتی سے اس وقت راحین طاقت وروں میں سے تھی۔
"وہ غلطی ڈرائیور کی تھی۔" اپنے رویے کی وضاحت دیتے ہوئے اس کا لہجہ سخت ہوا تھا۔
"آپ کی عزت اہم ہے تو دوسروں کی بھی ہے۔ دوسروں کو کچرے کا ڈھیر سمجھ کر ان پر تھوکنا نہیں چاہیے۔"
وہ یہ سب تب کہتا جب راحین نے سیڑھیوں کے نیچے بالٹی رکھی تھی یا بائیک پر پینٹ کیا تھا تو وہ سن بھی لیتی۔ لیکن ایک ڈرائیور کی وجہ سے ذلیل ہونا اسے قبول نہیں تھا۔
"میرے سامنے کسی کو ایک لفظ بولنے کی اجازت نہیں آپ کے دل میں جو آتا ہے آپ کہہ رہے ہیں اور میں سن رہی ہوں۔ کیوں کہ آپ کے ساتھ میرا رویہ مختلف ہے۔" اس کے چہرے کے تناؤ کے باعث جذبات غیر واضح ہی رہے تھے۔
"آپ کا شکریہ، سوری میں نے سب قبول کر لیا۔ اس سے پہلے کہ آپ مجھے بھی بیچ سڑک پر ڈانٹ کر میری کسی غلطی کا تماشا بنائیں۔ عقل مندی اسی میں ہے کہ میں اپنی اوقات جان کر خود اپنا راستہ الگ کر لوں۔ خدا حافظ۔" وہ اپنی ساری بے بسی کا غصہ اس پر اتار کر چلتا بنا تھا۔ وہ لوگ جو شکور کا تماشا دیکھنے لگے تھے انہوں نے راحین کی تذلیل بھی ہنس کر دیکھی تھی۔ راحین رو ہوئی کھڑی تھی۔ اس نے اردگرد دیکھا تو صرف ایک شکور ہی تھا جو نہیں ہنس رہا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راحین کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گئی تھی۔ لیکن گھر پہنچ کر اس نے پورا گیلانی ہاؤس تہس نہس کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس نے آرام بھی نہیں کیا اور سیدھا اسٹور پر آ گیا تھا۔
"تم آ گئے ہو تو میں چلتا ہوں۔" منیر اپنی ضروری چیزیں سمیٹنے لگا تھا۔
"چچا آپ اسٹور بڑا کرنے کے لیے پیسے جمع کر رہے تھے۔ کتنی سیونگ ہوئی ہے؟" اس نے کاؤنٹر سنبھال لیا تھا۔
"ہاں بھئی ارادہ تو یہی تھا لیکن خدا خوفی بیچ میں آ گئی۔ میری روزی سے دوسروں کی چھت اہم ہے۔ میرے ہم زلف کا جو بھائی ہے اس بچارے کے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ بچیوں والا خاندان ہے۔ کہیں ایک کمرہ لے کر رہ رہے تھے بے پردگی ہو رہی تھی۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے پرسوں ہی اس کو ادھار کا چیک کاٹ کر دیا ہے۔ جتنی جمع جوڑ تھی سب اس کو دے دی۔ بلکہ تمہاری چچی سے بچا کر اپنی امی کا ایک ہار رکھا تھا۔ وہ بھی بیچ دیا۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔ آج ہی اس کا فون آیا تھا۔ مزدور لگ گئے ہیں۔"
وہ خوش ہو کر اپنی کامیابی بتا رہے تھے اور فواد کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔

☆☆☆

ملازمہ کی کال پر وہ سب چھوڑ چھاڑ آئے تھے۔ راحین کے کمرے میں اٹھنے والے جس طوفان کا اس نے بتایا تھا وہ تھم چکا تھا۔ لیکن غائب نہیں ہوا تھا۔ شاہد گیلانی نے راحین کے کمرے میں پہلا قدم رکھا تو ان کے قدموں تلے کانچ چبھا۔ راحین نے اپنے تمام پرفیوم اور ڈیکوریشن پیس دیواروں پر مار کر توڑ دیے تھے۔ کمرے کی ایک بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔
شاہد گیلانی کے محبت سے دیے ہوئے جیولری کے تحفے اور راحین کی اپنی پسند سے خریدی گئی تمام

قیمتی چیزیں شاہد کے پیروں تلے کچلی جارہی تھیں۔ وہ کھڑکی کے قریب لیٹی تھی اور کھلی کھڑکی سے آسمان دیکھ رہی تھی۔ شاہد بہت ڈرتے ہوئے اس کے پاس پہنچے تھے۔ وہ جھک کر وہیں فرش پر اس کے پاس بیٹھ گئے۔ وہ تسلی دینے والوں میں سے نہیں تھے نہ ہی وہ ڈانٹ کر اسے ہوش کرنے کا کہہ سکتے تھے۔ راحین کی ہر تکلیف کو وہ اس سے کئی گنا زیادہ محسوس کرتے تھے۔ اس لیے اس سے زیادہ لاچار ہو جاتے تھے۔ راحین باپ کی آمد محسوس کر چکی تھی۔

''ارحم کے ساتھ مجھے وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ مگر فواد کی خاطر میرا دل کرتا تھا کہ میں خود کو بدل ڈالوں۔'' وہ بغیر پوچھے کہنے لگی۔

اس کی زبان رندھی ہوئی تھی۔ اگر لفظوں سے بیان نہ ہو رہا ہوتا تو بھی اس کا کرب ٹوٹے لہجے سے عیاں ہو جاتا۔ شاہد گیلانی کو لگا تھا اس نے کینسر کا غصہ کمرے پر نکالا تھا۔ مگر یہاں تک قصہ ہی اور تھا۔

''ارحم سے مجھے دوستی چاہیے تھی۔ جو لوگ دوست نہیں بنتے۔ وہ دل سے اتر جاتے ہیں۔ جیسے ارحم اتر گیا تھا۔ اس سے مجھے دوستی نہیں چاہیے تھی۔ اب بھی مجھے اس سے محبت چاہیے تھی۔ اسی ہی لیے اس کا ٹھکرانا برداشت نہیں ہو رہا۔ ڈیڈ میں مر جاؤں گی۔'' اس نے کرب سے کہا پھر پاگلوں کی طرح ہنس دی۔

''اچھا ہی ہے میں پہلے ہی مر رہی ہوں۔'' وہ زور سے ہنس رہی تھی۔

''کیا نام ہے اس کا؟'' شاہد گیلانی کا سر پھٹ رہا تھا۔

''فواد رشید۔'' راحین نے ان لفظوں کو اپنے لبوں پر محسوس کیا۔ اسے یہ نام لینے کا حق نہیں تھا۔ یہ حق بھی وہ چیز تھی جو پیسوں سے نہیں ملتی تھی۔ سب کچھ توڑ کر بھی ابھی اس کا جنون ختم نہیں ہوا تھا۔

''اس فواد کا مسئلہ کیا ہے؟'' یہ جو بھی تھا۔ اس لمحے سے شاہد گیلانی کا بدترین دشمن بن چکا تھا۔

''مجھے ہمارے بیچ کا فرق نظر آنا بند ہو چکا ہے۔ لیکن وہ ہمارے بیچ کے فاصلے ہی گنتا رہتا ہے۔'' وہ سسکی۔

''اس نے تمہارا برین واش کر دیا ہے۔ تمہیں بھلا دیا ہے کہ تم کیا ہو۔'' شاہد گیلانی نے بیٹی کو سہارا دیا۔

''میں جو بھی ہوں۔ فواد کو پسند نہیں ہوں۔ وہ مجھے خود سر، گھمنڈی کہتا ہے۔ میرے کام کرنے میں اسے خامیاں نظر آتی ہیں۔ اس کی مدد کرنا چاہوں تو کہتا ہے میں پیسے کی نمائش کر رہی ہوں۔ اونچا بولوں تو بدتمیز سمجھتا ہے۔ پیار سے بولوں تو اسے قدر ہی نہیں ہوتی۔'' وہ اٹھ کر دیوار سے چپٹ کر بیٹھ گئی۔

''کم آن ایک سرپھرے لڑکے کی باتوں میں تم نے اپنا یہ حال کر دیا ہے؟'' شاہد گیلانی کو یقین نہیں آیا تھا۔

''سرپھرا ہوتا تو میں بھی ہنس کر چل دیتی۔ پوری دنیا میں ایک وہی ہے جو ٹھہر کر مجھے نہیں دیکھتا اور پوری دنیا میں وہی ہے جس کی توجہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ دل کرتا ہے کہ وہ مجھ سے بات کرے۔ مجھے وہ ہر حال میں چاہیے تھا۔ اور وہ مجھے کبھی نہیں مل سکتا۔''

شاہد گیلانی تڑپ اٹھے۔ کینسر کا علاج تو مل گیا تھا اس درد کی دوا وہ کہاں سے لاتے۔

''تم اتنی کمزور کب سے ہو گئیں؟ اس کا منہ توڑنے کے بجائے اس کا غم منا رہی ہو۔'' شاہد صاحب نے رعونت سے کہا۔

''جب سے معلوم ہوا ہے کہ میری بغل میں ایک کینسر زدہ ٹیومر ہے۔ جس کی شاخیں میرے سینے سے نکلتی ہیں۔ تب سے میں کمزور ہو گئی ہوں۔ یہ تو فواد کو دیکھ کر یاد آتا ہے کہ میری سینے میں ایک دل بھی ہے۔'' اس نے بہت معصومیت سے کہا۔ شاہد گیلانی کو اس پر بے انتہا پیار آیا۔

بیٹی کے آنسو ان کے دل میں کھبے تھے۔ اب ان آنسوؤں کا حساب لینے کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ میڈیکل اسٹور سے دوائیاں لے کر نکل رہا

تھا جب اس کو دو مضبوط مردوں نے زبردستی ایک گاڑی میں دھکیلا اور لے گئے۔ گھر میں بیٹھی غزالہ کا اچانک دل پریشان ہونے لگا۔ فواد نہیں آیا تھا۔ انہوں نے فون کروایا فون بند تھا۔ تو انہیں ہول اٹھنے لگے۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھا دیر سویر ہونا تو معمول تھا۔ مگر غزالہ کے دل کو چین نہیں آرہا تھا۔

وہ پورے ہوش میں اس آفس کے شاندار کاریڈور سے گزر کر سب سے اہم کمرے میں آیا تھا۔ جہاں اپنی نشست پر بیٹھے اس گیلانی کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ شاہد گیلانی اپنے ہاتھوں میں موجود قلم تیزی سے ہلا رہے تھے۔ فواد کے آتے ہی ان کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے شاہد کو اور اویس کو ایک نظر میں پہچانا تھا۔ اسے لے کر آنے والے دونوں آدمیوں کو اویس لے کر باہر چلا گیا تھا۔

''بہت شان دار آفس ہے آپ کا لیکن یہاں کے اصول عجیب ہیں۔ لوگوں کو دعوت دے کر بلایا کیجئے تاکہ اغوا کر کے۔'' وہ دونوں پاؤں پر وزن ڈالے اعتماد سے شاہد گیلانی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''میں ملنے سے پہلے ہی باور کروا دینا چاہتا تھا کہ تمہارے سامنے انکار کا آپشن نہیں ہے۔'' وہ حاضر جوابی دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔

''اس مشقت سے ہمیں دوبارہ نہ گزرنا پڑے اس لیے فرمائیے۔ آپ نے کیوں بلایا ہے؟'' وہ بے زار تھا۔

''بہت ہمت ہے تم میں۔ اپنی جان کی فکر کرنے کے بجائے مجھ سے سوال پوچھ رہے ہو؟'' شاہد گیلانی نے تعجب سے دیکھا۔

''میری جان جس کے قبضے میں ہے، اس کے سامنے روز سجدے کرتا ہوں۔ اس کی مرضی کے بغیر آپ مجھے انگلی بھی نہیں لگا سکتے۔'' فواد نے صداقت سے کہا۔

شاہد صاحب کے اعصاب ڈھیلے پڑے تھے۔ ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ راحین کو اس لڑکے میں کیا نظر آیا تھا۔

''بیٹھو......'' انہوں نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ فواد بغیر کسی تامل کے بیٹھ گیا۔

''یہ جس کرسی پہ تم بیٹھے ہو۔ اس پر روز کوئی جاگیردار سیاستدان یا منسٹر بیٹھا ہوتا ہے۔ میرے سامنے بیٹھ کر اپنی ضرورتوں کے لیے گڑگڑاتے ہیں۔'' شاہد گیلانی کو لگا تھا۔ وہ ان کے رتبے کو پہچان نہیں پایا۔

''کیا اس ملک میں ضرورت مند ختم ہو گئے ہیں یا آپ میں ان کے مسئلے حل کرنے کی طاقت نہیں رہی جو آپ اپنا قیمتی وقت مجھ پر ضائع کر رہے ہیں۔'' فواد، شاہد گیلانی کو اچھی طرح پہچان گیا تھا لیکن مرعوب نہیں ہوا تھا۔

''میرے لیے سب سے قیمتی ہے میری بیٹی جس کو تم نے اتنا غم دیا ہے کہ میرا بس نہیں چل رہا تمہاری گردن دبوچ لوں۔'' شاہد گیلانی نے غصے سے مٹھی میں ہوا پکڑی۔

فواد ایک باپ کو دیکھ کر نرم پڑا۔

''میں نے مس راحین کو کبھی کوئی تکلیف نہیں دی۔ بلکہ میں نے تو ہمیشہ ان کی غلطیوں کو نظر انداز کیا ہے۔'' اس نے مصلحت سے کہا۔

''اسے نظر انداز کرنا تمہاری سب سے بڑی حماقت ہے۔'' وہ اس کو ٹٹول رہے تھے کہ آدمی کھرا ہے یا کھوٹا۔

''وہ ایک ضدی گھمنڈی بگڑی ہوئی امیرزادی ہیں۔ لیکن آپ سے مل کر احساس ہو رہا ہے کہ اس سب میں ان کا کوئی قصور نہیں۔'' اسے راحین ایک دم سے قابل رحم لگنے لگی تھی۔

''جن کی مٹھی میں دنیا ہوتی ہے وہ اپنی اولاد کو خواہشیں مارنا نہیں سکھاتے۔'' وہ اپنی تربیت پر انگلی اٹھانے والے کو اسی لیے برداشت کر رہے تھے کیوں کہ انہوں نے راحین کو خواہشیں مارنا نہیں سکھایا تھا۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' وہ تنگ آنے لگا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم راحین سے شادی کرلو۔" شاہد نے کہااور راحین کی خواہش تو فواد ہی تھا۔

"کیا؟" فواد پہلی بار غیر آرام دہ ہوا تھا اور شاہد گیلانی سکون سے ٹیک لگائے اس کی بے سکونی دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

رات کے سناٹے میں کوئی نظم پڑھ رہا تھا۔

لوٹ آئے گا پھر بچپن ہاتھ میں رہے غبارے تو
مل جائے گی ہر تتلی اڑنے لگے شرارے تو
مردہ تن جی اٹھتے ہیں اپنے بنیں سہارے تو

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر آواز کی سمت چلنے لگی۔

"حسن؟" سرونٹ کوارٹر کے باہر بیٹھے بچے کو پہچاننے میں اسے دقت ہوئی تھی اس نے اسے چند سال بعد دیکھا تھا۔

"سلام راحین باجی!" حسن کو کوئی دقت نہیں ہوئی وہ تو روز اسے دیکھتا تھا۔

"کیا پڑھ رہے ہو؟" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے اب بھی وہی کپڑے پہن رکھے تھے جو یونیورسٹی پہن کر گئی تھی۔ بہتے آنسوؤں نے جو حالت بگاڑی تھی وہ اندھیرے میں چھپ گئی تھی۔ اس وقت اسے صرف تنہائی سے چھٹکارا چاہیے تھا۔ خواہ ساتھ دینے والا آٹھ سال کا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

"اسکول کا سبق یاد کر رہا ہوں۔"

"اچھا تم اسکول جاتے ہو، بہت اچھی بات ہے۔" راحین نے خوش ہو کر کہا۔

"میں تو نہیں جانا چاہتا میں تو ابا کی طرح بننا چاہتا ہوں۔ پر ابا ڈانٹ کر اسکول بھیجتا ہے۔ کہتا ہے کہ پڑھو گے نہیں ڈرائیوری کرو گے تو لوگوں کی گالیاں سنو گے۔"

وہ شکور کا بیٹا تھا۔ راحین کو اپنا صبح کا رویہ یاد آیا۔

☆☆☆

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" فواد کو یہ پیش کش سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"جھوٹ بولنے کی مجھے ضرورت نہیں پڑتی اور مذاق کی میری عادت نہیں ہے۔" وہ ہر لحاظ سے سنجیدہ تھے۔

"کیا ایسا راحین نے کہا ہے؟" فواد کو شک گزرا۔

"وہ اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں ہر حال میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی خوشی فی الحال تم سے جڑی ہے۔" شاہد صاحب نے بتایا۔

"میں کوئی چیز نہیں ہوں جس پر آپ کی بیٹی نے انگلی رکھی اور آپ اسے دلوانے چل پڑے۔" خود پسندی میں اتنی شدت۔ اس نے تو سنا تھا فرعون صدیوں پہلے غرق ہو چکا ہے۔

"یہ دفتر دیکھ رہے ہو۔ اس میں تمہاری نوکری پکی۔ اپنی تنخواہ تم خود مقرر کرو گے۔ اس کے ساتھ جو کچھ چاہیے کاغذ پر لکھ دو۔ میں دیکھے بغیر سائن کر دوں گا۔"

"مجھ سے زیادہ آپ اپنی بیٹی کی توہین کر رہے ہیں۔" فواد نے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ ٹیبل پر مارے۔

"زمانے سے یہی دستور رہا ہے کہ باپ اپنی بیٹی کے لیے بر ڈھونڈتے ہیں۔ میں کچھ انوکھا نہیں کر رہا۔" وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب پڑی ٹیبل سے گلاس میں جوس ڈالنے لگے۔

"آپ کو شوہر نہیں چاہیے اپنی بگڑی ہوئی بیٹی کے لیے ایک بے بی سٹر چاہیے۔ جو اس کو خوش رکھے اور اس کے اشاروں پر ناچے۔" وہ زہر خند ہوا۔

"اس کرسی پر چند منٹ بیٹھ کر تم اپنی حیثیت بھول گئے ہو۔" شاہد گیلانی راحین کے باپ تھے اور مقابل کو اس کی اوقات یاد دلانے سے نہیں چوکتے تھے۔

"مجھے اپنی حیثیت بھی یاد ہے اور تربیت بھی۔ میری تربیت میں سودے بازی نہیں ہے۔" وہ پیسوں کے آگے جھکنے والوں میں سے نہیں تھا۔

ان کو لگا تھا فواد لمحوں میں مان جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تو شاہد گیلانی کو راحین کی پسند پر فخر سا محسوس ہوا۔

"بیٹھو۔" شاہد گیلانی نے جوس سے بھرا گلاس فواد کے آگے رکھا اور بات شروع کی۔

"تم نے ڈاکٹر دبیر کا نام سنا ہے اور آف کورس سنا ہو گا۔ بہت قابل ہڈیوں کے ڈاکٹر ہیں۔ کئی سالوں سے بستر پر پڑے لوگ دوڑنے لگتے ہیں۔ کہو تو تمہارے باپ کو علاج کے لیے باہر لے کے چلتے ہیں۔" وہ پھر سے پین پکڑ کر ہلانے لگے تھے۔

"آپ صحیح نہیں کر رہے رشتے دھونس سے نہیں بنتے۔ بن جائیں تو چلتے نہیں ہیں۔" فواد کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

شاہد صاحب خوش ہوئے۔ ان کا تیر نشانے پر لگا تھا۔

"کل کو تم نے شادی کرنی ہے، نوکری بھی کرنی ہے اور ترقی بھی۔ میں تمہیں تینوں چیزیں ایک جھٹکے سے دے رہا ہوں۔ حرج کیا ہے؟" انہوں نے شاطرانہ مسکراہٹ سے کہا۔

"آپ میری خودداری کا امتحان لے رہے ہیں۔" وہ مسلسل خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

"صحیح قیمت لگ جائے تو یہ خودداری سب سے پہلے بکتی ہے۔" شاہد نے دل میں سوچا۔

"جہیز کی رسم صدیوں پرانی ہے اور تحفہ دینا تو شاید آدم اور حوا نے ہی شروع کیا ہو گا۔ تم اسے دنیاوی رسم سمجھ لو۔ تمہیں پیسوں کی ضرورت ہے اور مجھے میری بیٹی کے لیے ایک اچھے ساتھی کی۔" انہوں نے جذباتی حملہ کیا۔

"میں اپنی ضرورتوں کے لیے اپنا آپ نہیں بیچ سکتا؟" اس کا وجود درد سے پھٹنے کو تھا۔

"اور اپنے گھر والوں کی ضرورت کے لیے؟" شاہد گیلانی نے سوال کیا۔

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اپنے گھر والوں کی ضرورت یاد کر کے وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسے اپنے بہن بھائیوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اپنے باپ کی بے بسی محسوس ہوئی۔ سائرہ کے آنسو نظر آئے جو رشتہ دیکھنے والوں کے سلوک کے بعد اس نے بہائے ہی نہیں تھے۔ اور ماں کا صبر یاد آیا۔ وہ ایک ایک کر کے سب آوازوں کو رد کرتا رہا۔ اس کے گھر والے اس کی طرح خوددار تھے۔ ایسی سودے بازی ان کو بھی قبول نہیں ہوتی۔ وہ سب آوازیں جھٹک کر آگے نکلا تو اسے جیلے استاد کی آواز آئی۔ "پچپن لاکھ بس۔"

وہ اس آواز کو جتنا جھٹکتا اسے اتنی شدت سے وہ آتی۔ شاہد گیلانی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے یہ بات غلط رخ سے شروع کی تھی۔ فواد نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

"دوبارہ سے بات شروع کرتے ہیں۔ فرض کرو، تمہاری نوکری لگ رہی ہے۔ تمہاری اچھی قابلیت دیکھ کر ہونے والے باس نے کہا ہے جتنی رقم چاہیے ایڈوانس لے لو بعد میں تنخواہ سے کٹوا دینا۔ تم کیا رقم لکھو گے؟"

"پچپن لاکھ۔" فواد نے خود کلامی کی۔

شاہد نے فوراً چیک بک کھول کر رقم لکھ دی اور چیک فواد کی طرف بڑھایا۔

"رقم میں نے لکھ دی ہے بس دستخط باقی ہے۔ اب بتاؤ راحین سے شادی کرو گے؟"

فواد چیک گھورتے ہوئے کرسی میں دھنسا تھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر چیک کے بغل میں موجود جوس اٹھا کر ایک گھونٹ میں پی گیا۔ اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے۔

☆☆☆

"میں تو جی پائلٹ بنوں گا۔ ابا کی طرح سواری بھی چلاؤں گا اور لوگ سیلوٹ بھی کریں گے۔" حسن نے شوق سے راحین کو بتایا۔

راحین مسکرا دی۔ آٹھ سال کی عمر میں اس نے اپنا بچپن کھویا تھا۔ اب حسن کے ساتھ دوبارہ جینے لگی تھی۔

"حسن! چل سونے کا وقت ہوگیا ہے۔" شکور بیٹے کو بلانے کوارٹر سے باہر نکلا تھا اور راحین کو دیکھ کر پریشان ہوا تھا۔

"باجی، مجھے بلالیا ہوتا؟"

شکور نے پہلے راحین کو کبھی اس حصے میں نہیں دیکھا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے سگریٹ صرف پینے والوں کا نقصان نہیں کرتا۔ یہ آس پاس والوں کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے۔" بات سمجھانے کی عادت اس میں اسی وقت پیدا ہوئی تھی۔

"جن ہاتھوں سے بچوں کا رزق کماتے ہو۔ ان سے بچوں کی بیماریاں مت خریدو۔" وہ اپنی بات صحیح معنوں میں کہہ کر ہلکی پھلکی محسوس کرنے لگی۔

"جی بی بی جی۔" شکور نے سر ہلایا۔

☆☆☆

"مجھے منظور ہے۔" اس نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھا۔

"نئی نسل کا یہی مسئلہ ہے فالتو ڈائیلاگ بول کر وقت ضائع کرتے ہیں۔" شاہد گیلانی نے ذلت آمیز مسکراہٹ اچھالتے ہوئے سوچا۔

"لیکن میری ایک شرط ہے۔" فواد اب سنبھل گیا تھا۔

"تم بھول رہے ہو کہ میں قیمت ادا کر کے تمہیں خرید رہا ہوں۔ تم شرط رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" انہیں ڈر تھا کہ فواد لالچ دکھائے گا۔

"آپ بھی بھول رہے ہیں کہ خریدنے سے پہلے چیز کی تعریف نہیں کرنی چاہیے ورنہ منہ مانگی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔" فواد نے بے عزتی کا جواب حاضر جوابی سے دیا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔ مجھ سے یہ توقع مت کیجئے گا کہ غلط باتوں پر خاموش رہوں یا اس کا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بولوں۔" اب وہ تحمل سے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن راحین کو اس ڈیل کے بارے میں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اسے تم خود پرپوز کرو گے۔" اصل امتحان تو باقی تھا۔

فواد کا گلا پھر سے خشک ہوگیا۔

"اگر اس نے انکار کر دیا تو؟" اب پچپن لاکھ کی رقم اس سے ایک ہاتھ دور تھی۔ اس کی ساری مصیبتوں کا حل تو وہ اسے حاصل کیے بغیر پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔

"اس نے انکار کیا تو یہ چیک میں پھاڑ دوں گا۔" شاہد گیلانی نے سفاکی سے کہا۔

"بہتر ہے کہ تم اسے منالو۔ میں فوراً شادی چاہتا ہوں اور شادی کے بعد میں تمہیں مل جائے گا۔ فی الحال تمہاری تسلی کے لیے دستخط کر دیتا ہوں۔" شاہد نے قلم کھول کر چیک پر دستخط کیے اور پھر پین ٹیبل پر رکھ کر سزائے موت لکھنے والے جج کی طرح قلم کی نب توڑ دی۔

☆☆☆

نماز کے بعد بھی وہ جائے نماز پر ہی بیٹھی تسبیح کرتی رہی تھیں۔ رات بہت گہری ہوگئی تھی۔ فواد کی بائیک کا ہارن ہوا تو انہوں نے شکر کیا۔

"میری وجہ سے آپ اب تک جاگ رہی ہیں؟" وہ تھکا ہوا آیا اور ماں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ باقی گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اچھا ہوا۔ اسی بہانے بغیر گنتی کے اللہ کا نام ہی لے لیا۔" انہوں نے بیٹے کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "آنکھیں کیوں سوجی ہوئی ہیں؟" غزالہ نے جائے نماز کا کنارا موڑا۔

"امتحانوں کی ٹینشن ہے۔" اس نے نظریں چرائیں۔

"اب تو آخری امتحان ہے۔ میں ہر نماز کے ساتھ دو نفل تمہاری کامیابی کے لیے اضافی پڑھتی ہوں۔ لو دیکھو دو سجدے زیادہ کیے نہیں کہ پھر اللہ سے سودا بازی کرنے لگی۔" انہوں نے ہنس کے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

فواد تڑپ گیا وہ بھی تو ایک سودا کر کے آیا تھا۔ اپنی ذات کا سودا۔

"امی! جو لوگ ضمیر بیچتے ہیں وہ زندہ کیسے رہتے ہیں؟" وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

"کیا بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟" غزالہ مسکرائیں۔ بیٹا خیریت سے گھر آ گیا تھا، ان کا ڈولتا دل سنبھلنے لگا۔

فواد چپ رہا کیا بتاتا۔

"تمہاری باتوں نے مجھے خالہ جنت یاد آ گئیں۔ جب ان کے گھر چوتھی بیٹی پیدا ہوئی تھی تو وہ بھی ایسی ہی بے سر پیر کے بولنے لگی تھیں۔" غزالہ ساتھ ساتھ بیٹے کا سر سہلانے لگیں۔

"مسئلہ یہ تھا کہ کمرے کے باہر بے اولاد، جیٹھ جیٹھانی جھولی پھیلا کر بیٹھے تھے۔ کہتے تھے بیٹی ہمیں دے دو۔ بدلے میں جو تم پر بینک کا قرضہ چڑھا ہے وہ ہم اتار دیتے ہیں۔"

"پھر خالہ جنت نے کیا کہا؟"

"خالہ جنت کو ماننا ہی پڑا۔ لیکن انہوں نے شرط رکھی کہ سب شرعی طریقے سے ہو۔ بچی کے ساتھ باپ کا ہی نام لگے۔ بچی کو اصل ماں باپ کا معلوم ہو۔"

"ایک بار قیمت وصول کرنے کے بعد جو نام دے دو۔ سودا، سودا ہی رہتا ہے۔" فواد کا ضمیر بول رہا تھا۔

"وہ ان کی مجبوری تھی۔ مگر ان کی نیت رشتہ نبھانے کی تھی۔ خالہ جنت نے جو رشتہ نبھایا۔ دنیا نے دیکھا ہر عید پر اس بچی کی چوڑیاں، جوڑا باقی بچیوں کی طرح ہی آتا۔ ہر غم اور خوشی میں خالہ جنت جیٹھانی کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوتیں۔ وہ قرض کی رقم تو خالہ جنت کے احسانوں کے آگے کچھ نہیں رہی۔ الٹا جیٹھانی ساری عمر ان کی احسان مند رہی۔" غزالہ نے بتایا۔

فواد گود سے اٹھ گیا۔

"سچ وہ سودے بازی نہیں تھی؟"

"وہ تعلق نبھانا تھا۔ بس کچھ غیر روایتی تھی۔ لو دیکھو مجھے اتنی رات خالہ جنت کیوں یاد آ گئیں۔ چلو میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔" غزالہ خود پر ہنستی اٹھ گئیں۔

☆☆☆

خدا معلوم متضاد ایک دوسرے کی طرف کیوں کھنچتے ہیں۔ راحین سے پہلے اس کو خود کو قائل کرنا تھا۔ وہ غور کرتا جا رہا تھا۔ بیج بٹن سے لے کر کشش ثقل تک متضاد کا کھنچاؤ قدرتی تھا۔ پھر چاہے وہ متضاد قوتیں ایک دوسرے کو مکمل کریں یا تباہ کر دیں۔ وہ راحین کے انتظار میں اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ وہ گردن اکڑا کر اپنی جون میں دنیا سے بے خبر چلنے والی لڑکی آج اسے بھی ان دیکھا کر کے گزر گئی تھی۔

"راحین! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" اس نے پیچھے سے پکارا۔

راحین اس کی آواز پر رک گئی۔ وہ اندر سے جتنی بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو۔ سامنے سے اس کی انا اور خود پسندی ہی نظر آتی تھی۔

"اس دن میں بہت ٹینشن میں تھا اور سارا غصہ آپ پر نکل گیا۔ آئی ایم سوری۔" وہ اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"آپ کو احساس ہے ہماری ہر ملاقات میں ہم ایک دوسرے کو سوری کہہ رہے ہوتے ہیں؟ بات کہیں سے بھی شروع ہو ختم کسی ایسی بات پر ہوتی ہے کہ اگلی ملاقات میں سوری کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

اس نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔ جبکہ اندر جذبات لاوے کی طرح جھلسا رہے تھے۔

"ایسا ہونا نہیں چاہیے۔ ہمیں اپنے ملنے کا طریقہ بدل لینا چاہیے۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

وہ اخلاق کے جس مقام پر فائز تھا اس باعث ہر ایک کے ساتھ مہربان اور مددگار تھا۔ اب راحین خود کو کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

"آپ نے ایک اور بات صحیح کی تھی۔ میں واقعی خود پسند ہوں۔ میرے لیے سب سے قیمتی میں خود

ہوں اور جو لوگ میری قدر نہیں کرنا جانتے۔ انہیں میرے راستے میں نہیں آنا چاہیے۔"

وہ اکڑ کر بولی۔

فواد چپ رہ گیا۔ راحین آگے بڑھی، فواد کو پیچھے ہو کر اس کا رستہ چھوڑنا پڑا۔ راحین کو منانا آسان نہیں ہونے والا تھا۔

راحین بھی بہت بے بسی سے آگے بڑھی تھی۔ اس نے خود کو بہت مشکل سے سمیٹا تھا۔ اس میں دوبارہ بکھرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

فاخرہ اپنے بیٹے دانیال کے دبئی جانے سے بہت خوش تھیں۔ جبکہ منیر صاحب دکھی تھے کہ بیٹے کے منہ کو باہر کا رزق لگ گیا ہے۔ اب اپنے ملک کا پانی بھی اس کا پیٹ خراب کر دے گا۔ انہیں بیٹے کی کمائی کی خوشی سے زیادہ اس کے سہارے کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

فاخرہ دانیال سے یہی کہتی تھیں کہ دل لگنا اچھی بات ہے مگر زیادہ دل نہیں لگانا چاہیے۔ گھر بسانے والی ایک بیوی کافی ہوتی ہے۔ وہ بیٹے کی رنگین مزاجی سے واقف تھیں۔

بیٹے کی طرف سے تسلی ہوئی تو بیٹی کا رویہ کھٹکنے لگا۔ جس کو کچھ دنوں سے سجنے سنورنے کا ہوش تک نہیں تھا۔ وہ جب سے سیر و تفریح کر کے آئی تھی۔ ایسی ہی سست تھی۔

سارا دن ٹی۔وی کے آگے لیٹی الا بلا کھاتی رہتی۔ زارا کی سوئی فواد پر اٹکی تھی۔ جب سے اس نے فواد کی حور جیسی دوست دیکھی تھی اس کی ساری امیدیں ٹوٹ گئی تھیں۔ فواد سے شادی کی امید ٹوٹی تو وہ ایسے ہو گئی جیسے جینے کی امید ٹوٹ گئی ہو۔

فاخرہ نے لاکھ سمجھایا کہ کالجوں کی دوستیاں ڈگری ملنے تک رہتی ہیں۔ فواد تو ویسے ہی سادہ انسان تھا۔ شادی ماں باپ کی مرضی سے کرے گا۔ مگر زارا بھی غلط نہیں تھی۔ غزالہ کیوں اپنے ہونہار بیٹے کی شادی اس بی۔اے فیل زارا سے کرنے لگیں۔ وہ اس حور جیسی نہ سہی کوئی شہزادی جیسی لڑکی ضرور ڈھونڈے گی۔

فاخرہ نے بیٹی کا حال دیکھ کر سوچا منیر سے کہیں کہ بات کریں۔ مگر اپنے منہ سے اپنی بیٹی کا رشتہ کیسے کہتیں۔ کچھ سوچ بچار کے بعد فاخرہ کو ایک تیر سے دو شکار ہوتے نظر آئے۔ فاخرہ دبئی سے آئی۔ چند چیزیں لے کر غزالہ کے پاس آ گئیں۔ اسے تحفہ دیا۔ زارا کی تعریفیں کیں اور دانیال کے ٹھاٹھ بتائے۔ ساتھ اشارے کنایوں میں بات بھی کر گئی تھیں۔ کیوں نہ وٹہ سٹہ کر لیا جائے۔

ایک گھر میں دو رشتے ہونا ان کے لیے بھی فائدہ مند تھا۔ فواد بہن کی خوشی کی خاطر زارا کو سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھتا اور سائرہ تو تھی ہی اللہ میاں کی گائے۔ اپنا اور بھائی کا گھر سنبھالنے کے لیے دانیال کی ساری آوارہ گردیاں برداشت کر جائے گی۔

غزالہ کے لیے یہ بہت مشکل فیصلہ تھا۔ زارا سامنے کی بچی تھی مگر فواد کی ہم پلہ نہیں تھی۔ اور دانیال نے تو انجینئر تک بہت ہلکے نمبروں سے بمشکل پاس کی تھی۔ اس نے فاخرہ کو طریقے سے ہی منع کیا کہ اب ایک گھر میں دو رشتوں کا رواج نہیں رہا۔

پھر فاخرہ نے سمجھایا۔ جو رشتے سائرہ کے لیے آ رہے تھے کسی سے چھپے نہیں تھے۔ پھر دیکھے بھالے لوگوں میں ایک رشتہ مل جانا غنیمت ہے اور دو مل جائیں تو دوہری خوشی۔ سمجھو لاٹری لگ گئی۔

فاخرہ نے دانیال کے ٹھاٹھ کے ایسے حسین باغ دکھائے کہ غزالہ کے منہ میں پانی آنا فطری تھا۔ انہوں نے فاخرہ کی حلوے اور کباب سے تواضع کی اور سنہرے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔

☆☆☆

"دانیال تو ٹھیک ہے۔ مگر زارا اور فواد؟ وہ سیاست کی بات کرے گا تو دوسری ڈراموں کی کہے گی۔" رشید کو زارا پسند تھی۔ مگر فواد کے معیار کی بھی ہونی چاہیے۔ اور یہ ایک کے ساتھ ایک مفت والا طریقہ اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"آج کل ہر چیز پر فلمیں ڈرامے بنتے ہیں۔ زارا بھی سیکھ جائے گی پہلے تو ایک تصویر دیکھ کر شادی ہوتی تھی یہ ذہنی ہم آہنگی تو نیا فیشن ہے۔" غزالہ کچھ معاملوں میں بالکل دقیانوسی تھیں۔

"سائرہ کو اعتراض نہیں ہوگا۔ مگر فواد سے مشورہ کر لیں سائرہ اور دانیال کی شادی کر دیتے ہیں اور فواد اور زارا کی بات پکی۔ نوکری ملنے پر رخصتی لے لیں گے۔" غزالہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آج ہی رسم کر دیں۔

"بیگم صاحبہ! اس کے امتحان ختم ہونے سے پہلے کوئی بات نہ کیجیے گا بہت اہم امتحان ہیں۔" وہ بولے۔

اتنے میں سائرہ اشتہا انگیز کھانے کی ٹرے لے کر آ گئی صرف ایک رزق ہی تھا۔ جو بغیر کسی دقت کے اس کے چھونے سے ہی لذیذ ہو جاتا تھا۔ باقی ہر چیز کے لیے یا جان مارنی پڑتی تھی یا دل۔ سائرہ نے تڑپ کر سوچا۔

☆☆☆

مہک سوالیہ پرچے پر انگلی رکھ کر حساب کر رہی تھی چلو بی پلس تو آ ہی جائے گا اس کے ساتھ چلتی راحین کو ایسی کوئی فکر لاحق نہیں تھی موت اچھے نمبر دیکھ کر پلٹ نہیں جائے گی۔ وہ تو رسماً امتحان دے رہی تھی۔

"اسٹارٹ۔" علیم نے چلا کر کہا اس کی آواز بڑے سے مجمعے میں واضح سنائی دی۔

"انہیں کیا ہو گیا ہے۔" راحین نے دور گراؤنڈ میں موجود مستی کرتے سینئرز کو دیکھا۔

"ان کے یونیورسٹی کے آخری دن چل رہے ہیں۔ روز کوئی ہنگامہ کرتے ہیں چلو دیکھیں۔" مہک اس کا بازو تھام کر خود بھی مجمعے میں شامل ہو گئی۔

دو سینئر سوڈے کی پانچ بوتلیں غٹاغٹ پینے میں مصروف تھے۔ علیم اس مقابلے کا جج بنا ہوا تھا۔ جبکہ فواد سمیت باقی کلاس فیلوز اپنے ساتھیوں کے لیے تالیاں بجا رہے تھے۔

"تو یہ ہیں ہمارے ونر۔" جس لڑکے نے پہلے سوڈا ختم کیا تھا۔ علیم نے اس کی کمر تھپتھپائی۔ پانچ بوتلیں پی کر اس لڑکے کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ جیسے متلی ہو رہی ہو۔ ہارنے والے نے کالا چشمہ پہن رکھا تھا۔

"چلو کیا نو ریوز میٹرکس مووی والا کی اولاد۔ جیب ڈھیلی کرو۔" علیم نے شرط کے پیسے لیے۔ پھر اپنا حصہ جیب میں رکھ کر جیتنے والے کو اس کا انعام پکڑایا۔

"کیا آپ لوگ ایک دوسرے کو ہی چیلنج کرتے رہیں گے یا کوئی ہم سے بھی مقابلہ کرے گا۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔" مہک نے تماشائیوں کی صف میں سے چلا کر کہا۔

"کس احمق نے کہہ دیا کہ آپ کسی سے کم ہیں۔ آپ تو اتنی پہنچی ہوئی چیز ہیں کہ سب آپ سے ڈرتے ہیں۔" علیم مہک کو دیکھ کر مسخرے پن پر اترا تھا۔

خاموش کھڑے فواد نے مہک کے ساتھ کھڑی راحین کو بہت غور سے دیکھا تھا۔ اٹھی ہوئی گردن، تنے ہوئے تاثرات، ایسا اوپر سے تنگ اور نیچے سے پھیلا لباس جو بیان سے باہر ہو۔ وہ سج دھج کر نہیں آئی تھی تو بھی سب میں نمایاں لگتی تھی۔

"کیوں بھائی۔ ہے کسی میں ہمت کہ ان محترماؤں کو چیلنج کرے۔" علیم نے اعلان کر دیا۔

اپنے ساتھیوں کو تو وہ پکڑ کے مقابلے میں لا رہا تھا۔ اور وہ اپنے ہم پلہ دوست سے مقابلہ کر رہے تھے۔ اب معاملہ مہک اور راحین کا تھا۔ وہ تو شاید ہزاروں کی شرط لگا دیتیں۔ کوئی سامنے نہیں آیا۔

"دیکھا وہ انسان ابھی پیدا ہی نہیں ہوا جو آپ سے مقابلہ کرے۔" علیم نے مہک کو خوش اسلوبی سے ٹالنے کے لیے دوبارہ کہا۔

"میں کروں گا چیلنج۔" فواد نے کہا۔ سب ہی حیرت سے گنگ رہ گئے۔

فواد تو بوڑھی روح مشہور تھا۔ ایسی تفریح میں

کبھی آگے نہیں آتا تھا۔ راحین کی نگاہ فطری طور پر اٹھی تھی اور فواد کی نگاہوں سے ٹکرا کر وہ غیر آرام دہ ہوئی تھی۔

"مہک چلو۔" راحین نے اسے کہا۔

فواد ڈرامائی انداز میں اس کو دیکھتے ہوئے قدم بڑھا رہا تھا۔ پورا مجمع انہیں دیکھ رہا تھا۔ فواد چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"کیوں راحین آپ میرا چیلنج قبول کریں گی؟"

تماشائی بھنبھنانے لگے۔ فواد بمقابل راحین۔ سب کو پینچ والا سین یاد آ گیا۔

"نہیں۔" راحین نے اعتماد سے کہا۔ "کیونکہ میں نہیں چاہتی آپ جاتے ہوئے۔ اس یونیورسٹی سے ہار کی شرمندگی لے کر جائیں۔" جس جوتے کی نوک پر وہ دنیا رکھتی تھی اس سے دو قدم آگے چل کر آ گئی اور کہا۔

اتنی خاموشی تھی کہ سب نے سنا اور راحین کو مغرور سمجھنے والوں نے بھی ہوٹنگ کی۔

"اگر آپ کو اپنی جیت پر اتنا یقین ہے تو پھر آپ کو اپنی سب سے قیمتی چیز داؤ پر لگانے میں دقت نہیں ہونی چاہیے۔" فواد مقابلے کو مزید دلچسپ بنا رہا تھا۔

راحین کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی سب سے قیمتی چیز کون سی ہے۔ مگر قیمتی چیزیں تو اس کے ہاتھ کا میل تھیں۔ اسے کیا پروا۔

"میرے لیے یہ کوئی دقت نہیں ہے۔ مقابلہ کرتی ہوں تو جیت کر دکھاتی ہوں۔" راحین پر اعتماد تھی۔

"تو لگائیں شرط میں جیتا تو آپ کے لیے جو سب سے قیمتی ہے وہ میرا۔"

حاصل کرنے کا جذبہ تھا۔ تسخیر کرنے کا انداز۔ راحین کا دل پھر سے خواب بننے لگا۔

"چلو راحین! دکھا دو۔ ہم کسی سے کم نہیں۔" مہک نے مسکرا کر سہیلی کی پیٹھ ٹھونکی۔

راحین کو اس وقت کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن بری طرح سے گھر چکی تھی۔

☆☆☆

وہ بلڈنگ سے پارکنگ تک جاتی لمبی سڑک کے ایک سرے پر موجود تھے۔ جبکہ تماشائی سڑک کے دونوں طرف چیئر کر رہے تھے۔ سڑک کے اختتام پر مہک اور علیم ٹشو پیپر رول کھولے اختتامی حد واضح کر رہے تھے۔ یہ ریس تھی۔ فواد اپنی بائیک پر تھا جبکہ راحین اپنی لمبی سی گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اسے یہ ریس ضرور جیتنی تھی۔ اس نے نقطہ اختتام پر نظریں گاڑیں۔ فواد کا اس کی قیمتی چیز سے کیا مطلب تھا؟ وہ پھر سوچنے لگی۔

کسی نے رومال گرایا۔ ہر طرف ہوٹنگ اور شور ہونے لگا۔ دونوں اپنی سواریاں پوری رفتار سے لے کر نکلے۔ راحین کی گاڑی آگے تھی۔ اس نے پیچھے آتے فواد کو دیکھا۔

"میں جیتا تو آپ کے لیے جو سب سے قیمتی ہے وہ میرا۔" فواد نے کہا تھا۔

"میرے لیے سب سے قیمتی میں خود ہوں اور جو لوگ میری قدر نہیں کرنا جانتے۔ انہیں میرے راستے میں نہیں آنا چاہیے۔" اس نے خود پچھلی ملاقات میں کہا تھا۔ راحین کو یاد آیا۔

وہ اس کی چاہ کر رہا تھا؟ راحین نے فواد کے الفاظ کے دوسرے معنی ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر ملے ہی نہیں۔ راحین کو یقین نہیں آیا۔ وہ اب بھی آگے تھی اور فواد پیچھے۔ اس نے بے خودی میں اپنی رفتار آہستہ کر دی۔ فواد آگے نکل گیا اور ٹشو پھاڑتا ہوا جیت گیا۔

فواد کے سپورٹرز نے ہلہ مچا دیا۔ مہک گالیاں نکالتی ہوئی راحین کے پاس گئی۔

"تم گاڑی میں ہو کر بھی ہار گئی؟" اس نے بازو سے پکڑ کر راحین کو باہر نکالا۔

"وہ مجھے چکر آ گیا تھا۔" اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر اداکاری کی۔

دور کھڑا فواد شاباشیں وصول کر رہا تھا۔ راحین چاہ کر بھی خود کو گھبرانے سے روک نہیں پائی۔ اس کے علاوہ صرف فواد جانتا تھا کہ وہ جان کر ہاری تھی۔

☆☆☆

"سر! ایک اور سائن۔" اویس نے فائل آگے کی۔ شاہد گیلانی نے بجھے انداز میں دستخط کیے۔

"اس دن جولڑ کا آیا تھا۔ اس کا کوئی فون آیا؟" دن گنتے ہوئے اب وہ حساب بھولنے لگے تھے۔

"نہیں سر! کوئی فون نہیں آیا۔" اویس کے ذہن میں بے شمار سوال قلابازی کھا رہے تھے۔ وہ اتنا تو جانتا تھا کہ شاہد گیلانی لوگوں کو آسمان پر چڑھانا جانتے ہیں تو زمین میں گاڑ بھی سکتے ہیں۔ لیکن وہ اس کلاس لیس لڑکے کے سپرد اپنی نازوں پلی بیٹی یوں زبردستی کیوں کرنا چاہتے تھے؟ اس کو اپنی جان بہت پیاری تھی، اس لیے کچھ بھی پوچھے بغیر چلا گیا۔ شاہد صاحب کو چہرے بھی پڑھنے آتے تھے۔

کینسر کی تشخیص کے بعد سے راحین خود ترسی میں مبتلا تھی۔ شاہد صاحب کو ڈر تھا کہ بیماری سے پہلے یہ ترس راحین کو ختم کر دے گا۔ فواد کا رویہ راحین کے لیے وہ کڑوی گولی ثابت ہونے کی امید تھی جس کے بعد راحین خود علاج کی ہامی بھر لے گی۔ یہ بات شاہد صاحب نے دل میں سوچی تھی۔ وہ اویس کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

☆☆☆

وہ ہمیشہ سے جلد باز تھی۔ کرنے کے بعد سوچتی تھی۔ اب اس نے دانستہ سوچنا بھی بند کر دیا تھا۔ وہ صرف کر رہی تھی۔ لان میں مہک کے ساتھ چلتے ہوئے وہ اس کی باتیں اور اپنے شانوں پر پھیلا دوپٹہ محسوس کر رہی تھی۔ مگر وہ کیوں اور کس کی خاطر خلاف معمول تھری پیس لان کا سوٹ پہن کر آئی تھی۔ وہ ان سوالوں سے انجان بنی ہوئی تھی۔

پیپر ختم کر کے وہ معمول کے مطابق اپنے مخصوص بینچ کی طرف بڑھی۔ جب دور لان میں لگے اکیلے بینچ پر اسے فواد نظر آیا تھا۔ اس کی ساری حسیات تیز ہو گئیں۔ شکست کا احساس اس پر حاوی ہونے لگا تھا۔ ایک معصومانہ ڈر تھا۔ ایک بے وقوفانہ امید تھی۔ دونوں کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ فواد اس ہی لمحے مڑا اور مہک کو دیکھا۔

"راحین کہاں ہے؟" اس نے دور سے اشارہ کیا۔

"میرے ساتھ۔" مہک نے اپنے پہلو میں دیکھا پھر گھڑی کی سوئیوں کی مانند گھومنے لگی۔

ابھی تو یہیں اس کے ساتھ تھی۔ اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ پھر اس نے فواد کے طرف دیکھ کر کندھے اچکا دیے۔

☆☆☆

وہ ایک گمنام کونے میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی سوچ ایک خطرناک بوتل کے جن کی طرح اب بھی قید تھی۔ جسے آزاد کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

"آہم آہم۔" کسی نے اس کے پیچھے پہنچ کر گلا کھنکارا۔

راحین نے پکڑے جانے پر گھبرا کے آنکھیں میچیں۔ اسے کھنکھارنے سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے پیچھے فواد کھڑا ہے۔

"آپ مجھ سے بھاگ کیوں رہی ہیں؟" وہ آہستگی سے آگے آیا اور بینچ کے دوسرے کونے پر ٹک گیا۔

"میں کیوں بھاگنے لگی؟" اس نے غرور سے کہنا چاہا۔

فواد کو اس کی بے اعتنائی اور جھجک میں واضح فرق نظر آنے لگا تھا۔

"کیونکہ آپ کو ڈر ہے کہ میں اپنی جیت کا انعام نہ مانگ لوں۔" فواد کو اس کا شرمانا اچھا لگ رہا تھا۔

"ہم... نہ کوئی شرط نہیں لگائی تھی۔ سب ہی مذاق میں چیلنج کر رہے تھے میں نے بھی قبول کر لیا۔" وہ قدرے نارمل انداز میں بولی۔

"لیکن میں تو تب بھی سنجیدہ تھا اور اب بھی

ہوں۔ میں آپ کو اپنانا چاہتا ہوں؟''
''کیا؟'' راحین کو جھٹکا لگا۔ اتنی دور کی تو اس نے بھی نہیں سوچی تھی۔
''میں سیریس ہوں۔ دشمنی بہت ہوگئی۔ دوستی مجھے قبول نہیں ہے۔ اور اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ بھی نہیں چاہتیں کہ ہم لاتعلق ہو جائیں۔ اب بچی صرف شادی جس سے ہم ایک قابل احترام تعلق میں جڑ سکتے ہیں۔'' فواد بہت آرام سے کہہ رہا تھا۔
راحین کو اس کی سنجیدگی پر شک نہیں تھا۔ لیکن ایک جست میں نفرت سے محبت پر پہنچنا غیر یقینی تھا۔
''اس قسم کی باتیں ایسے چلتے پھرتے نہیں کی جاتیں۔'' اسے یہ سب بے حد عجیب لگ رہا تھا۔
''دراصل یہ میرا اکلوتا تجربہ ہے۔ پہلے کبھی کسی کو کہا نہیں۔ بھول چوک معاف۔ اچھا میں دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔''
فواد اٹھ کر دور پھولوں کی کیاری تک گیا اور ایک پھول توڑ لایا۔
''راحین گیلانی ول یو میری می؟'' وہ سامنے کھڑا تھا اور زندگی بھر کا ساتھ مانگ رہا تھا۔
زندگی؟ نہ جانے تھی بھی کہ نہیں۔
راحین نے غصے سے پھول اس کے ہاتھ سے لیا اور مسل دیا۔
''یہ کیسا مذاق چل رہا ہے؟ آپ کا، کہا تو میں اتنی بری لگتی تھی کہ آپ مجھ سے دوستی بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں کیسے مان لوں کہ اچانک ہی آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' اس کا غصہ جائز تھا۔
''سمجھیں میں نے فال نکلوائی ہے اور آپ کے نام کی پرچی نکلی ہے۔ ہماری قسمت جڑ چکی ہے بس نام جڑنے کی دیر ہے۔'' وہ دوبارہ بینچ پر بیٹھا تھا۔
''آپ کی نظر میں تو میں ایک امیر مغرور لڑکی تھی۔'' وہ تنک کر بولی۔
''بالکل صحیح۔ میری نظر کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔''
وہ اپنی تمام پچھلی باتوں پر قائم تھا۔
راحین کا پارا پھر چڑھنے لگا۔
''لیکن مجھ میں بھی کئی برائیاں ہیں۔ اس طرح آپ میں بہت اچھائیاں بھی ہیں۔ کتنی ہی اچھائیاں تو مجھ میں بھی ہوں گی۔ ہم مل گئے تو ایک دوسرے کو مکمل کر سکتے ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ویسے ہی کہہ رہا تھا جیسے اسے سننا پسند تھا۔
''اتنی تمہید باندھنے کے بجائے سیدھا کہہ دیتے کہ آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔'' راحین نے آسان راستہ بتایا۔ فواد نے نظریں چرائیں۔
''مجھے آپ سے محبت نہیں ہے۔'' بات چھپانا اس کی مجبوری تھی۔ مگر اس کی سرشت میں دھوکا دینا نہیں تھا۔
راحین کا معصوم سا دل جڑنے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے لیے تو محبت ایسی ہی تھی۔ جو لمحہ بھر میں ہوئی تھی مگر صدیوں پرانی محسوس ہوتی تھی۔ اسے لگا فواد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔
''لیکن میں آپ سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے موقع تو دیں۔'' اس کا خون سے رواں لوتھڑا جسے دل کہتے ہیں۔ اس مقام پر ہمیشہ مشینی کل پرزہ ہو جاتا تھا۔
''آپ بہت عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو میرے ڈیڈ کا معلوم نہیں۔ وہ میرے معاملے میں بے حد حساس ہیں۔ ان کے سامنے یہ بات کرنے کی آپ جرات بھی نہیں کر سکیں گے۔'' یہ اس کا ذاتی وسوسہ تھا۔
''نیک کام میں دیر کیسی چلیں۔ جرات کا امتحان دے ہی دیتا ہوں۔'' وہ بائیک کی چابی گھماتے ہوئے کھڑا ہوا۔
''کہاں چلیں؟'' راحین کی ہوائیاں اڑی تھیں۔
''میں آپ کے ڈیڈ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ان کو بھی معلوم ہونا چاہیے میرا کیا ارادہ ہے۔'' فواد چلنے لگا۔ راحین گھبرا کر اس کے پیچھے لپکی۔
''آپ ڈیڈ سے ملنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو اپنی زندگی پیاری نہیں ہے؟'' وہ اکڑ کر بولی۔

''کیا آپ کو میری زندگی پیاری ہے؟'' فواد اس ہی وقت مڑا۔ پیچھے آتی راحین اس کے بالکل پاس تھی۔

ضروری نہیں کہ جو اظہار محبت کرتے نہیں وہ اظہار محبت سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ بھی سننا چاہتا تھا۔

''اگر آپ کو میری زندگی پیاری ہے تو تھوڑا مسکرا دیں۔ تاکہ آپ کے ڈیڈ کو یہ نہ لگے کہ میں آپ کو خوش نہیں رکھ سکتا۔'' وہ کہہ کر آگے چل دیا۔ راحین بھی ہنسی چھپا کر پیچھے چل دی۔

''آئیں تشریف رکھیں۔'' فواد نے اپنی بائیک کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ جانتے ہیں میں بائیک پر نہیں بیٹھتی۔'' راحین کی اکڑ میں کمی نہیں آئی تھی۔

''وہ پہلے کی بات تھی۔ تب آپ کا مجھ جیسے آدمی سے شادی کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اچھا ہے ہماری کمپیٹیبلٹی ہو جائے گی۔'' وہ بائیک پر بیٹھ چکا تھا اور ہیلمٹ پہن رہا تھا۔

''آپ بھول رہے ہیں۔ میں نے ابھی شادی کی ہامی نہیں بھری۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر اسے گھور رہی تھی۔

''تو کیا آپ انکار کرنے والی ہیں؟'' ہیلمٹ سے صرف دو شرارتی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ راحین لاجواب ہوئی۔

اس نے پیر پٹختے ہوئے اپنا دوپٹہ اتار کر سائیڈ پر باندھا اور فواد کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی تھی۔ فواد کی مسکراہٹ فطری تھی۔

☆☆☆

جب فواد کی بائیک گیلانی ہاؤس میں داخل ہوئی تو ایک تیر سے دو شکار ہوئے۔ راحین اور فواد کی ہم آہنگی پورے نمبر سے پاس ہوئی تھی۔ تو فواد نے شاہد گیلانی کو سیخ پا کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اپنی لاڈلی بیٹی کو ایک خطرناک سواری پر آتا دیکھ شاہد گیلانی نے بغیر کچھ کہے ایک اہم فون کال کاٹی اور فکر مندی سے اپنے ڈرائنگ روم سے باہر آئے تھے۔ جس کو دو ہٹے کٹے آدمی زبردستی پکڑ کر ان کے آفس لائے تھے۔ وہ بغیر حرکت کیے۔ ان کی بیٹی کو انگلیوں پر نچا رہا تھا۔

پہلی ملاقات میں شاہد صاحب نے اس پر اپنی طاقت واضح کی تھی۔ اب فواد نے اپنی پوزیشن دکھا دی تھی۔ اس کی پوزیشن یہ تھی کہ شاہد گیلانی اس کا استقبال کرنے باہر آئے تھے۔ شاہد گیلانی کے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے سامنے فواد مسکراتا ہوا کھڑا ہوا۔

''ڈیڈ! یہ فواد ہیں۔'' راحین نے تاثرات قابو کر کے کہے جیسے کچھ بھی خلاف معمول نہ ہو۔

فواد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''میں فواد رشید ہوں۔ آپ کا ہونے والا داماد۔'' فواد نے پورے اعتماد سے کہا۔

راحین کا سر چکرا گیا۔ وہ نڈر تھا مگر اس قدر بے باک بھی ہوگا۔ راحین کو اندازہ نہیں تھا۔ وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔

''فواد! آپ.....'' وہ تنبیہ کرنے لگی تو الفاظ کھو گئے۔

شکور، گارڈ، اویس سب ہی گفتگو سن رہے تھے۔

''ڈیڈ فواد کا مطلب ہے۔'' شاہد گیلانی سے بات کرنا فواد کو سمجھانے سے زیادہ آسان تھا۔

''راحین گھر آئے مہمان کے لیے چائے کا انتظام کرو۔'' شاہد صاحب نے بیٹی کی بات کاٹی اور دونوں ہاتھ کمر کے نیچے باندھ لیے۔ فواد کو اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کرنا پڑا۔

☆☆☆

''سچ کہتی ہوں۔ غزالہ! تم نے میری بات کا مان رکھ کر مجھے بیان سے باہر خوشی دی ہے۔'' فاخرہ فون پر کہہ رہی تھیں۔

قریب بیٹھی زارا شبنم نہائی گھاس کی طرح کھلنے لگی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

ثقلین فاطمہ

اچھی نہیں یہ دوریاں

"ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی کل ماہ رمضان شروع ہوا تھا اور آج دس روزے گزر بھی گئے ہیں۔" ابا جان نے سحری کرتے ہوئے کہا۔ دادی اماں البتہ خاموش تھیں۔ آج کل وہ بہت کم بات چیت کرتی تھیں۔

"دادی جان! آپ یہ دہی لے لیں۔" ناجیہ نے پیالہ ان کی طرف بڑھایا جو انھوں نے خاموشی سے تھام لیا اور تھوڑا سا دہی ایک کٹوری میں نکال لیا۔

سحری کر کے ابا جان مسجد چلے گئے اور دادی جان اپنے کمرے میں۔ ناجیہ امی جان کے ساتھ مل کر برتن سمیٹنے لگی۔ اس کے بعد دونوں حسب معمول لاؤنج میں نماز پڑھنے لگیں۔ تلاوت قرآن کے بعد جب دونوں اپنے اپنے کمرے میں جانے لگیں تو ناجیہ نے ماں کو متوجہ کیا۔

"امی! آپ کو نہیں لگتا ابا اور چچا جان کی ناراضی میں اصل نقصان دادی جان کا ہو رہا ہے؟"

"دیکھو ناجیہ! تم اپنے ابا کو بہت اچھی طرح جانتی ہو کسی بات پر غصے ہو کر ناراض ہو جائیں تو مشکل سے راضی ہوتے ہیں۔ تم خاموش رہو۔ یہ معاملہ دونوں بھائی جانیں، رہی امی جان کی بات تو ان کے لیے دونوں بیٹے برابر ہیں، دونوں میں سے جب چاہیں جس کے ساتھ چاہیں رہیں، تمھارے ابا نے انھیں انور سے ملنے سے منع تو نہیں کیا۔"

ناجیہ کے ابا افضل اور چچا انور میں گاؤں والی زمینوں کو بیچنے کے حوالے سے تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ چچا انور کو کاروبار کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی وہ اپنے حصے کی زمینیں بیچنا چاہ رہے تھے جب کہ افضل صاحب کا کہنا تھا کہ زمینیں ابھی نہ بیچی جائیں۔ منع کرنے کے باوجود انور چچا نے اپنے حصے

کی زمینیں بیچ دیں اور یہ بات افضل صاحب کو اتنی ناگوار گزری کہ اُنھوں نے انور سے قطع تعلق کر لیا۔ بیوی، بچوں اور ماں نے بہتیرا سمجھایا مگر وہ افضل ہی کیا جو کسی سے ناراض ہونے کے بعد جلدی راضی ہو جائیں۔

ناجیہ کی دادی ہفتہ دس دن بعد جا کر اپنے چھوٹے بیٹے سے مل آتیں، اسے بھی سمجھاتیں وہ کہتے۔

''میں تو بالکل ناراض نہیں ہوں، بھائی جان کو سمجھائیں۔'' کہہ کر بات بدل دیتے۔ اُن کے بار بار سمجھانے پر بھی یہ ناراضی ختم ہوتی نظر نہ آئی تو اُنھوں نے اس معاملے پر خاموشی اختیار کر لی۔ پہلی دفعہ دونوں بھائیوں کی ناراضی آٹھ مہینوں پر محیط ہوئی تھی۔

ناجیہ اور اس کی چچا زاد نمرہ ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔ دونوں کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ اُنھیں یہ لڑائی ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ دونوں نے بات چیت تو نہیں چھوڑی مگر اب وہ پہلے کی طرح ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کی آزادی ختم ہو گئی تھی۔

''امی! میں اپنی کچھ دوستوں کی افطاری کروانا چاہتی ہوں۔ میں افطاری کا انتظام کرنے میں آپ کی پوری مدد کروں گی۔''

''اچھا، کب کروانی ہے افطاری؟''

''اس جمعے کو۔''

جمعے کو دونوں ماں بیٹی دوپہر سے ہی افطاری کی تیاری میں لگ گئیں۔ افطاری میں ایک گھنٹہ باقی تھا جب اطلاعی گھنٹی نے مہمانوں کے آنے کا اعلان کیا۔ افضل صاحب گیٹ کھولنے گئے اور مہمانوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انور چچا، چچی، نمرہ اور عادل مہمانوں کی صورت دہلیز پر کھڑے تھے۔ عادل کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا اور پھل وغیرہ تھے۔ چچی اور دونوں بچوں نے افضل صاحب کو سلام کیا تو اُنھوں نے چونک کر ان کے سلام کا جواب دیا اور ان کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ امی اور دادی جان حیران رہ گئیں۔

''بھئی۔ ہماری بٹی نے اتنے پیار سے افطاری کی دعوت دی تو مجھے آنا ہی پڑا۔ میں نے سوچا بچی کی خوشی زیادہ اہم ہے، بھلے میرے بھائی جان مجھے اپنے گھر میں گھسنے کی اجازت نہ دیں مگر افطاری تو میں کر کے جاؤں گا۔'' انور چچا بڑھ کر افضل صاحب کے گلے سے جا لگے۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، چلو آؤ، بیٹھو۔'' افضل صاحب شرمندہ سے ہو کر بھائی کے کندھے پر بازو رکھ کر صوفے کی طرف بڑھے۔

''یہ بات تو ہمیں ماننا پڑے گی کہ ہمارے بچے ہم سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔ تمھیں پتا ہے یہ منصوبہ اپنی نمرہ اور ناجیہ کا ہے کہ دونوں بھائیوں میں صلح کروا دی جائے۔ مجھے نمرہ نے سمجھایا کہ ابو رمضان رحمتوں والا مہینہ ہے اس میں ہمیں اپنی انا، ضد، ہٹ دھرمی کو چھوڑ دینا چاہیے۔ تو میں نے سوچا، یہ مشکل کام کر ہی لیا جائے۔ میں افطاری سے پہلے صلح کروں گا، کیوں بھائی جان آپ تیار ہیں؟''

انور چچا دادی جان کے دائیں جانب بیٹھے تھے اور افضل صاحب بائیں جانب، افضل صاحب مسکرا کر کھڑے ہوئے کہ وہ سمجھ چکے تھے کہ اپنوں سے دوری اچھی نہیں ہوتی۔ آپس کے جھگڑے اور رنجشیں جتنی جلدی ہو سکے ختم کر لینے چاہئیں، انہوں نے اپنے بازو وا کر دیے، انور صاحب اُٹھ کر بھائی سے لپٹ گئے۔ گلے شکوے اور ناراضی دور ہو گئی۔ اتنی دیر میں قریبی مسجد سے اعلان ہونے لگا، ''اللہ کے پیارو! جنت کے حق دارو، روزہ افطار کر لو۔''

''لو جی صلح تو ہو گئی اب افطاری بھی کر لی جائے۔'' انور چچا نے دسترخوان کی طرف رخ کیا تو سب نے مسکراتے ہوئے ان کی پیروی کی۔

''آج کی افطاری کا تو لطف ہی الگ ہے، اللہ میرے بچوں کو ایسے ہی ہنستا مسکراتا رکھے۔'' دادی جان نے دل ہی دل میں دعا کی۔

☆☆

ساجدہ رمضان

اچھی گھر والی کی بہو

"سو بار سمجھایا ہے، اتنا آگے پیچھے مت پھرا کرو عائشہ کے۔" اتوار کا دن تھا، دن کیا تھا شام ڈھل رہی تھی۔ عائشہ ڈرائنگ روم میں ہیٹر لگائے اپنی سہیلیوں سے باتوں میں مشغول تھی جبکہ نگین کھانے کے لوازمات تیار کرنے اور ڈرائنگ روم تک پہنچانے میں لگی ہوئی تھی جب طلعت نے کچن میں آ کر اسے جھاڑ پلائی۔

"خود مہارانی بن کر بیٹھی ہے اور تمہیں کام پہ لگا رکھا ہے۔" چائے کا پانی چولہے پہ رکھتے ہوئے وہ مزید بولیں۔ طلعت عجب مشکل میں گرفتار تھیں۔ بیٹا اپنی پسند سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، ہونہار، کماؤ بیوی لایا تھا۔

دونوں میاں بیوی ہر صبح تیار، اپنے کمرے سے ایک ساتھ نکلتے، ناشتہ کرتے اور اپنا اپنا لیپ ٹاپ اٹھائے دفتر روانہ ہو جاتے۔

شام پانچ بجے واپسی ہوتی۔ نگین تب تک شام کی چائے تیار کر چکی ہوتی۔ شوہر، بیٹا اور بہو چائے پیتے ہوئے حالات حاضرہ پہ خوب تبصرہ کرتے۔ وہ دونوں ماں بیٹی ان تینوں کے دھواں دھار تقریری انداز بڑی خاموشی سے ملاحظہ کرتی جاتیں۔

کم گوسی نگین پہلے بھی بھائی اور باپ سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھی مگر اب تو بھابھی کے سامنے گونگی بنی رہتی۔ اتنے میں ڈنر کا وقت ہو جاتا۔ عائشہ برتن اٹھوانے سالن، روٹیوں کے ہاٹ پاٹ ٹیبل تک رکھنے میں مدد کرتی، ٹیبل سمیٹ بھی دیتی اور آخر میں چائے بنا کر سب کی خدمت میں پیش کرتی۔

وہ نگین کے پکائے گئے پکوان کی خوب تعریف کرتی۔ سادہ سی نگین اتنی سی بات پر خوش ہو جاتی جبکہ طلعت بہو کی چالاکیوں کو خوب سمجھتی تھیں۔ طلعت کو ایک اور پریشانی بھی لاحق تھی۔ وہ تھی نگین کی دبی دبی شخصیت۔ پرکشش نقوش، مڑی ہوئی پلکوں تلے گہری سیاہ آنکھیں، لمبے سیاہ سلکی بال۔ اس کا گہرا گندمی رنگ ساری کشش ماند کر دیتا تھا۔ اوپر سے نکھری نکھری گوری چٹی عائشہ کے ساتھ نگین "نظر بٹو" لگتی۔ عائشہ کا نگین کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھنے کا مقصد اسے مزید احساس محرومی میں مبتلا کرنا تھا۔ وہ اس طرح کی سوچوں سے خود کو ہلکان کیے رکھتی تھیں۔

"آپ بھی نوکری کرتی ہیں بیٹا؟" نگین کو دیکھنے آئی ہوئی خواتین میں سے غالباً لڑکے کی والدہ نے نگین سے سوال کیا۔ نگین نے ہونق ہو کر اس عورت کی سمت دیکھا۔ نگین کے ڈرائنگ روم میں آنے سے قبل ماحول اچھا خاصا خوش گوار تھا۔ خواتین نے عائشہ سے نجانے کتنے چھوٹے چھوٹے سوال کر ڈالے تھے۔ مگر نگین کے آتے ہی خواتین کے چہروں کا رنگ اتر گیا۔

"آپ کو نوکری کرنے والی بہو چاہیے آنٹی؟" خاتون نے حیرت سے عائشہ کی سمت دیکھا۔ سوال تو گندم سے کیا تھا جواب چنے نے دیا تو سب ایک دم ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کسے نہیں چاہیے ہو گی؟" انہوں نے الٹا سوال کر دیا تو وہ مسکرا دی۔ باقی تمام افراد خاموش تماشائی کا کردار نبھا رہے تھے۔

"آنٹی! میری ساس کو تعلیم یافتہ، نوکری پیشہ بہو چاہیے تھی۔ یہ جب ہمارے گھر آئیں تو مجھے اپنے سامنے چلنے پھرنے کو کہا، نہ کھانا بنانے کو اور نہ ہی جھاڑو پوچا لگانے کو، بس دیکھا اور اوکے کر دیا۔ اب جب مجھے فقط چائے بنانا آتی ہے تو یہ برا نہیں مانتیں۔"

عائشہ نے طلعت کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تو انہوں نے بے ساختہ پہلو بدلا۔

"آپ نے حمیدہ آنٹی (رشتہ کرانے والی) سے کہا کہ آپ کو امور خانہ داری میں طاق، گھریلو، سلیقہ شعار بہو چاہیے اگر آپ نوکری کا تذکرہ کرتیں تو ہم بتا دیتے کہ ہماری لڑکی گھر بیٹھے ہزاروں کما رہی ہے۔"

اس نے نہایت مہذب اور پر اعتماد انداز میں روانی سے جھوٹ بولا۔ یہ نوکری پیشہ لڑکیاں سسرالیوں کو یونہی تو ناکوں چنے نہیں چبواتیں۔ انہوں نے اپنی زبان کے آگے خندق کھود رکھی ہوتی ہے۔ طلعت نے تلخی سے سوچا، اب نجانے اس جھوٹ کا کیا انجام ہو۔

"میں نے یونہی بات کرنے کی غرض سے سوال پوچھا تھا۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"کوئی بات نہیں آنٹی! میں بھی مشورے کی غرض سے عرض کر رہی ہوں کہ بہو اچھی طرح سوچ سمجھ کر آرڈر کرنی چاہیے، آپ کو غالباً ٹو ان ون بہو چاہیے جو اچھا کمائی بھی ہو اور اچھا پکاتی بھی ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے تجزیہ کیا تو سب نفوس مسکرا دیے۔

"ایسی بات نہیں ہے، شامی کباب تو بڑے خستہ بنائے ہیں۔" لڑکے کی بڑی بہن ماں کی مدد کو آئی۔ سب کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ذرا دیر بعد نگین بڑے آرام دہ انداز میں بات چیت کر رہی تھی۔ وہ جب اس گھر میں آئی تھی نگین کو بہت کنفیوز بہت پریشان پایا تھا۔ وجہ طلعت کا اس کے بارے میں بے حد فکر مند ہونا اور اٹھتے بیٹھتے مشورے اور نصیحتوں سے نوازنا تھا۔ نگین بالکل ہی اعتماد سے عاری ہو گئی تھی۔

عائشہ دنیا کے معیار نہیں بدل سکتی تھی ہاں مگر نگین

کو اپنا معیار سیٹ کرنے اور پر اعتماد ہونے میں مدد ضرور کر سکتی تھی۔ اسی مدد کے پیش نظر وہ ساس کی نظروں میں پھوہڑ بلکہ چالاک بہو تھی۔

نگین نے گھر کے سارے معاملات سنبھالے تو اس کے اعتماد میں اضافہ ہونے لگا۔ عائشہ سب کے سامنے کھلے دل سے اس کے کھانوں کی تعریف کرتی۔ اپنی سہیلیوں سے ملوائی شاپنگ پہ ساتھ لے جاتی، اس سے مشورہ لیتی، اس طرح اپنے خول میں بند، سادہ سی نگین میں اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں واضح تبدیلیاں آئی تھیں۔ جس کا ثبوت آج کی رشتہ پریڈ تھی۔

وہ نگین کی سمت دیکھ کر مسکرادی۔ اس کی محنت وصول ہو چکی تھی۔ رشتہ ہونا نہ ہونا الگ بات تھی۔ نگین کا ردعمل معنی رکھتا تھا۔ طلعت اس پہ نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔

''اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا، نہ تم بوڑھی ہو رہی ہو اور نہ ہی لڑکوں کا کال پڑنے والا ہے۔''

اتوار کی دوپہر وہ دونوں کچن میں موجود تھیں۔ ہفتہ بعد ہی ان لوگوں کی طرف سے مثبت جواب آچکا تھا۔ نگین پلیٹیں دھو رہی تھی جبکہ وہ خشک کر کے رکھتی جا رہی تھی۔

''اپنے جھوٹ سے ہی مجھے خیال آیا ہے کہ تم کوئی کام کرو۔ اسارہ (دوست) کے بوتیک میں کام کر لو، اس کا بھی اسٹارٹ ہے چاہو تو پارٹنر شپ کر لو، ڈیزائنگ میں ایکسپرٹ تو ہو ہی۔''

اس نے مزید کہا، کچن کی طرف آتی طلعت دروازے پہ رک گئیں۔ بڑی معیوب حرکت تھی مگر انہیں سننا تھا کہ ان کی بہو ان کی سادہ سی بے وقوف بیٹی کو کیا پٹیاں پڑھا رہی ہے۔

''میری فکر چھوڑیں، آپ کی ساس آپ سے بڑی بدگمان ہیں۔ پہلے آپ کے پھوہڑ پن اور مجھ پہ توڑے گئے مظالم پہ اور اب آپ کے تازہ ترین ان خواتین پہ کیے گئے زبانی کلامی حملے پر......''

نگین ہنس کر بولی۔ تو عائشہ بھی ہنس دی۔ اس کے انداز گفتگو سے طلعت کی پیشانی پہ شکنیں پڑیں۔ ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ ان نند بھابھی میں اس قدر بے تکلفی کب اور کیسے پروان چڑھی۔ وہ تو سمجھتی تھیں کہ عائشہ کی ہی بدولت ان کی بیٹی میں گونگا پن آ گیا ہے۔ اب اسے زبان کے جوہر دکھاتے حیران ہو رہی تھیں۔

''تم جب اس گھر سے رخصت ہو جاؤ گی میں اپنی ساس پہ اپنا سگھڑ پن ظاہر کر دوں گی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''چائے بنانے، کپ کھنگالنے، پلیٹیں دھونے، خشک کرنے سلاد کاٹنے اور ٹیبل لگانے جیسے کام سگھڑ پن میں بھی شمار نہیں ہوتے۔'' نگین نے خبردار کیا۔ یعنی کہ حد ہے اسے اس قدر نا اہل اور ناکارہ سمجھا جا رہا تھا۔ دل چاہا سارے راز اگل دے مگر تھوڑا وقت اور...... وہ مسکرادی۔

''یہ کام سگھڑ پن میں شمار ہوں یا نہ ہوں میرا شمار ایک دن ضرور اچھی کوالٹی کی بہوؤں میں ہو گا، تم دیکھنا۔''

ساتھ ہی دونوں کے بے فکر قہقہے طلعت کی سماعتوں میں اترے تو انہیں کسی خوش گوار احساس نے چھوا۔ نگین کے متعلق ان کی پریشانی بے جا اور عائشہ کے متعلق ان کی رائے غلط تھی۔ وہ کئی دنوں سے عائشہ سے خفا تھیں وجہ انہیں خود بھی معلوم نہ تھی۔ جس کی بدولت انہیں لگتا تھا کہ نگین کی ذات نظر انداز اور مسخ ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہی نگین کی شخصیت درست پیمانوں پہ نمو پا رہی تھی۔

انہیں اپنے دل سے بدگمانی کے بادل چھٹتے محسوس ہوئے۔ بہو کو گھر کی صفائی کرنا نہ آتا تھا دل کو صاف رکھنا تو آتا تھا۔ کھانا نہیں بنا سکتی تھی مگر رشتے نبھانے کا ہنر تو خوب جانتی تھی۔ جو اسے کرنا آتا تھا وہ بے حد انمول تھا۔ اور جو نہیں کرنا آتا تھا وہ اسے سکھانے سمجھانے کو تیار تھیں۔

کچن میں عائشہ اور نگین ایک مرتبہ پھر ''اچھی کوالٹی کی بہو'' کے چار لفظوں پہ ہنس رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے پلٹ آئیں۔

☆☆

سیدہ

مقروض

ہماری پہلی ملاقات، دوسری پہلی تاریخ ہے۔

یوں تو خزاں اپنے جوبن پر تھی مگر میری زندگی میں بہار ہو رہی تھی۔ یہ شام میں بیٹھا تو ایک بار کی طرح درختوں کی سرخی نیچے پڑی پرانی سوچوں میں غلطاں کہ آخر کیوں میں نے تجھے سینے ریزے دھتکار دیا۔

"آپ اس وادی کو آخر آدمی کی میں جگہ جانتے ہے۔"

شاید مجھے میری بیوی میری اس دھواں کی عادت سے چڑتی تھی۔ کہتی تھی کہ "صبور میاں! دھواں دینا ایسی چیز ہے جو ایک بار پھیپھڑوں میں پڑ جائے تو انسان کو کبھی آزاد نہیں ہونے دیتی۔"

خیر میں اور میری تنہائی سوچتی اور ... اور اب اور کبھی کوئی تھا۔ وہ وادی کی مقدس سیاحت کی متحد سفید چادر میں ملبوس ایک لڑکی میرے برابر بینچ پر آ بیٹھی تھی مگر سوچوں سے مجھے تب جب میری نظر آپ پڑی تو وہ کسی آسیب کی طرح میرے ذہن پر چھانے لگی۔

سخت سردی سے ٹھٹھرتا کانپتا ہوا مگر اتنی خوبصورت ذرا گھبرائے گھبرائے سے چادر سے اپنے سر کو ڈھانپے، وہ اپنے آپ میں کچھ سمٹ رہی تھی۔ معصومیت تو وہ سیدھی بیٹھی اور وادی کی سڑکوں کے درمیان نیلے رنگ کے چھوٹے سے اونی کپڑے کو دیکھنے لگی۔ بعد میں قدموں کی حرکت سست کی۔ تو ہم اس کام میں تھے۔

"یہ تو شوق چڑیا ہوگا۔" میں نے اندازہ لگایا کیونکہ مرحومہ بھی اسی طرح پرندوں سے پیار کرتی تھی

ذاتی تھیں۔

ہوتے ہوتے وہ اسی بینچ میں پہلے دن کی طرح بیٹ کر بیٹھ گئی تو میں دھیرے دھیرے اس کا لمس بھی چھونے لگا۔ میں بڑی محبت سے اس کا پیار لینے لگا تو لیکن اس نے ایک نگاہ غلط بھی مجھ پر نہیں ڈالی۔

خیر میری واپسی کا وقت ہو گیا تو میں دوبارہ میں شور مچانے کا تب کی عقب سے ایک سرد ہوا آئی۔

"سنیے! یہ آپ کا فون" — میں نے پلٹ کر دیکھا وہ تھی۔ پیار سے میں صرف مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے مخاطب تھی۔

بینچ پر میرے ساتھ رکھا فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ رہ گیا تو میں نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی تو مجھے یاد آیا کہ جیسے فون پر ریحان کا آنے کی وجہ سے پتا نہیں میں جلدی سے کیسے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس دن سے وہ روزانہ آنے لگی۔ دوسری بار ملاقات سے شروع ہونے والا سفر دوسری پہلی تاریخ تک روا رہا۔ اس سفر کے دوران وہ روزانہ آتی رہی اور بیٹھے چپ چاپ ان کو دیکھتی تھی اور اس ماحول کے مسحور کن منظر میں کھو جاتی۔

گفتگو بھی رہی درمیان لیکن موضوع مختلف ہوتے۔ اس کا بنیادی شوق تھا جانوروں اور پرندوں سے محبت۔

"خزاں پسند نہیں مجھے۔" وہ کہتی۔

"پر مجھے پسند ہے۔" میں کہتا تو وہ کچھ سمجھ کر ایسے ہی جذبات سے مسکرا دیتی۔

"میری بیوی مرحومہ بہت شوق کیا کرتی تھیں

مگر کھانا بہت لذیذ بناتی تھیں۔ اب تو اچھا کھانا ہی نصیب نہیں ہوتا۔" میں کہتا۔

وہ بھی مجھے بتاتی کہ "میں کھانا بنانا بھی سیکھ رہی ہوں ان دنوں۔" یہ بھی اس کا نیا شوق تھا۔

"اسکارف بنا رہی ہوں۔" یہ جملہ اس نے میرے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھے گئے سوال، "کیا بن رہی ہو؟" کے جواب میں کہا تھا۔

"کس کے لیے؟" مزید تجسس جاگا۔

"ابھی سوچا نہیں۔" اس نے سلائیوں میں اون کا دھاگہ پلٹتے ہوئے کہا۔

ان ہی معمول کے ایک آدھ جملوں کی بات چیت میں ہمارے درمیان تھوڑی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ مجھے پہلی نظر میں بھا گئی تھی اور اسے بھی میں شاید اس ایک ماہ کی گفتگو میں اچھا لگنے لگا تھا۔

میں جب بھی اسے اپنے جذبات کی گہرائیوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کرنے لگتا تب ہی اس موئے رمیز کی کال آجاتی اور میں ریسیو کر کے کچھ دور جا کے اس سے بات کرنے لگتا۔ رمیز ادھار کی رقم کا مطالبہ کرتا۔ میں اسے کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر ٹال دیتا اور اکثر تو کال ریسیو ہی نہیں کرتا اور وہیں بینچ پر بیٹھے بیٹھے کاٹ دیتا مگر اس بار بار بجنے والی گھنٹی سے گفتگو کا تسلسل ہر بار ٹوٹ جاتا۔

اسی لیے آج یکم دسمبر کو میں اس تینتیس دس کو گھر ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔ اچھے کپڑے، خوشبو اور ہمراہ کچھ پھول لیے، میں بینچ پر آ بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔ اسی انتظار میں گھنٹہ گزر گیا پھر شام ہوئی، سورج ڈوب گیا اور میرا دل بھی۔ خیر رات ہو گئی۔

"کل آئے گی تو خیر خبر لوں گا۔" اسی امید پر گھر لوٹ آیا۔

کل بھی آ کر گزر گیا۔ ایک ماہ لگاتار میں اسی امید پر اس باغ میں جاتا رہا کہ شاید وہ آ ملے مگر وہ نہ آئی۔ ہماری گفتگو کا محور بھی موسم، اماں مرحومہ اور اس کے نئے نئے شوق ہی رہے تو اتا پتا بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔

ماہ دسمبر گزرا اور نئے سال کی آمد ہوئی۔ نئے

سال کی پہلی ہی تاریخ کو میں دل میں امید لیے پھر ان ہی راستوں کو لوٹا کہ شاید سال نو کی خوشی میں وہ آ جائے مگر بینچ کا دوسرا سرا شام ڈھلنے پر بھی ویران رہا تو میں اپنا یاسیت میں ڈوبا دل لیے لوٹ آیا اور یوں میں نے اس باغ میں اس کا اور اپنی مخصوص ویگن کا انتظار کرنا ترک کر دیا۔

☆☆☆

آج دو سال بعد پھر یکم جنوری ہے اور میں اس بینچ پر آ کر بیٹھ گیا ہوں کیونکہ کچھ دیر بعد رمیز مجھ سے یہاں اپنے اس قرض کی آخری قسط لینے آنے والا ہے۔

قرضے کی ادائیگی کا حل اس نے یہ نکالا کہ ہر ماہ کچھ رقم میں اسے لوٹا دیا کروں۔ میں بھی راضی ہو گیا اور آج اسی قرض کی آخری قسط ادا کرنے کے لیے اس نے مجھے باغ میں بلایا تھا کہ آج قرض کی مکمل ادائیگی کی خوشی میں وہ مجھے آلو کے چپس کی ٹریٹ دے گا۔ تب ہی میں بھی کام دھندوں سے فراغت پا کر سیدھا یہیں آ گیا تھا۔

میں منتظر تھا کہ بینچ پر میرے برابر وہ آ بیٹھی۔ وہ گود میں موجود چھوٹی سی بچی کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی تو کبھی اس کی گردن کے گرد لپٹے، اسی اون کے اسکارف کو ٹھیک کرتی کہ کہیں بچی کو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔

اسی دوران مصروف نظر آتی اس لڑکی کی نگاہ اس برابر بیٹھے شخص پر پڑی تو ٹھہر گئی۔

☆☆☆

اسکارف نومبر کی تیس تاریخ کو مکمل ہو گیا تھا اور میں گھر چلی آئی تھی۔ سوچا تھا کہ کل جو بات اس کے موبائل پر آنے والی کال کی مداخلت سے ادھوری رہ گئی، اس نیلے اونی اسکارف کو تحفتاً پیش کرتے ہوئے، اس موضوع کو نئے سرے سے چھیڑوں گی۔

ان ہی خیالوں میں شب گزری۔ صبح ہوئی تو عجلت میں تمام تیاریاں کرنے لگی۔ کھانا بنانا بھی اس ایک ماہ میں آ گیا تھا سو آلو کے پراٹھے بنا لیے۔ سوچا آج اسکارف سے گفتگو کا آغاز کر کے اختتام آلو کے پراٹھوں پر کریں گے۔ ابھی مہارت کم تھی پکانے میں سو آلو ذرا پراٹھوں سے باہر جھانک رہے تھے۔

"خیر ہے۔ میرے محنت سے بنائے گئے پراٹھوں میں نقص تھوڑی نکالیں گے وہ۔۔۔۔"

سارا دن ان ہی سب مصروفیات کی نذر ہوا اور شام ہو گئی۔ میں پارک پہنچی اور مخصوص کھردری بینچ کی طرف بڑھنے لگی تب ہی عقب سے میرے بڑے بھائی نے مجھے کھینچا اور اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

ہم گھر پہنچے اور گھر پہنچتے ہی بھائی نے تیز لہجے میں استفسار کیا کہ

"مول! آخر تم کس سے ملنے گئی تھیں؟ کون تھا وہ؟"

میرے ابا مجھے بہت چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑی نرمی سے مجھ سے پوچھا کہ "کیا تو کسی کو پسند کرتی ہے موی؟ اگر ہاں تو کیا وہ بھی تجھے پسند کرتا ہے؟"

جواب میں کیا کہتی کیونکہ ہماری بات چیت تو بس موسم، میرے نئے شوق اور ان کی اماں مرحومہ تک ہی رہی تھی۔

میں پھر بھی ہمت کر کے بولی کہ "ابا وہ پارک میں آتے ہیں روز۔ آپ کل ان سے جا کر پوچھ لینا۔"

ابھی میرا جملہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ بھائی کی خفا سی آواز ابھری۔

"ہاں وہ جس نے دو مہینے پہلے مجھ سے رقم ادھار لی تھی اور لٹکا کے رکھا ہے ابھی تک۔" "ایسے کے حوالے کرو گے اپنی بیٹی؟" وہ ابا کی نرمی پر سخت برہم تھا۔

پھر میری شادی ہو گئی اور اس دن کے بعد سے میں کبھی اس باغ میں نہیں گئی۔ آج میکے آئی ہوئی تھی۔ بھائی کو کسی سے ملنے جانا تھا تو اس نے کہا۔

"چلو تمہیں اور گڑیا کو پارک لے چلوں۔" سو آ گئی ان کے ساتھ اور اب...... کیا وہ دو سال سے میرا منتظر تھا۔ بس یہی ایک سوال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا تب ہی اس کے موبائل پر کال آئی اور میری نظروں کا وہ گہرا ارتکاز ٹوٹا۔ وہ اپنے قرض کی آخری قسط چکانے کے لیے چلا گیا اور اپنا ٹفن آج بھی بھول گیا ہے کہ شاید اسے لگتا ہے میں اسے عقب سے آواز دوں گی۔ جیسے ہماری پہلی ملاقات میں ہوا تھا۔

☆☆

بہاراورعید کی شام

گلاب کے پھولوں کی خوشبو
کسی کے حسین خیال کی طرح ہے
بہار دھیرے سے آئی ہے
رنگ فضا میں گھل گئے ہیں
اور ہر سمت پھولوں کی خوشبو
نرمی سے بکھر گئی ہے
اور عید......
خاموشی کے ساتھ آئی ہے
نئے لمحوں کی سرسراہٹ لیے
چہرے روشن ہوئے
دل مل گئے
شام کی روشنی میں
عید کارڈ کے سنگ
پھولوں کی خوشبو
دل تک آ کر ٹھہر جاتی ہے
اور اسی ٹھہراؤ میں عید
ایک خوب صورت احساس بن جاتی ہے
جسے بہار
اپنی مہک میں لپیٹ کر
ہمیشہ کے لیے
دل کے نام کر دیتی ہے

فرخندہ سلیم

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے، ہوا چل رہی ہے

سکوں ہی سکوں ہے، خوشی ہی خوشی ہے
تیرا غم سلامت، مجھے کیا کمی ہے

کھٹک گدگدی کا مزہ دے رہی ہے
جسے عشق کہتے ہیں، شاید یہی ہے

وہ موجود ہیں اور ان کی کمی ہے
محبت میں تنہائی دائمی ہے

چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں
نیا ہے زمانہ، نئی روشنی ہے

ارے او جفاؤں پہ چپ رہنے والو
خموشی جفاؤں کی تائید بھی ہے

مرے راہبر مجھ کو گمراہ کر دے
سنا ہے کہ منزل قریب آ گئی ہے

خمار بلا نوش، تو اور توبہ
تجھے زاہدوں کی نظر لگ گئی ہے

خمار بارہ بنکوی

متاعِ الفاظ

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو، میری بات سنو
ہم اسی چھوٹی سی دنیا کے کسی رستے پر
اتفاقاً کبھی بھولے سے کہیں مل جائیں

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم دوسرے لوگوں کی طرح
کچھ تکلف سے سہی ٹھہر کے کچھ بات کریں
اور اس عرصہ اخلاق و مروت میں کبھی
ایک پل کے لیے وہ ساعت نازک آ جائے

ناخن لفظ کسی یاد کے زخموں کو چھوئے
ایک جھجکتا ہوا جملہ کوئی دکھ دے جائے
کون جانے گا کہ ہم دونوں پہ کیا بیتی ہے؟
یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو، میری بات سنو

اس خموشی کے اندھیروں سے نکل آئیں چلو
کسی سلگتے ہوئے لہجے سے چراغاں کر لیں
چن لیں پھولوں کی طرح ہم بھی متاعِ الفاظ
اپنے اجڑے ہوئے دامن کو گلستاں کر لیں

یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو، میری بات سنو
دولت درد بڑی چیز ہے، اقرار کرو
نعمت غم بڑی نعمت ہے، یہ اظہار کرو
لفظ پیاں بھی، اقرار بھی اظہار بھی ہیں

طاقت صبر اگر ہو تو یہ غم خوار بھی ہیں
ہاتھ خالی ہوں تو یہ جنس گراں بار بھی ہیں
پاس کوئی بھی نہ ہو پھر تو یہ دلدار بھی ہیں
یہ جو تم مجھ سے گریزاں ہو میری بات سنو

زہرہ نگاہ

شعلہ جو ہے اس دل میں چھپا، تیز بہت ہے
بجھ جائے گا کچھ پل میں ہوا تیز بہت ہے

اک تیری جھلک یاد کے در سے ہے در آئی
اک درد مرے دل میں اٹھا تیز بہت ہے

چپکے سے بس اک سسکی ہی لی ہے مرے دل نے
کیوں گونجتی کانوں میں صدا تیز بہت ہے

اب راکھ تلک ڈھونڈے سے ملتی نہیں اس کی
اک جسم تری لو میں جلا تیز بہت ہے

پھر ٹوٹ گئے، گم ہوئے سب محور و مرکز
کیا کرتے کہ گردش کی بلا تیز بہت ہے

جس زہر نے کر ڈالا گگن نیلا سحر تک
وہ زہر مرے خون میں گھلا تیز بہت ہے

یاور ماجد

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک گھر کو آگ لگ گئی جبکہ گھر والے گھر میں تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حادثے کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہ آگ تمہاری دشمن ہے۔ جب تم سونے لگو تو اسے بجھا دیا کرو۔''

اللہ تعالیٰ کا احسان

انسان جب گناہ کرتا ہے، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس پر چار احسان فرماتا ہے۔

1۔اس کا رزق بند نہیں کرتا۔
2۔اس کی طاقت سلب نہیں کرتا۔
3۔اس کے گناہ کو ظاہر نہیں کرتا۔
4۔اس کو فوراً سزا نہیں دیتا۔

یہودی

جنگ عظیم کے زمانے کا ایک روسی قیدی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے، 1914ء میں جرمنوں نے جیل میں ہمیں مجبور کیا کہ ہم گڑھے کھودیں اور ان میں یہودی قیدیوں کو زندہ لٹا کر ان گڑھوں کو مٹی سے پُر کر دیں۔

ہم نے اس بربریت کا کام کرنے سے انکار کر دیا۔

تب جرمنوں نے ہمیں گڑھے میں ڈالا اور یہودیوں سے کہا کہ ان گڑھوں کو مٹی سے پُر کر دیں۔ یہودی فوراً تیار ہو گئے تب جرمنوں نے ہمیں گڑھے سے نکالا اور کہنے لگے۔

''تم نے دیکھا! ہم یہ چاہتے تھے تم جان لو کہ یہودی کیسے ہوتے ہیں''

قول حضرت علی رضی اللہ عنہ

زندگی کے ہر موڑ پر صلح کرنا سیکھو کیونکہ جھکتا وہی ہے جس میں جان ہوتی ہے۔

ہنرمند

جعل سازی کے جرم میں جیل پہنچنے والے ایک نئے قیدی سے جیلر نے کہا۔ ''یہاں تمہیں کوئی نہ کوئی کام بھی کرنا پڑے گا، تمہیں کیا کام آتا ہے؟''

''سر، بس ذرا سی پریکٹس کی ضرورت ہے دو دن بعد میں جیل کے تمام افسران کے چیک سائن کر دیا کروں گا۔'' قیدی نے جواب دیا۔

پڑھاکو

نئے نئے کالج میں داخل ہونے اور پڑھائی کے شوقین بننے والے بیٹے سے باپ نے پوچھا۔

''رات تم کتنی دیر تک پڑھتے رہے؟''

''میں نے رات دو بجے تک اسٹڈی کی۔'' بیٹے نے شو ماری۔

لیکن رات گیارہ بجے تو بجلی چلی گئی تھی۔'' باپ نے حیرت سے کہا۔

''میں پڑھائی میں اتنا مگن تھا کہ مجھے بجلی کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔'' بیٹے نے جواب دیا۔

ذہین

آرتھر کانن ڈائل ایک بار سوئٹزر لینڈ کا سفر کر رہے تھے۔ وہاں پہنچنے پر انہوں نے ایک ٹیکسی لی، ڈرائیور نے کہا کہ وہ کرایہ نہیں لے گا اگر وہ مہربانی فرما کر اس کے لیے ایک کتاب پر دستخط کر کے وقف کریں۔

حیران ہو کر سر آرتھر کانن ڈائل نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا کہ اسے کیسے پتا چلا کہ وہ مصنف ہیں۔''

ڈرائیور نے جواب دیا:

"بالکل سادہ بات ہے......آپ کے جوتوں پر ایک قسم کی گرد لگی ہوئی ہے جو یہاں کی نہیں ہے۔ جوتوں کے ڈیزائن سے مجھے پتا چلتا ہے کہ وہ انگریزی ہیں، تو یہ انگریزی گرد ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی انگلیوں پر سیاہی کا دھبہ ہے، تو آپ مصنف ضرور ہیں اور وہ بھی برطانوی۔" حیرت زدہ ہو کر کانن ڈائل نے کہا:

"تم شرلاک ہومز سے بھی زیادہ ذہین ہو!"

"جی ہاں سر!" ڈرائیور بولا "اور اس کے علاوہ آپ کے سامان پر بالکل واضح طور پر لکھا ہے:

"آرتھر کانن ڈائل۔"

بے وفائی کی سزا

امیر المومنین محمد امین کو اپنی ایک کنیز سے بہت محبت تھی۔ اس کا نام فادرہ تھا اور حسن و جمال کے لحاظ سے اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔

امین اس کی محبت میں اکثر اس سے کہتا کہ مجھے یہ خوف ہے کہ اگر میں مر گیا تو مامون دولت کا لالچ دے کر تجھے اپنے نکاح میں لے آئے گا۔

فادرہ اس کے جواب میں قسمیں کھا کر یقین دلاتی کہ وہ اس کے سوا زندگی میں کسی کی صورت نہیں دیکھے گی۔

چند ہی روز بعد مامون اور امین کی لڑائی ہوئی امین مارا گیا۔ فادرہ کے حسن کا چرچا پہلے ہی تھا، مامون نے اس کو نکاح کا پیام بھجوایا تو اس نے قبول کر لیا۔

نکاح کے بعد پہلی رات تھی۔ فادرہ مامون کے پہلو میں سو رہی تھی۔ اس نے خواب دیکھا۔ مامون اس کے سرہانے کھڑا فادرہ کو مخاطب کر کے اس کی وعدہ خلافی پر موت کی بددعا دے رہا ہے۔

فادرہ نے چیخ ماری اور جاگ اٹھی۔ مامون کو سارا واقعہ سنایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صبح کو مامون نے دیکھا کہ امین کی بددعا پوری ہوئی اور فادرہ بستر پر مردہ پڑی تھی۔

کہانی

ایک صاحب رات گئے گھر پہنچے اور بیوی سے بولے۔ "کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں اتنی دیر تک کہاں رہا؟"

بیوی بولی: "بالکل اندازہ لگا سکتی ہوں تاہم تم اپنی کہانی بھی سنا ڈالو۔"

دیس دیس کی کہاوتیں

☆ سفید بال عمر کی نشان دہی کرتے ہیں عقل کی نہیں۔ (یونانی کہاوت)

☆ جس کے سب ہی دوست ہوں، اس سے تعلق پر نظر ثانی کرو۔ (عربی کہاوت)

☆ ہر آدمی کے تین چہرے ہوتے ہیں۔ پہلا چہرہ دنیا کو دکھانے کے لیے۔ دوسرا چہرہ اپنے خاندان کو دکھانے کے لیے اور تیسرا چہرہ آپ کسی کو نہیں دکھاتے۔ (جاپانی کہاوت)

☆ آوارہ کتوں کا غول شیر کا شکار نہیں کرتا۔ (چینی کہاوت)

دوست کہیں جسے

ایک محفل میں عطاء الحق قاسمی نے صرف آدھے گھنٹے میں جب چھٹا سگریٹ سلگایا تو بیرون ملک سے آئے ان کے دوست نے قدرے پریشانی سے کہا۔

"عطا یار! تم بہت سگریٹ پینے لگے ہو، اچھی بات نہیں ہے یہ۔"

"اب کم کر دوں گا۔" عطاء الحق قاسمی نے جواب دیا۔

"کم کر دوں گا نہیں، ابھی کم کر دو۔" دوست نے فوراً کہا۔ "لاؤ ایک سگریٹ مجھے دے دو۔"

کھجور کی اہمیت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی ہے کہ روزانہ کھجور کھایا کرو خاص طور پر صبح کے وقت تین، پانچ یا سات دانے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ کھجور کو طاق عدد (یعنی ایک،

تین، پانچ، سات) میں کھاؤ، جفت عدد میں نہیں۔
یہ کیوں؟
تحقیقات سے پتا چلا ہے کہ جب انسان کھجور کھاتا ہے تو اس کے جسم میں ایک نیلی غیر مرئی توانائی پیدا ہوتی ہے جو پورے جسم کو گھیر لیتی ہے، اور اس توانائی کی وجہ سے جن، شیطان، جادو اور نظر بد سے حفاظت ہوتی ہے۔
لیکن یہ اثر صرف تب ہوتا ہے جب کھجور کو طاق عدد میں کھایا جائے (تین یا پانچ یا سات عدد)۔
اگر کوئی شخص کھجور کو جفت عدد میں کھائے (مثلاً دو، چار یا چھ)۔
تو وہ جسم میں شکر کی شکل میں ذخیرہ ہو جاتی ہے، اور اس سے ذیابیطس یعنی شوگر کا مرض پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔
دنیا کے سائنس دان حیران ہیں کہ
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیوں پہلے جن وشیطان کے اثر سے بچنے کا یہ قدرتی علاج بتایا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:
''کھجور واقعی ایک عجیب دوا ہے۔''
اگر کسی کو خون کی کمی (انیمیا) ہو تو کیمیائی دواؤں کی ضرورت نہیں۔
صرف روزانہ چند کھجوریں کھاؤ، خون کی کمی دور ہو جائے گی۔
اگر جگر چربی والا یا بڑا ہو گیا ہے تو روزانہ صبح کے وقت سات کھجوریں کھاؤ۔
ان شاء اللہ چربی ختم ہو جائے گی۔
اگر سرد مزاج ہو تو روزانہ تین کھجوریں کھاؤ۔
کینسر ہر مسلمان کے لیے ایک خطرہ ہے لیکن کینسر سے بچاؤ کا بہترین علاج بھی کھجور ہے۔
حدیث مبارکہ میں ہے:
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''جس گھر میں کھجور نہیں، وہ گھر یقیناً بھوکا ہے۔''

بڑھتے فاصلوں کی وجہ

اردو کا استاد ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پیپر چیک کرتے ہوئے بندے کو اکتاہٹ نہیں ہوتی اور بندہ مسلسل مسکراتا ہی رہتا ہے۔
مضمون نگاری کے حوالے سے موضوع تھا کہ
''جدید دور میں اولاد اور والدین کے درمیان فاصلے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔''
تبصرہ کیجیے۔
ایک بچے نے اپنے مضمون میں بہت ہی شاندار دلائل کے ہمراہ لکھا کہ
''جدید نسل اور والدین کے درمیان بڑھتے فاصلے ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اپنے والدین کی شادیاں سولہ، سترہ یا بیس سال کی عمر میں ہوئی تھیں......
جبکہ جدید نسل کو چوبیس سال کی عمر تک تعلیم کے بہانے اکیلا رکھا جاتا ہے اور اس کے بعد اچھی نوکری حاصل کرنے میں تین چار سال مزید لگ جاتے ہیں، جدید نسل اپنے بزرگوں کی چالاکیاں خوب سمجھتی ہے۔
خود تو اپنے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف جدید نسل دیر سے شادی ہونے کی وجہ سے شاید ہی اپنی اولاد کو بھی جوان ہو کر برسر روزگار ہوتا دیکھ سکے۔
والدین اگر چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد خوش رہے تو والدین کو اپنے بزرگوں کے طرز عمل کو اپناتے ہوئے اپنے بچوں کی دوران تعلیم ہی شادی کر دینی چاہیے، تاکہ جدید نسل اور والدین کے درمیان خوش گوار ماحول قائم ہو سکے۔
جہاں تک بات رزق کی ہے، اس کی گارنٹی تو ڈگری کے بعد بھی نہیں اور ڈگری کے بغیر بھی لوگ یہاں گورنر بن کر یونی ورسٹیوں کے چانسلر لگ رہے ہیں اور ڈگریاں بانٹ رہے ہیں۔

☆☆

خیالوں کی ڈائری

امت الصبوح

‡ ناہید اسماعیل ‡ کی ڈائری سے

فیض احمد فیض نے سانحہ مشرقی پاکستان پر یہ مایہ ناز نظم کہی تھی۔ جو ایک شاعر کے دل کی آواز تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وقت بدلے گا، خون کے دھبے دھل جائیں گے اور بے داغ سبزے کی بہار نظر آئے گی۔

آج فیض صاحب زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ بنگلہ دیش سے پاکستان کی محبت کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات، سب باتوں کے بعد

‡ سحر عمیر ‡ کی ڈائری سے

کافی عرصہ پہلے ایک دوست نے یہ نظم بھیجی۔ اس وقت وہ بہت کٹھن حالات سے گزر رہی تھی۔ میں نے اسے جواب میں ایک جملہ لکھ کر سینڈ کیا تھا۔ ”اپنا لہجہ نہیں بدلو، لہجہ تلخ ہو جائے تو حالات مزید بگڑ جاتے ہیں۔“

اس کے حالات کچھ عرصہ بعد بدل گئے۔

آج ڈائری کھولی تو مجھے وہ یاد آ گئی۔ یہ نظم اس کے نام اپنے ہونے سے انکار کیے جاتے ہیں۔

ہم کہ رستہ ترا ہموار کیے جاتے ہیں
لوگ اب صحنوں کو بھی بازار کیے جاتے ہیں

ڈالتے ہیں وہ کشکول میں سانسیں گن کر
کل کے سپنے بھی گرفتار کیے جاتے ہیں

کس کو معلوم اصل کہانی ہم تو
درمیاں کا کوئی کردار کیے جاتے ہیں

دل پر کچھ اور گزرتی ہے مگر کیا کیجیے
روز کچھ اور ہی کردار کیے جاتے ہیں

میرے دشمن کو ضرورت نہیں کچھ کرنے کی
اس سے اچھا تو میرے یار کیے جاتے ہیں

‡ حمدہ خان ‡ کی ڈائری سے

غمِ دوراں میں الجھ کر فرصتیں خواب ہوئیں اور محبتیں کھو گئیں۔ سلیم کوثر کی اس نظم میں اسی کیفیت کی عکاسی ہے، ساتھ ہی نئے چراغ جلانے اور تازہ خواب جگانے کا پیام بھی ہے۔

کئی برس ہوئے
منظر تبدیل نہیں ہوتا
اب چاند کی چھت پر اترے یا

دور کہیں سے للچائے
خوشیوں کی دلیل نہیں ہوتا
تم کہتے ہو، تمہیں آن ملیں
اس موسم میں اب تم ہی کہو
کیا وعدے اور وعید کریں
ہم دید کریں یا عید کریں
جس کاغذ پر ہمیں لکھنا تھا
اب وہ کاغذ اخبار ہوا
اب دلوں کی حالت نازک ہے
ہر شخص یہاں بیمار ہوا
ہاں ابھی نہیں
ابھی رات بھر اس بستی میں ہمیں اور چراغ
جلانے ہیں
کوئی کتنا بے تعبیر کرے ہمیں تازہ خواب
جگانے ہیں
ابھی اور بھی نظمیں لکھنی ہیں، ابھی اور بھی شہر
بسانے ہیں
تم دعا کرو
ملنے کی آس نہیں ٹوٹے میرے ہونٹوں سے
کتنے ہی دریا آن ملیں

روحیلہ خان کی ڈائری سے

ہمارے معاشرے میں جہاں لڑکیوں اور محبت کے حوالے سے ناگوار سے تاثرات ابھرتے ہیں وہیں فہمیدہ ریاض نے اس دکھ اور کرب کو محسوس کیا۔ اور ایک ٹوٹے دل کی لڑکی کو اپنی نظم "اس کا دل تو اچھا دل تھا" میں کس خوب صورتی سے پیش کیا۔

ایک ہے ایسی لڑکی جس سے تم نے کبھی ہنس کر بات نہ کی
کبھی نہ دیکھا، چمکے اس کی آنکھوں میں کیسے موتی

کبھی نہ سوچا، تم سے ایسی باتیں وہ کیوں کہتی ہے
کبھی نہ سمجھا، ملتے ہو تو گھبرائی کیوں رہتی ہے

کیوں اس کے رخسار کی رنگت سرسوں ایسی زرد ہوئی
تم سے ملنے سے پہلے وہ ایسی تنہا کبھی نہ تھی

مل کر آنکھ بہانے سے، وہ کب تک آنسو روکے گی
اس کے ہونٹوں کی لرزش بھی تم نے کبھی نہیں دیکھی

کیوں ایسی سنسان سڑک پر اسے اکیلا چھوڑ دیا
اس کا دل تو اچھا دل تھا جس کو تم نے توڑ دیا

وہ کچھ نادم، وہ کچھ حیراں، رستہ ڈھونڈا کرتی تھی
ڈھلتی دھوپ میں اپنا بے کل سایہ دیکھ کے ہنستی تھی
اکثر سورج ڈوب گیا اور راہ میں اس کو شام ہوئی

فرخندہ سلیم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ادا جعفری کی یہ غزل آپ کے لیے۔ پڑھ کر بتایئے گا کیسی لگی۔

دور اتنی نہ تھی منزل آرزو
راستے دوسروں کو دکھاتے رہے

حیلہ سوز تھی مشعل آرزو
خود جلاتے رہے، خود بجھاتے رہے

جان پہچان اپنی کہاں ہو سکی
لوگ آتے رہے، لوگ جاتے رہے

رنگ و بو کی جگہ دھول ہے، خاک ہے
پھول گلزار سے خار کھاتے رہے

سانس لینے کی فرصت کہاں تھی ادا
یاد آنے کو وہ یاد آتے رہے

☆☆

آپ کا باورچی خانہ

جویریہ عالم

1۔ میرے میاں ڈاکٹر ہیں تو مجھے تو پہلے دیکھنا ہوتا ہے کہ ہر چیز صاف ستھری ہو اور غذائیت سے بھرپور ہو۔ اس لیے کچن سے لے کر برتن اور جو بھی پکایا جائے وہ صاف ستھرا اور غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی گھر والوں کی پسند کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔

2۔ ہمارے رشتے دار زیادہ تر نزدیک ہی رہتے ہیں، اس لیے بتا کر آنے کا تکلف کم ہی کرتے ہیں چونکہ ہر ہفتے ہی مہمانوں کی آمد رہتی ہے تو میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ کم وقت میں اچھا کھانا بناؤں۔ ویسے تو فریج میں مختلف چیزیں رکھی ہی رہتی ہیں لیکن مہمانوں کی آمد پر میں قیمہ پلاؤ ہی بناتی ہوں جو مہمانوں اور میرے میاں کو بھی بہت پسند ہے۔ اسی لیے اس کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ باقی پلاؤ کے ساتھ رائتہ سلاد تو ہوتا ہی ہے۔

دال قیمہ پلاؤ ویجی ٹیبل

اجزاء

قیمہ	آدھا کلو
چاول	ایک کلو
دال مونگ	آدھا پاؤ
کشمش	چار کھانے کے چمچے
ہلدی	آدھا چمچہ
کالی مرچ پاؤڈر	آدھا چمچہ
پیاز	:دو عدد
تیل	:حسب ضرورت
نمک	:حسب ضرورت

مکس ویجی ٹیبل (آلو، گاجر، مٹر، شملہ مرچ) ایک ایک باریک باریک کاٹ لیں۔

ترکیب:۔

دال مونگ اور مکس ویجی ٹیبل میں نمک ڈال کر الگ الگ ابال لیں۔ گرم تیل میں پیاز ہلکا فرائی کر کے قیمہ، نمک، ہلدی اور کالی مرچ پاؤڈر ڈال کر بھون لیں۔ جب قیمہ بھن جائے تو تھوڑا پانی ڈال کر قیمہ گلا لیں جب قیمہ گل جائے تو دال اور ابلی سبزیاں مکس کر دیں۔ چاول ابال لیں۔

ایک پتیلے میں آدھے چاولوں کی تہہ لگا کر قیمہ، دال، مکس سبزی، کشمش اور کھجور ڈالیں پھر بقیہ چاولوں کی تہہ لگائیں۔

آخر میں ہرا دھنیا ڈال کر دم پر لگا دیں اور مہمانوں کو سرو کریں۔

3۔ کچن کی صفائی کے لیے کوئی خصوصی اہتمام نہیں کرنا پڑتا کیونکہ میں جو بھی کام کرتی ہوں، ساتھ ساتھ صفائی بھی کرتی رہتی ہوں، بس ہفتہ میں ایک بار کیبنیٹ وغیرہ کی اچھی طرح صفائی کر دیتی ہوں۔

4۔ ناشتے میں ہم سب پراٹھے اور چائے ہی لیتے ہیں لیکن مہینے میں ایک بار حلوہ پوری کا اہتمام بھی ہو جاتا ہے۔ میں چنے تھوڑا منفرد انداز میں بناتی ہوں تو اس کی ترکیب لکھ دیتی ہوں باقی پوری تو اکثر سب ہی کو بنانا آتی ہے۔

اجزاء:۔

چنے سفید	:آدھا کلو
تیل گھی	:ایک بڑا سالن والا چمچہ

پیاز :دو عدد باریک کاٹ لیں
ٹماٹر :دو عدد
نمک، مرچ :حسب ذائقہ
سفید زیرہ :ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

سب سے پہلے پیاز کو ہلکا براؤن کر کے اس میں زیرہ ڈال کر تھوڑا فرائی کریں اور پھر ایک کپ پانی ڈال دیں۔

اس کے بعد ٹماٹر پیسٹ لیں، ادرک پیسٹ ڈال کر اچھی طرح بھونیں نمک مرچ بھی ساتھ ڈال لیں جب مسالہ بھن جائے تو اس میں آدھا کپ پانی ڈال کر چنے ڈال دیں اور ہلکا سا بھونیں جب گھی اوپر آنا شروع ہو جائے تو آدھا کپ پانی پھر ڈال دیں اسی طرح تین مرتبہ یہ عمل دہرائیں اسی میں چنے گل جائیں گے جب چنے گل جائیں تو حسب منشا پانی ڈال کر جوش دے لیں اور سوکھی میتھی ڈال کر دم دے لیں۔ مزے دار چنے تیار ہیں۔ پوری یا پراٹھوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

5۔ گھر سے باہر کھانا کھانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے جو بھی بنتا ہے گھر میں ہی بنتا ہے۔

6۔ نہیں جی، یہاں موسم کو مدنظر نہیں بس اپنے دل کو مدنظر رکھ کر کھانا بنایا جاتا ہے۔ موسم کو بس موسمی سبزی کے لحاظ سے مدنظر رکھا جاتا ہے۔

7۔ جتنی محنت کریں گے، اتنا ہی اچھا بنے گا ویسے کبھی کبھار بغیر محنت کے بھی کھانا اچھا بن جاتا ہے۔

8۔ ٹپ تو بس یہی ہے جو بھی کام کریں بسم اللہ سے شروع کریں تو ہر کام میں برکت ہوتی چلی جاتی ہے۔

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

دل ایک گلشن

رضیہ جمیل

چلمن

نادرہ خاتون

نسیم سحر قریشی

دست کوزہ گر

فوزیہ یاسمین

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

شیر خرمہ

ضروری اشیاء:

دودھ	ایک کلو
چینی	ایک چوتھائی کپ
سویاں	آدھا کپ
گھی	دو کھانے کے چمچے
پانی	آدھا کپ
بادام	حسب ضرورت
پستے	حسب پسند
کشمش	چار کھانے کے چمچے
چھوہارے	چار سے چھ عدد
کیوڑہ	ایک کھانے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	چار سے پانچ عدد
لونگ	چار عدد

چھوہاروں کو ایک رات بھگو دیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ ایک دیگچی میں دودھ ڈال کر ایک ابال لے آئیں۔ ایک الگ پین میں گھی گرم کریں۔ اس میں الائچی اور لونگ ڈال کر فرائی کریں۔ اس میں سویاں ڈال کر بھون لیں۔ اس کے بعد خشک میوہ ڈال کر فرائی کریں۔ تھوڑی دیر فرائی کرنے کے بعد اس میں چینی مکس کرلیں۔ اس کے فوراً بعد پانی ڈال دیں اور ایک ابال آنے دیں۔ اس مکسچر کو دودھ میں ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ نہ زیادہ گاڑھا کریں اور نہ زیادہ پتلا۔ تیار ہو جائے تو چولہے سے اتار کر بادام، پستہ اور چھوہاروں سے گارنش کر کے سرو کریں۔

رنگین سویاں

ضروری اشیاء:

دودھ	ڈیڑھ کلو
رنگین سویاں	ایک پیکٹ
ونیلا کسٹرڈ	تین کھانے کے چمچے
چینی	حسب ذائقہ
چھوٹی الائچی	دو سے تین عدد
بادام، پستے	سجاوٹ کے لیے

ترکیب:

دیگچی میں دودھ اور الائچی ڈال کر ابال لیں۔ اس میں سویاں اور چینی شامل کر کے سویاں گلنے تک پکائیں۔ اس کے بعد آدھا کپ دودھ میں ونیلا کسٹرڈ گھول کر گرم دودھ میں شامل کر دیں جب دودھ گاڑھا ہو جائے تو سرونگ ڈش میں نکال کر بادام پستے سے گارنش کر دیں اور ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

رس ملائی

ضروری اشیا:

دودھ	ایک کلو
خشک پاؤڈر دودھ	ایک کپ
انڈا	ایک عدد
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
سبز الائچی	تین سے چار عدد
چینی	ایک چوتھائی کپ
تیل/گھی	ایک کھانے کا چمچہ
بادام اور پستے	گارنشنگ کے لیے

ترکیب:

پتیلی میں دودھ ڈال کر ابال لیں۔ ابال آجائے تو

اس میں چینی ڈال کر چمچہ چلائیں اور آنچ دھیمی کر کے پکائیں۔ الائچی شامل کر دیں اور آٹھ سے دس پستے بھی ڈال دیں۔

پیالے میں خشک دودھ، بیکنگ پاؤڈر اور میدہ ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ اس میں انڈا اور تیل شامل کر کے آمیزے کو اچھی طرح گوندھ لیں۔ اس مکسچر کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنالیں۔ ہلکی آنچ میں پکتے ہوئے دودھ میں یہ گولیاں ڈال کر پکائیں۔ جب یہ بنا ٹوٹے ہوئے آسانی سے دودھ میں گھومنے لگیں تو آنچ بالکل ہلکی کر کے چار سے پانچ منٹ کے لیے پکائیں اور چولہا بند کر دیں۔ پستے اور بادام سے گارنش کر کے پیش کریں۔

چکن بریانی

ضروری اشیاء:۔

چکن	ایک کلو
چاول	ایک کلو
دہی	ایک کپ
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	ایک چمچہ
لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
آلو بخارا	آٹھ عدد
گھی / تیل	ایک درمیانہ کپ
ٹماٹر	تین عدد
پیاز	تین عدد
آلو	دو عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
زردے کا رنگ	چٹکی بھر
لونگ	چھ عدد
دھنیا پودینہ	آدھی پیالی
ہری مرچ	آٹھ سے دس

ترکیب:

چکن میں لہسن ادرک، دہی، نمک، پسا گرم مسالہ لال مرچ اور آلو بخارے ملا کر رکھ دیں۔

تیل / گھی میں پیاز باریک کاٹ کر سنہری ہونے تک تل لیں۔ پیاز کو نکال کر اس تیل میں مسالہ لگا چکن ڈال دیں۔ ہلکا سا بھون لیں۔ تیل اوپر آجائے تو ابلے یا تلے ہوئے آلو اور ٹماٹر ڈال کر مزید بھون لیں۔ اب اس میں تلی ہوئی پیاز بھی شامل کر دیں۔ ساتھ ہی ہری مرچ، ہرا دھنیا پودینہ بھی ملا دیں۔ چاول میں زیرہ، لونگ اور نمک ڈال کر ایک کنی چھوڑ کر ابال لیں۔ اب ایک دیگچی میں پہلے چاول پھر چکن مسالہ کی تہہ لگا دیں۔ اسی طرح تمام چکن اور چاول کی تہہ لگا دیں۔ تھوڑے سے دودھ میں زردے کا رنگ گھول چھڑک دیں۔ دو کھانے کے چمچے گھی ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزے دار بمبئی بریانی تیار ہے۔

کسٹرڈ سویاں

ضروری اشیاء:

کسٹرڈ پاؤڈر	تین چائے کے چمچے
دودھ	آدھا کلو
سویاں	آدھا پاؤ
کیلے	دو عدد
سیب	ایک عدد
چینی	چار کھانے کے چمچے

ترکیب:

سب سے پہلے سویوں کا چورا کر کے بغیر گھی کے بھون لیں۔ دودھ گرم کرنے کے لیے رکھ دیں۔ تمام پھل باریک کاٹ لیں۔ اس کے بعد دودھ میں پھل ڈال کر چمچہ چلاتی رہیں گاڑھا ہونے لگے تو چینی اور سویاں ڈال دیں۔ جب گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں ڈش میں پھلوں کی تہہ بچھائیں۔ اوپر سویوں کا کسٹرڈ ڈال کر ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھ دیں۔ بادام، پستے سے گارنشنگ کر لیں۔ اور ٹھنڈا ہونے پر پیش کریں۔

اسپیگھٹی ودھ چکن کڑاہی

اسپیگھٹی — ایک پیکٹ
مرغی کا گوشت — ایک کلو
چکن کڑاہی مسالہ — ایک پیکٹ
ٹماٹر — دو عدد
ادرک، لہسن — دو کھانے کے چمچے
ادرک — ایک انچ کا ٹکڑا
ٹماٹو کیچپ — ایک کپ
تیل — حسب ضرورت
پیاز — ایک عدد
ہری مرچیں — آٹھ عدد
نمک — حسب ذائقہ
دہی — آدھا کپ
چلی ساس — ایک کپ

ترکیب:
اسپیگھٹی کو نمک ملے پانی میں پانچ سے سات منٹ کے لیے ابال لیں، یہاں تک کہ ایک کنی رہ جائے۔ اس کے بعد چھلنی میں ڈال کر گرم پانی گرا کر ٹھنڈا پانی گزار دیں اور اس میں ایک کھانے کا چمچہ تیل ملا کر اسپیگھٹی کو ایک پیالے میں نکال لیں۔

کڑاہی میں تیل گرم کریں اور اس میں پیاز ڈال کر سنہری ہونے تک فرائی کریں اب اس میں لہسن، ادرک ڈالیں اور مرغی کا گوشت ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ دہی میں چکن کڑاہی مسالہ ڈال کر مکس کر لیں اب اس کو مرغی کے گوشت میں شامل کر دیں ساتھ ہی اس میں ڈیڑھ کپ پانی ڈال کر گوشت گلا لیں۔

اب اس میں ثابت ہری مرچیں اور ٹماٹر ڈال کر تین منٹ تک پکائیں۔ اب ایک ساس پین میں تیل گرم کریں اس میں ٹماٹو کیچپ، چلی ساس اور نمک ڈالیں اور ساتھ ہی ابالی ہوئی اسپیگھٹی بھی ڈال دیں اور تین منٹ تک آمیزے کو درمیانی آنچ پر پکالیں۔ اس کے بعد اس میں گوشت کا آمیزہ ڈال دیں اور ہلکے ہاتھ سے مکس کر کے اتنا پکائیں کہ تیل الگ نظر آئے۔ اب اس کے اوپر کتری ہوئی ادرک چھڑک دیں۔

لیجیے اسپیگھٹی ودھ چکن کڑاہی تیار ہے، کسی سرونگ کڑاہی میں ڈال کر گرم گرم پیش کریں۔

منس رائس

ضروری اشیاء:
قیمہ — آدھا کلو
پیاز — دو عدد
ٹماٹر — آدھا کپ
لہسن، ادرک — آدھا چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالہ — آدھا چائے کا چمچہ
پسا زیرہ — آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
پسی کالی مرچ — ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
دھنیا — آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی — ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
لیموں کا رس — ایک کھانے کا چمچہ
دہی — دو کھانے کے چمچے
چاول — آدھا کلو
تیل — حسب ضرورت
نمک — حسب ذائقہ

ترکیب:
کڑاہی میں تیل گرم کر کے پیاز فرائی کریں۔ اس میں قیمہ، پسے ٹماٹر، دہی، پسا لہسن، ادرک، نمک، لال مرچ، ہلدی اور دھنیا ڈال کر بھونیں اور درمیانی آنچ پر قیمہ گلالیں جب قیمہ گل جائے اس میں پسا گرم مسالہ ڈال کر بھون لیں۔ آخر میں لیموں کا رس شامل کر کے چولہے سے اتار لیں۔ دیگچی میں تھوڑا تیل ڈال کر گرم کریں اور چاول اور قیمہ تہہ لگا کر دم پر رکھ دیں۔ اچھی طرح مکس کر کے سرونگ ڈش میں نکال کر گارنش کر کے سلاد اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆

روحیلہ خان

میری بیاض سے

نوری............کراچی

یہ سمجھ کے مانا ہے سچ تمہاری باتوں کو
اتنے خوب صورت لب جھوٹ کیسے بولیں گے

کاشفہ علی............سیالکوٹ

ترا ملنا، ترا ہونا، میرے جینے کا حاصل ہے
تری چاہت کی لہروں کا، مرا یہ دل ہی ساحل ہے

بنت زینب............لاہور

اس کے چہرے کی چمک کے سامنے سادہ لگا
آسمان پر چاند پورا تھا مگر آدھا لگا

اسماغیور............کوہاٹ

آنکھ تم کو ہی جب نہ پائے گی
عید کیسے منائی جائے گی
چاند کافی نہیں ہے میرے لیے
تیرے آنے پہ عید آئے گی

حمیرا منظور............کوٹ رادھا کشن

دوست بھی ملتے ہیں محفل بھی جمی رہتی ہے
تو نہیں ہوتا تو ہر شے میں کمی رہتی ہے
اب کے جانے کا نہیں موسم گریہ شاید
مسکرائیں بھی تو آنکھوں میں نمی رہتی ہے

شہلا قیوم............سکھر

تیرے غرور سے بڑھ کر مری انا ہے مجھے
تو پوچھتا ہے محبت کا مجھ سے، جا نہیں کی!

زرگل............کراچی

ڈری تھی اور شب کو دیر تک جاگی ہوئی تھی
ہوا پھولوں سے خوشبو چھین کر بھاگی ہوئی تھی

شفق خان............اسلام آباد

کیا کہوں قرب کی یہ کون سی منزل ہے جہاں
نہ میں دیتا ہوں تجھے وقت، نہ تو مانگتا ہے

سیما اریب............پنڈی

ہار کے کھیل میں یہ سودا بڑا اچھا رہا
ہار کے تجھ کو جیت جانا بڑا اچھا رہا

ریما علی............فیصل آباد

وہ تیرا شہر، تیرے لوگ روایات تیری
تم اگر گاؤں میں ہوتے تو ہمارے ہوتے!

فضیلہ احمد............جھڈو

کسی کے کچھ نہیں ہیں ہم مگر پھر بھی نجانے کیوں
ہمیں یہ وہم سا رہتا ہے کہ کوئی تو منتظر ہو گا

نعیمہ بیگ............کراچی

بگڑی ہوئی اس شہر کی حالت بھی بہت ہے
جاؤں بھی کہاں اس سے محبت بھی بہت ہے

افشاں شکور............لانڈھی

بڑے تاباں بڑے روشن ستارے ٹوٹ جاتے ہیں
سحر کی راہ تکنا تا سحر آساں نہیں ہوتا

سعدیہ رئیس............لندن

کبھی امید کبھی ڈر کی سمت دیکھتی ہوں
پلٹ پلٹ کے جو میں اپنے گھر کی سمت دیکھتی ہوں
ابھی قیام کی حالت میں ہے وجود مرا
سفر کے وقت سمندر کی سمت دیکھتی ہوں

شائلہ فراز............بفرزون

وہ میرے درد سے اکثر انجان بنا رہتا ہے
وہ میرا محسن ہی سہی درد شنا سا ہی سہی

دلشاد اکرم............بفرزون

کچھ دنوں سے میرا آئینہ مجھے اچھا لگے
جب اسے دیکھوں مرا چہرا ترا چہرا لگے
تیرے نینوں کے گگن کا میں کبھی پنچھی بنوں
کہ تیرا چندا کبھی سورج کبھی تارا لگے

☆☆

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

ص۔م ...... سیالکوٹ

س: ”میری حال ہی میں منگنی ہوئی ہے۔ میرے گھر میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہے میں نے ہی ضد کر کے آٹھویں تک پڑھا ہے، میرے ابو کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں، میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں تاکہ میٹرک کی ڈگری لے سکوں پر میرے سسرال والے اس بات پر راضی نہیں ہیں۔ وہ اگلے سال کی فصل کی کٹائی کے بعد شادی کرنا چاہتے ہیں۔

میری دونوں بڑی بہنیں اور بھائی شادی شدہ خوش حال ہیں، سب میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ تو پڑھنے کے لیے روتی ہے پر میں کیا کروں مجھے بہت شوق ہے، میرا منگیتر بھی بس اپنا نام لکھ لیتا ہے اور اردو پڑھ لیتا ہے وہ آڑھتی کا کام کرتا ہے، سب کہتے ہیں کہ تو نصیبوں والی ہے پر مجھے لگتا ہے کہ میں جاہلوں کے گھر جا رہی ہوں جہاں سوائے منگیتر کے سب انگوٹھا چھاپ ہیں۔ میں نے اپنی بہن سے صاف کہہ دیا کہ میں پہلے میٹرک پورا کروں گی پھر شادی کی بات ہوگی وہ مجھے کہتی ہے کہ تو نخرے نہ دکھا اور بیاہ کے لیے ہاں کر دے، میں پڑھی لکھی ہوں اچھی شکل صورت کی بھی ہوں ۔کیا میرے لیے کوئی اور پڑھا لکھا اچھا لڑکا نہیں مل سکتا۔ کیا کروں میرا تو دل ہی نہیں مانتا کہ اس ان پڑھ سے شادی کروں اوپر سے میری ہونے والی ساس کی باتیں کہ ہمیں نوکری تھوڑی کرانی ہے میرا دل جلا دیتی ہیں؟“

ج: ”اگر مسئلہ صرف یہ ہے کہ آپ میٹرک کرنا چاہتی ہیں اور گھر والے جلد شادی کرنا چاہتے ہیں تو اس کا حل نکل سکتا ہے۔ آپ گھر والوں سے کہہ سکتی ہیں کہ دو سال تک آپ کا شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے آپ میٹرک کر کے ہی شادی کریں گی ممکن ہے آپ کے کہنے پر وہ مان جائیں۔ پرائیویٹ میٹرک بھی کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ اگر یہ ہے کہ آپ اس لڑکے سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتیں، لڑکا اور اس کے گھر والے آپ کو ناپسند ہیں تو یہ گمبھیر مسئلہ ہے۔ شادی کے لیے لڑکے اور لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ آپ شادی سے انکار کر سکتی ہیں۔ اب یہ آپ کے گھر والوں پر منحصر ہے کہ وہ آپ کے انکار کو کتنی اہمیت دیں گے جہاں تک اندازہ ہے جس ماحول میں آپ رہتی ہیں وہاں آپ کا کسی لڑکے کو ریجکیٹ کرنا آپ کے لیے پریشانی اور مسائل کا باعث ہوگا۔

آپ کے لیے مشورہ یہی ہے کہ آپ ایک بار پھر سنجیدگی سے اس بارے میں سوچیں اگر لڑکا مہذب ہے۔ اچھے کردار اور چال چلن کا مالک ہے۔ نرم طبیعت کا ہے۔ بات بات پر غصہ نہیں کرتا، اچھا کماتا ہے تو یہ رشتہ برا نہیں ہے۔ پڑھائی شادی کے بعد بھی کر سکتی ہیں۔

صرف ڈگری حاصل کرنے سے انسان تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ ازدواجی زندگی میں ڈگری سے زیادہ اچھے اخلاق اور کردار کی اہمیت ہوتی ہے۔“

ر۔ن ...... کراچی

س: ”میری شادی کو چودہ برس ہو چکے ہیں۔ میرے شوہر کی تنخواہ میرے مقابلے میں کم تھی لیکن ہماری محبت کی شادی تھی تو اس وقت سب اچھا لگتا تھا۔ میرے شوہر میرے مقابلے میں خاصے خوش شکل ہیں ہمارے

درمیان مسائل اس وقت پیدا ہوئے جب میری جاب چھوٹی۔ میں بہت پریشان تھی کہ کیا کروں میرا اس وقت ایک ہی بیٹا تھا جو ڈیڑھ دو سال کا تھا۔ گھر کے خرچے سب شوہر پر پڑ گئے تو وہ جھنجلا گئے پھر ساس نے بھی طعنے دینے شروع کر دیے، بات اتنی بڑھی کہ مجبوراً مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑ گیا۔

میکے میں امی کو پہلے ہی حالات کا علم تھا تو انہوں نے میرے شوہر کو فون کیا اور برا بھلا کہا۔ میری ساس کو بہت برا لگا۔ انہوں نے کہا کہ وہ میرے شوہر کی دوسری شادی کروا دیں گی اور یہ بھی کہ میری اس شکل صورت پر کون پوچھے گا۔ میری امی نے کہا کہ تمہارے شوہر نے بھی تم کو چاہا ہی نہیں، اسے تو بس پیسے سے محبت تھی۔ میں تو کیا کہتی لیکن میری امی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔

بچی میرے لیے مبارک ثابت ہوئی ابھی چار مہینے کی تھی کہ مجھے جاب کی آفر آ گئی۔ میں نے فوراً جوائن کیا شروع کے چند مہینے بچی کو امی نے سنبھالا اور میں بھی آفس لے کر جاتی رہی تھی، وقت تو گزر رہی گیا۔ حالات اتنے بگڑ گئے تھے کہ بات طلاق تک جا پہنچی تھی لیکن بس ہو نہ سکی۔

اس دوران میری بچی تین سال کی اور بچہ چھ سال کا ہو گیا۔ میرے شوہر کی نوکری ختم ہو گئی اور بے روزگاری کی وجہ سے ان کے گھر بھی پرابلمز بڑھ گئے۔ مجھے اپنے بچے کے اسکول میں داخلے اور کچھ اور کاموں میں اس کے باپ کی ضرورت پڑی تو میری ماں نے اعتراض کیا کہ اسے نہ پوچھ، وہ تو صرف پیسے کا ہے۔

گھر میں میرے اپنے بھائی اور بھابیوں کے الگ رونے ہیں۔ میں پریشان ہو گئی ہوں اچھی خاصی رقم انہیں کھانے پینے کی مد میں دیتی ہوں مگر ان کے منہ سیدھے نہیں ہوتے۔ میری شوہر سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے بتایا کہ نوکری تو لگ گئی ہے لیکن تنخواہ کم ہے۔ اب انہیں بچے بھی یاد آ رہے ہیں پہلے میرا خیال تھا کہ ساس ان کی شادی کروا دیں گی پر ایسا نہیں ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، شوہر کہتے ہیں گھر لوٹ آؤ وہ بہت کمزور بھی ہو گئے ہیں۔ ساس بھی دوسرے بیٹے کے گھر چلی گئی ہیں پر میری امی ناراض رہتی ہیں کہ شوہر کے گھر کا نام نہ لوں آخر اس طرح سب کیسے چلے گا میرے بچے پرائے گھر میں کیسے گزارہ کریں گے۔ میرے دل میں لوٹنے کی خواہش ہے پر امی کا سوچ کر چپ ہو جاتی ہوں کہ وہ اب بیمار بھی رہنے لگی ہیں، میں ان کی دیکھ بھال اور ڈاکٹر کے اخراجات سب اٹھا رہی ہوں میرے بعد ان کا کیا ہوگا؟"

ج: "عزیز بہن! آپ کے شوہر مزاج کے تیز ہیں۔ آپ انہیں چھوڑ آئی تھیں اس کے باوجود انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔

پہلے وہ نہیں بولتے تھے لیکن جب آپ کی جاب چھوٹی تو ساری ذمہ داری ان پر آ پڑی۔ ذمہ داریوں کے بوجھ نے مزاج میں بیزاری اور جھنجلاہٹ پیدا کر دی لڑائی جھگڑے ہونے لگے۔ یاد رکھیں اکثر لڑائی میں انسان وہ باتیں بھی کہہ جاتا ہے جو وہ کہنا نہیں چاہتا غصہ میں منہ سے نکل جاتی ہیں۔

آپ جب میکے گئی تھیں تو آپ کی والدہ کا فرض تھا آپ کو سمجھاتیں۔ آپ کے شوہر کو بلا کر بات کرتیں لیکن انہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اب آپ کے شوہر بیمار ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں تو آپ کو چلے جانا چاہیے۔ یہاں گھر میں پیسے دینے کے باوجود بھاوجوں کی نظر میں کھٹکتی ہیں۔ ان کا رویہ آپ کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ بچے بھی چھوٹے ہیں بڑے ہوں گے تو اس ماحول میں ان کی شخصیت مسخ ہو جائے گی۔ وہ آپ کو الزام دیں گے۔ شوہر کے ساتھ آپ کا اپنا گھر ہوگا۔ بچوں کا کوئی مسئلہ ہوا تو وہ آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ سب سے بڑی بات آپ سر اٹھا کر خودداری کے ساتھ کہہ سکیں گی کہ یہ میرا گھر ہے۔ ماں باپ کا گھر شادی کے بعد پرایا ہو جاتا ہے۔ آپ کی والدہ خودغرضی سے کام لے رہی ہیں۔ آپ ان کا خیال رکھتی ہیں۔ ان کا علاج پر پیسے خرچ کرتی ہیں۔

☆☆

امت الصبور

بیوٹی بکس

فرح زمان۔لانڈھی

میری بیٹی چودہ سال کی ہے، اسے بازار میں ملنے والی مہندی کون وغیرہ سے الرجی ہو جاتی ہے حالانکہ اسے بہت شوق ہے مہندی لگانے کا، پلیز مجھے بتائیں کہ میں قدرتی مہندی میں ایسا کیا ملاؤں کہ اس کا رنگ گہرا آئے۔

ج۔ بازار سے ملنے والی خشک مہندی خریدتے وقت ضرور چیک کریں کہ اس میں سے کسی قسم کی خوشبو تو نہیں آ رہی۔ مہندی کا رنگ گہرا کرنے کے لیے مہندی چائے کے سادہ قہوے یا کافی کا گاڑھا قہوہ بنا کر گھولیں۔

☆چینی پیس کر آدھ چمچہ ملانے سے بھی رنگ گہرا آتا ہے۔

☆دو تین لونگیں ابال کر اس پانی میں مہندی گھولیں یا مہندی لگانے کے بعد لونگ کی بھاپ دیں۔

☆مہندی گھولتے میتھی دانے کا تھوڑا سا پاؤڈر بھی شامل کرلیں۔ مہندی کم از کم سات سے آٹھ گھنٹے لگائیں۔ پہلے خشک مہندی اتاریں پھر اس پر سرسوں یا ناریل کا ہلکا سا تیل لگائیں۔

حرا صدیقی......کراچی

مسئلہ میرے بالوں کا ہے۔ میرے بال گھنگھریالے ہیں۔ میں اپنے بالوں کا بہتر خیال رکھتی ہوں۔ ہفتے میں دو دفعہ دھوتی ہوں۔ الگ کنگھی ہے جس کو صاف رکھتی ہوں۔ میں گیلی بالوں میں تیل لگاتی ہوں سرسوں کا تیل بھی کیونکہ اگر تیل نہ لگاؤں تو اتنے خشک ہوتے ہیں کہ کنگھی بھی نہ کر سکوں۔ بال دھو کر تیل لگا لیتی ہوں اور پھر پونی ٹیل کر لیتی ہوں۔ یہ سب اس لیے بتایا کہ آپ کو پتا لگے کہ اتنا سب کرنے کے باوجود بھی میرے بالوں میں بہت زیادہ خشکی ہے۔ اتنی خشکی کہ تنگ آ گئی ہوں اس سے۔ اوپر سے بالوں کے دومنہ ہیں اور بال خود بخود ٹوٹتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے میرے بال ایک ہی جگہ رک گئے ہیں۔ آسان الفاظ میں مجھے خشکی سے اپنے بالوں کو صاف کرنا ہے اور بالوں کو لمبا کرنا چاہتی ہوں اور چاہتی ہو کہ میرے بال دومنہ نہ رہیں۔

ج: پیاری بہن! آپ نے اپنی عمر نہیں لکھی اور نہ ہی یہ لکھا ہے کہ یہ شکایت آپ کو کب سے ہے۔

☆عام طور پر اس طرح کی کیفیت غذائی کمی مثلاً آئرن، وٹامن ڈی وغیرہ کی کمی کی وجہ سے بھی ہوتی ہے لہٰذا آپ اپنی ڈائیٹ پر بھی توجہ دیں۔

☆اپنی غذا میں پروٹین مثلاً انڈے، دودھ، دالیں استعمال کریں اور ہرے پتوں والی سبزیاں زیادہ استعمال کریں۔

☆پانی روزانہ آٹھ سے دس گلاس روزانہ لیں۔ تلی ہوئی اشیاء اور بازاری کولڈ ڈرنکس سے پرہیز کریں۔

☆عمر بڑھنے کے ساتھ ہارمونز کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں، اس لیے بھی کچھ خواتین میں اسی طرح کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں یا وہ خواتین جو کام کاج یا مسائل کا بوجھ کچھ زیادہ ہی اپنے اوپر سوار کر لیتی ہیں تو انسانی جسم میں موجود ہارمونز میں بگاڑ کے باعث اس طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھیں دومنہ والے بال کاٹنے سے بھی ختم ہوتے ہیں لہٰذا چھ سے آٹھ ہفتے بعد کٹنگ کریں ہفتے میں دو بار ناریل کا تیل لگائیں۔ روزانہ شیمپو نہ کریں۔ سخت ربر بینڈ نہ لگائیں۔

بالوں کی جڑوں میں خالص ایلوویرا کا جیل پتوں سے کاٹ کر بیس سے تیس منٹ لگائیں پھر سر دھولیں یہ خشکی اور خارش کو کم کرتا ہے۔ ناریل کے دو چمچے تیل کو نیم گرم کریں اور اس میں چند قطرے لیموں کا رس ڈال کر سر پر لگائیں پھر شیمپو کرلیں۔

تیز گرم پانی سے سر نہ دھوئیں۔ دو سے تین ہفتے تک چیک کریں اگر فرق نہ پڑے تو ڈاکٹر سے رجوع کریں۔